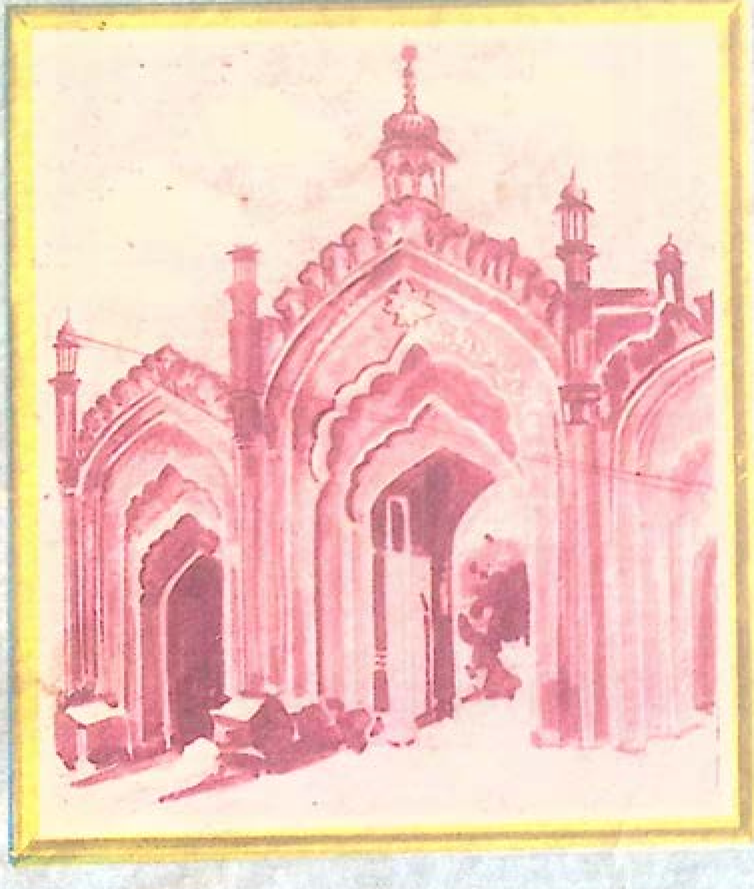
لکھنؤ کی تہذیبی میراث

ڈاکٹر سید صفدر حسین



سید رضا ہاشمی

احمد بک ڈپو
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]

لکھنؤ کی تہذیبی میراث

ڈاکٹر سید صفدر حسین

بارگاہِ ادب

مظفر منزل۔ حیدر روڈ۔ اسلام پورہ۔ لاہور

طبع اوّل	ایک ہزار
سالِ طبع	۱۹۷۵ء
کتابت	تمکین شیرازی
ناشر	سیّد ابرار حسین

طابع : ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی - اُردو ڈائجسٹ پرنٹرز - ۲۴ سرکلر روڈ، لاہور

قیمت	بیس روپے

بارگاہِ ادب

مظفر منزل - حیدر روڈ ، اسلام پورہ لاہور

لکھنؤ کی تہذیبی میراث

(تاریخ، تمدّن اور تہذیب)

ہر دل ہے عندلیبِ گلستانِ لکھنؤ
رضواں بھی ہے جناں میں ثنا خوانِ لکھنؤ

میر انیس

ترتیب

بابِ سوم

بابِ چہارم

دلّی اور لکھنؤ کے تمدنی اور تہذیبی مزاج

کہاں ہوں گی امیرؔ ایسی ادائیں حُور و غِلماں میں
رہے گا خُلد میں بھی یاد ہم کو لکھنؤ برسوں

امیر مینائیؒ

جُملۂ معترضہ

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی
ہوسِ سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو

مقطعِ سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر
عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو

لیے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالب
جادۂ رہ، کششِ کافِ کرم ہے ہم کو

مرزا اسد اللہ خان غالب نے یہ اشعار اپنی ایک غزل میں کہے تھے جو ۱۸۲۷ء کی تصنیف ہے۔ موقع یہ تھا کہ شاعر اپنے عالمِ شباب میں دلّی سے کلکتے کے سفر پر روانہ ہوا تھا۔ درمیان میں اُس نے بتقاضائے حصولِ انعام کچھ وقت کے لئے لکھنؤ میں قیام کی ضرورت محسوس کی۔ اس زمانے میں وہ شرفا، علماء اور فضلائے لکھنؤ سے بھی ملا۔ اُس نے بادشاہِ اودھ کی مدح میں قصیدہ بھی لکھا اور دربارِ شاہی سے ایک گراں قدر انعام بھی اُس کے لئے منظور ہوا، جو شومیِ قسمت سے اُسے نہ مل سکا۔ بہرحال غالب کی طرح ہمیں تو صاحبانِ لکھنؤ کی طرف سے "تماشائے اہلِ کرم" کی کوئی خواہش نہیں ہے کیوں کہ

وہ خود غریقِ مصائب ہیں کس کو راحت دیں

بہرحال بیاں تو ہماری طرف سے ایک صدرحم ہے، ایک دل کے ہمدردانہ آنسو ہیں، تہذیبِ اسلامی کے مزار پر ایک سورۂ فاتحہ کا ثواب ہے!

لکھنؤ کے معاملے میں ہمارے تجزیے کی بنیاد نہ کسی رُو رعایت پر قائم ہے، اور نہ اس میں کسی تعصب کا شائبہ ہے۔ یہ فی سبیل اللہ خدمت ہے۔ ہم نے عالمگیر انسانی اخوت، فراخ دلانہ اعترافِ عظمت اور علمی و ادبی دیانت کے جذبوں سے کام لے کر ایک غیر جانبدارانہ مطالعہ کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کبھی ہمارے شاعرانہ احساسات نے یہ بھی اعتراف کیا تھا کہ ؎

دل کو اک رابطہ اُس کے خس و خاشاک سے تھا
ایک گُل میری تمنا کا اُسی خاک سے تھا

لیکن وہ جوانی کے جذبات کی شدت تھی۔ اُس کے بعد معاصرانہ چشمکوں کے باعث کراچی میں مقیم بعض لکھنوی اہلِ سخن کے ہاتھوں کچھ تُرش رُوئی اور تلخ رویے کے داغ بھی ہمارے صفحۂ دل پر ثبت ہوئے لیکن احساسِ شرافت، انسان دوستی اور محبت کی اُمڈتی ہوئی موجوں نے اُس جذباتی ہیجان کے خس و خاشاک کو اس طرح بہادیا کہ ؎

اب ہم ہیں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو

حیرت اُن لوگوں پر ہوتی ہے جو اپنی تہذیبی اور لسانی برتری کے ثبوت میں تو اکثر لکھنؤ کے جعلی تہذیب کا سہارا لیتے ہیں لیکن جہاں اُس منظرِ دماغ سے ہٹ کر قلم اُٹھانے کی نوبت آتی ہے وہاں صاف طوطا چشم ہو جاتے ہیں۔ یعنی تحریر کے میدان میں جب یہ شہسوارانِ علم و ادب و تنقید اپنے اشہبِ قلم کی جولانیاں دکھاتے ہیں تو لکھنؤ کی مخالفت میں ان کے خط و خال تبدیل ہو جاتے ہیں، منھ میں جھاگ آنے لگتا ہے اور بیان سے طنز و استہزا، کذب و افترا اور تعصب و فساد کا زہر آلود دھواں نکلنے لگتا ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ اردو ادب کے محققین و نقاد کبھی عبدالسلام ندوی

اور عبدالحی کے حلقۂ اثر سے آزاد ہوکر کوئی ایسا تخلیقی کارنامہ بھی سرانجام دیں جو مُلّائیت کے چھاپے سے محفوظ ہو۔ بہرحال اس صورتِ حال نے ہمیں تو بار بار یہ ترغیب دلائی ہے کہ ایسے گمراہ کُن پروپیگنڈے کا کوئی سدِّباب ہونا چاہیے مگر وائے برحالِ قلمکارانِ لکھنؤ! کہ خدا نے اُنہیں اتنی توفیق بھی نہیں دی کہ وہ اپنے اسلاف کے خلاف بدکلامی کا کوئی مُثبت و مُسکت جواب دیتے یا اپنی محبوب اقدار و روایات کی حمایت میں کوئی احتجاج کرتے۔ ہم اگرچہ اپنے تاریخی اور جغرافیائی اُفق کے لحاظ سے اُن سے مختلف سمتوں کے لوگ ہیں لیکن عدل و انصاف کے تقاضوں نے ہمیں اکثر اس بات پر آمادہ کیا ہے کہ اُن کے جذبات کی تائید میں حق و صداقت پر مبنی کچھ دلائل پیش کریں۔

ہمارے احساسات و جذبات میں لکھنؤ کے لئے نرمی اور ہمدردی کا بڑا سبب یہ رہا ہے کہ ہمارے آغازِ شعور کے زمانے میں بھی لکھنؤ اپنی سیاسی تباہی کے باوجود عروس البلاد تھا۔ قدیم آثارِ تہذیب اور جدید نقوشِ تمدن نے اُس کی زندگی میں گنگاجمنی امتزاج پیدا کر دیا تھا۔ وہ تمام ہندوستان میں ایک منفرد شہر تھا۔

پُوچھو جو پھر کے آئے ہیں یاں ہر دیار میں
دیکھا نہ ہوگا ایک گُل ایسا ہزار میں

اُس کے وہ سرسبز و شاداب باغات، لہلہاتے ہوئے مرغزار، شاہی عہد کی پُرجلال عمارات، مذہبی علوم کے مقدس ادارے، تہذیبی لطافتوں کے دلفریب مناظر، معاشرتی جمال کی دل افروزیاں، دریائے گومتی کے پُرفضا کنارے، حضرت گنج کا نشاط انگیز ماحول، چوک بازار کی چہل پہل، خوش ادا و خوش لباس لوگ، نغمہ فشاں در و دیوار، حسین چہرے، غزالی آنکھیں، خوش لہجہ انسان، خوشبو سے مہکتے ہوئے کوچے، خمیروں اور عطریات کی لپٹوں میں بسی ہوئی فضائیں، آموں کی لذتیں، خربوزوں کی حلاوتیں، شیریں بینیوں کے ذائقے، پکوانوں کے چٹخارے اور ان سب سے بڑھ کر وہاں کے علماء و فضلاء کا تقدس، ادبی محافل و مجالس کی سرگرمیاں

عوامی زبانت کے لطائف وغیرہ کے شہرے ایسی چیزیں تھیں جنہوں نے ہمارے بچپن سے آغازِ شباب تک کے عالمِ خیال کو عجیب و غریب الف لیلائی محلّات سے آباد کر رکھا تھا۔ آخر ایک وہ دن بھی آیا تھا کہ جب صداقت کے نور سے اس خیالی شیش محل کو پگھل جانا چاہیئے تھا۔ لیکن آپ یقین جانیئے کہ ایسا نہیں ہوا بلکہ جب ہم نے لکھنؤ کو پہلی بار دیکھا تو ہمارے اعتقادؔ محبت میں کچھ اور شدت پیدا ہوئی۔

دسمبر ۱۹۳۶ء کی بات ہے کہ جب لکھنؤ میں صنعتی نمائش کے انعقاد کی دھوم دھام ہوئی تو ہمیں بھی اپنی شاعری کے توسط سے لکھنؤ کی زیارت حاصل ہوئی اور اس کی مہماں نوازیوں کے تجربات کا موقع ملا۔ وکٹوریہ باغ کے وسیع و عریض قطعاتِ زمین میں نمائش منعقد ہوئی تھی جس میں ہر صنعتی ادارہ ایک جُداگانہ گنبد نما مصنوعی عمارت میں واقع تھا۔ سائنسی اکتشافات کے بہت سے حیرت انگیز کرشموں کے ساتھ ساتھ تہذیبی اور ثقافتی دلچسپیوں کے گوناگوں پروگرام بھی دو ہفتوں کی مدت پر پھیلے ہوئے تھے: پرستان کے نظارے، موسیقی کی محفلیں، ناٹک کے جلسے، چراغاں کے سماں، غرض کیا کچھ نہیں تھا۔ اسی ضمن میں ایک آل انڈیا مشاعرے کا بھی اہتمام تھا جس کے لئے ادب نوازِ لکھنؤ نے غالب کی زمینِ شعر پسند کی تھی۔ ع

کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ ہم حُور نہیں

مشاعرے میں شعرا کی فہرست حروفِ تہجی کے لحاظ سے ترتیب دی گئی تھی، چنانچہ ہم کہ ایک اجنبی شہر کے کالج میں سالِ دوم کے طالب علم تھے۔ اپنے نام کی رعایت سے اساتذہ کے پہلو بہ پہلو پہنچ گئے۔ مشاعرہ پوری رات منعقد رہا۔ اگلے دن گیارہ بجے یعنی قبلِ دوپہر علامہ سیماب اکبر آبادی اور آغا شاعر دہلوی کے بعد ہمارا نام پکارا گیا۔ سرزمینِ لکھنؤ پر یہ ہماری پہلی ادبی جسارت تھی۔ چند شعر جو حافظہ سامنے لا رہا ہے آپ بھی سُن لیجیئے ؎

ہم بھی کچھ دُور نہیں، آپ بھی کچھ دُور نہیں ‌ ‌ ‌ بس یہی کہیئے کہ ملنا ہمیں منظور نہیں

کیجیئے غور تو پردے میں بھی ہے شانِ ظہور ‌ ‌ ‌ حُسن مستورِ نظر ہو کے بھی مستور نہیں

میکدے میں کوئی پابندیِ دستور نہیں
پائے ساقی پہ بھی ہو جاتی ہے رندوں کی نماز

زندگی مانگتی تھی ایک شعاعِ اُمید
نہ سہی، اُن کے تبسّم کو جو منظور نہیں

مشاعرے کے بعد چند دن تک لکھنؤ کے بام و در، کوچہ و بازار، باغ و راغ، گُل و گلزار، ہر رنگ اور صبح و شام تھے اور ہم!

اُس ابتدائے زندگی کی خوشبو اب تک ذہن میں پنہاں ہے اور اُس کے بعد جو قیامتیں برپا ہوئیں اُن کا تو ٹھکانا ہی کیا ہے! بہر حال لکھنؤ کا وہ تہذیبی دورِ انحطاط بھی ہمارے لئے تو ایک بھرپور شباب ہی کی صورت میں جلوہ گر تھا، اور یہ اُنہیں چشم دید مناظر اور دلچسپ صحبتوں کی جادو گری ہے جو اب بھی ذہن سے لکھنؤ کو محو نہیں ہونے دیتی۔ کس سے کون کہے کہ واجد علی شاہ کا وہ گورستانِ تہذیب بھی غیر منقسم ہندوستان کی ثقافتی زندگی کا سرتاج تھا! شاید اُسی تہذیب کے ایک ماتم دار کی حیثیت سے ہم بھی آج آخری دیدارِ میّت کے لئے کفن سرکانے کا اہتمام کرنا چاہتے ہیں۔

ہمارا ذہنی رشتہ نہ مرزا ابوطالب اصفہانی سے ہے جس نے انگریزوں کی خوشنودیِ مزاج کے لئے آصف الدولہ پر "تفضیح الغافلین" کا بہتان لگایا تھا، نہ ہمارا جذباتی تعلق کمال الدین حیدر سے ہے جس نے "سوانحاتِ سلاطینِ اودھ" میں انگریز قوم کی رعایت کے لئے تاجدارِ اودھ کی ناخوشی قبول کی، اور نہ ہم حکیم نجم الغنی رامپوری کے قبیلے سے ہیں کہ حافظ رحمت خاں کا انتقام لینے اور انگریزی حکومت سے دس ہزار روپے وصول کرنے کے خیال سے شاہانِ اودھ کی سیرتوں سے متعلق بے سروپا قصے تخلیق کرکے اُن کے مضحک کارٹون بنا دیں۔ ہمارا مُدّعا تو یہ ہے کہ ہم اودھ کے حکمرانوں اور اُس کے معیاری انسانوں کے کردار و مشاغل، علم و فن اور ذوق و شوق کا ایک دیانتدارانہ اور جیتا جاگتا مرقع پیش کر دیں تاکہ آنے والی نسلیں اپنے اسلاف سے بیزار ہونے کے بجائے اُن کے ساتھ

انصاف کر سکیں۔ باقیاتِ الصالحات کو اس انداز سے محفوظ کرنا چاہیے کہ مستقبل کا انسان ماضی کے اشراف کی خود مختاریوں اور مجبوریوں میں توازنِ عقل و ادراک قائم کر سکے۔

لکھنؤ کے شعرا اور اہلِ قلم نے اپنے ماضی کی یاد میں جو نظمیں لکھی تھیں اُن میں اگرچہ جذباتی رنگ آمیزی زیادہ ہے لیکن پھر بھی وہ تہذیب کی اُن نشانیوں کو ایک ایک کر کے اس طرح گنوا گئے ہیں کہ اُن کی نظموں سے لکھنؤ کی تہذیبی انفرادیت اور بے مثالیت آئینہ ہو جاتی ہے۔ مثلاً فدا علی عیش اپنے شہرِ آشوب میں لکھتے ہیں ؎

لکھنؤ رشک وہ روضۂ رضواں تھا کبھی صاحبِ منزلت و قدر فراواں تھا کبھی
زینت و زیب وہ مُلکِ سلیماں تھا کبھی باغِ جنت کی روش تازہ گلستاں تھا کبھی
لوگ مشتاق تھے، دیدار کے دیوانے تھے
ہفت اقلیم میں اس شہر کے افسانے تھے

بے نظیری میں نظیر اس کا نہ پیدا تھا کہیں ذرہ اس خاک کا تھا غیرتِ خورشیدِ مُبیں
تھا ہر اک کوچہ صفائی میں حسینوں کی جبیں لوگ کہتے تھے کہ یہ شہر ہے یا خُلدِ بریں
حضرتِ خضر نے بھی طول نہ دیکھا اس کا
اصفہاں نصف جہاں، ایک محلّا اس کا

تھا نہ دنیا میں سلاطیں کے مکانوں کا جواب سونے چاندی کے، جواہر کے قصور نایاب
سینکڑوں لعل و زمرد کے ظروفِ خوش آب تھی جواہر کے کھلونوں کی نہ گنتی نہ حساب
نیاریے خاک اگر چھاننے کو آتے تھے
لعل و گوہر خس و خاشاک میں لے جاتے تھے

حکما رشکِ ارسطو و فلاطوں تھے یہاں شعرا غیرتِ فردوسیِ فردوس مکاں
تھے دبیر ایسے کہ کیا حال کروں اُن کا بیاں جن کی تحریر پہ سو جاں سے عطارد قرباں
عُلما وہ کہ اماموں نے ثنا کی جن کی
مجتہد وہ کہ حدیثوں میں صفت ہے ان کی

لکھنؤ یقیناً ہماری تہذیب کا ایک ایسا جیتا جاگتا نمونہ بلکہ شاہکار تھا جو اپنی رنگا رنگی، وسعت اور دلربائی کے اعتبار سے تقسیمِ برصغیر تک تقریباً ڈیڑھ سو سال تہذیب و ثقافت کے میدان میں ہندوستان کی سربراہی کا فریضہ سرانجام دیتا رہا۔ سارے ملک میں وہ اپنی نوعیت کا واحد شہر تھا جس میں صبحِ بنارس کی تازگی، شامِ اودھ کی ملاحت اور شبِ مالوہ کی دلکشی کی سرحدیں ایک دوسرے سے ملتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ جو قدیم و جدید تہذیبوں کا ایک خوبصورت سنگم تھا۔ جس میں ہندو مسلم روایات کی لطافت ہم آغوش تھی۔ گویا وہ ایک تہذیبی بہارستان تھا، ایک پُر رونق اور دلنشین انجمن تھا، ایک نشاط آور محفل کا نمونہ تھا، ایک نور افشاں چراغاں کا سماں تھا، طلوعِ صبح کی کیفیت اور شامِ وصال کی جاذبیت تھا لیکن نام نہاد ادبی محققین اور نقادوں نے اُس گلستانِ رنگ و بُو کے معاملے میں افہام و تفہیم اور ضبط و تحمل کے بجائے ترش روئی، تلخ بیانی اور تعصب سے کام لے کر دہلوی ادب کے لیے کو پس منظر فراہم کرنے کے خیال سے اُس کی سرخوشانہ کیفیتوں کو ملعون کیا اور اپنے طنز و استہزا کا نشانہ بنایا ہے۔ اُنھوں نے محنت کر کے شعرا کے دواوین سے ایسے مبتذل اشعار بطورِ اشلہ نکالے ہیں جنھیں خود لکھنؤ کے صاحبانِ ذوق بھی ناپسند کرتے ہیں۔ اور ان کے مقابلے میں دلی کے شعرا کے مبتذل اشعار نظر انداز کر کے ایسے شعر چُن لئے ہیں جو نہ صرف عیوب سے پاک تھے بلکہ ہر لحاظ سے پسندیدہ تھے۔ جس طرح دار المصنفین اعظم گڑھ کے حامیوں نے جگر مرادآبادی کے سر پر دستارِ فضیلت باندھنے کے لئے "داغِ جگر" کے مقدمات میں جوش ملیح آبادی، عزیز لکھنوی اور ثاقب لکھنوی کی ایک دو غزل لے کر اُن کا پوسٹ مارٹم کیا، اسی طرح پورے لکھنوی ادب پر چھری چلائی ہے۔ نقدِ ادب نے لکھنؤ کے خلاف فیصلے صادر کرنے کے لئے کہیں نام نہاد کلاسکی اخلاقیات کا سہارا لیا ہے اور کہیں لکھنوی شعراء کی نشاطِ فکر و نظر کو شکست دینے کے خیال سے دل برشتگی، غم انگیزی اور سوزِ جذبات کو حاصلِ شعر و ادب گردانا ہے۔ لکھنوی ادب کے ساتھ ان نا انصافیوں کی تفصیل آپ کو ہماری دوسری کتاب "لکھنؤ کی ادبی میراث" میں ملے گی۔ یہاں تو صرف تاریخی، تمدنی اور تہذیبی اقدار کا جائزہ ہمارا مقصودِ نظر ہے۔

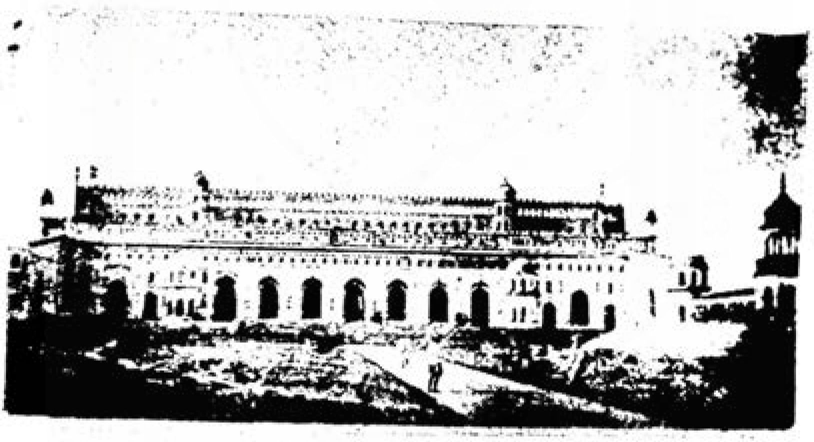
اس میں شک نہیں کہ مولانا عبدالحلیم شرر نے "مشرقی تمدن کا آخری نمونہ" لکھ کر اُس چمنستانِ تہذیب

کا ایک روائتی مرقع پیش کر دیا تھا لیکن ضرورت اس امر کی تھی کہ اُس داستانی رنگ کو تاریخی فضا مُہیا کر دی جائے۔ چنانچہ ہم نے زیرِ نظر کتاب میں اپنا نقطۂ نظر تاریخی حقائق کی بنیادوں پر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ توقع ہے کہ یہ علمی سرمایہ اس عہد کو سمجھنے کے سلسلے میں ایک مستند و معتبر دستاویز کی حیثیت سے قبول کیا جائے گا۔

ڈاکٹر سید صفدر حسین

راولپنڈی

۳ر جنوری ۱۹۷۵ء



امام باڑہ آصف الدولہ لکھنؤ

اَوَدھ کی سیاست، تاریخ اور طرزِ زندگی

باب اوّل

دِلّی کا زوال

بارہویں صدی عیسوی کے اختتام پر ہندوستان میں ایک مستحکم اسلامی سلطنت قائم ہو گئی تھی جس نے کم و بیش سَو سال کے عرصہ میں اپنی سیاسی قوت اور اپنا اثر و اقتدار اتنا بڑھا لیا کہ شمالی ہند کے علاوہ (بندھیاچل سے گذر کر) رفتہ رفتہ دکن تک وسیع ہو گئی۔ اس طویل مُدت میں بہت سے بادشاہ اور متعدد شاہی خاندان بدلے لیکن اسلامی سلطنت کی تنظیم مسلسل پانچ صدیوں تک کمزور نہ ہوئی۔ آخری مسلمان خاندان جس نے کم و بیش ساڑھے تین سو سال تک حکومت کی، تُرکستان کے مغلوں کا خاندان تھا۔ اس خانوادے کے پہلے چھ بادشاہوں کی حکومت دو صدیوں تک پھیلی ہوئی ہے۔ ان بادشاہوں کے رُجحانات کے انفرادی فرق کو نظر انداز کر کے دیکھئے تو اس طویل مُدت میں سلطنت کی تنظیم اور تہذیبی تشکیل میں بڑی یکسانیت ملے گی اور اسی یک رنگی و ہمواری کے باعث ان کی سیاسی قوت اور تہذیبی روایات روز بروز مستحکم ہوتی اور عروج پاتی رہیں۔

ہندوستان کی اسلامی حکومتوں بالخصوص مغلیہ خاندان نے تمام مُلک کو ایک مضبوط سیاسی مرکز سے مربوط کر دیا تھا۔ اس لئے اس عہد میں امن و امان کی بحالی، آمد و رفت کی سہولت اور صنعت و حرفت کو بڑا فروغ ہوا۔ انہوں نے امتیازِ رنگ و نسل سے ہٹ کر مذہبی رواداری کے پیشِ نظر تمام ہندوستان میں ایک تہذیبی یگانگت پیدا کر دی۔

میں وراثت کی جنگ شروع ہو جائے گی۔ اس لئے اُس نے اپنی سلطنت تینوں بیٹوں میں تقسیم کر کے اپنے مرنے سے گیارہ دن پہلے کام بخش کو بیجاپور کی طرف بھیج دیا۔ اور اس کے چار روز بعد محمد اعظم کو مالوہ کی طرف۔ اُس کا بڑا بیٹا محمد معظم جسے از روئے وصیت کابل سے بنگال تک تمام شمالی ہند دیا گیا تھا پہلے ہی سے افغانستان میں موجود تھا۔ جب اورنگ زیب کا انتقال ہوا تو اُس کی وفات کی خبر سب سے پہلے محمد اعظم کو ہوئی، جو احمد نگر سے صرف چالیس میل کے فاصلہ پر ٹھہرا ہوا اپنے باپ کی موت کا منتظر تھا۔ وہ خبر پاتے ہی اگلے دن احمد نگر پہنچ گیا اور چند روز کی رسمی تعزیت کے بعد تاج شاہی پہن کر بادشاہ بن گیا۔ لیکن اس میں بعض بنیادی کمزوریاں ایسی پائی جاتی تھیں جو اُس کے لئے ناساز گار ثابت ہوئیں۔ ان میں سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ اُس کے کردار کے نقائص کی وجہ سے درباری اُمراء کو اُس پر اعتماد نہ تھا۔ اور جب بادشاہ ہو کر اُس نے اپنے نا اہل ہوا خواہوں کو عہدے تفویض کیئے تو کئی معتمد امیر ناراض ہو کر اُس کے دربار سے کنارہ کش ہو گئے۔ ان میں چین قلیچ خاں اور محمد امین تورانی بھی شامل تھے۔ محمد اعظم خود اتنا شکی مزاج واقع ہوا تھا کہ اُسے اپنے بیٹے بیدار بخت تک پر اعتماد نہیں تھا۔ ورنہ شہزادہ اپنے خُسر باقی خان کی مدد سے جو آگرہ کا قلعہ دار تھا قلعہ پر قابض ہو سکتا تھا لیکن محمد اعظم نے یہ سمجھ کر کہ کہیں شہزادہ خود ہی اپنی بادشاہت کا اعلان نہ کر دے، تقریباً پچاس دن جن میں سخت کد و کاوش کی ضرورت تھی بیکار کھو دیئے۔ اس کے برخلاف اِن کا حریف محمد معظم بہت پہلے سے تیار بیٹھا تھا۔ اُس کے دُور اندیش نائب منعم خان نے پہلے ہی سے جالندھر میں ایک کثیر فوج جمع کر رکھی تھی۔ اور دریاؤں کے عبور کرنے کے لئے بھی سواریوں اور کشتیوں کا بہت اچھا انتظام کر لیا تھا۔

محمد معظم، باپ کی وفات کی خبر پا کر جمرود سے چلا۔ اُس نے شاہدولہ کے پُل پر یعنی دریائے چناب کے کنارے اپنی تاج پوشی کی رسم ادا کی اور ساٹھ لاکھ روپیہ اور ایک

مضبوط فوج لے کر اپنے معتمد منعم خاں کی معیت میں آگرہ کی طرف روانہ ہوا۔ اُس کے بیٹے عظیم الشان نے، جو بنگال اور بہار کا گورنر تھا اپنے باپ سے پہلے ہی آگرہ پہنچ کر قلعہ کا محاصرہ کر لیا تھا۔ جب چند روز بعد محمد معظم (بہادر شاہ) بھی آگرہ پہنچ گیا تو باقی خاں نے مجبور ہو کر قلعہ بہادر شاہ کے سپرد کر دیا۔ اب اُس نے دِلّی اور آگرہ پر قابض ہو کر محمد اعظم کی طرف توجہ کی۔ دونوں شہزادوں کی فوجیں جو ایک ایک لاکھ سے زیادہ تھیں جاجو کے مقام پر ایک دوسرے سے ٹکرائیں۔ اس جنگ میں محمد اعظم اور اس کا بیٹا بیدار بخت دونوں مارے گئے اور اُن کے جو امراء باقی بچے اُنہوں نے نئے بادشاہ کی اطاعت قبول کر لی۔ اب بہادر شاہ اپنی سیاسی قوت مستحکم کر کے جنوب کی طرف متوجہ ہوا جہاں اُس کے بھائی کام بخش نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا تھا۔ مئی ۱۷۰۸ء ۱۱۲۰ھ میں بہادر شاہ نے منعم خاں اور ذوالفقار خاں کو بھیج کر اُس کی بادشاہت بھی ختم کرا دی۔ اس طرح ایک سال کے اندر ہی اندر شاہ عالم محمد معظم بہادر شاہ تمام سلطنت کا واحد حکمران ہو گیا۔

بہادر شاہ کو بڑی پختہ عمر میں تخت و تاج میسر آیا تھا اس لئے کہولت کی سنجیدگی اور زندگی کے تجربات کی وجہ سے اُس کی طبیعت میں بڑا اعتدال تھا جو ملکی مسائل کو سلجھانے میں بہت مفید ثابت ہوا۔ اُس نے پانچ سال تک سکون و اطمینان کے ساتھ حکومت کی۔ ارادت خاں نے اُس کے دربار کی شان و شوکت کا حال لکھتے ہوئے ہمیں بتایا ہے کہ یہ درباری شان و شکوہ شاہجہان سے اورنگ زیب تک کسی بادشاہ کو بھی میسر نہ تھی۔ شاہ عالم کے دربار میں سترہ شہزادے جو اس کے بیٹوں، بھتیجوں اور پوتوں پر مشتمل تھے تخت کے گرد بیٹھتے تھے۔ اُن کے پیچھے مفتوحہ ممالک کے شہزادے ہوتے تھے۔ پھر اُمراء اور اراکین کا مجمع ہوتا تھا۔ بہادر شاہ کے انعامات اور خلعت بھی مغلیہ سلطنت کے شایانِ شان ہوتے تھے [۱] یہ بادشاہ اپنی ذہانت، سیاست اور آزاد خیالی میں بابر کا صحیح وارث تھا۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ اگر وہ شاہجہان کے بعد حکمران ہوا ہوتا تو مغلیہ سلطنت زوال سے

بچ سکتی تھی۔ اُس کو اُمراء بھی اتفاق سے ایسے ملے تھے جو نہایت دیانت دار، ہمدرد، مخلص اور ہوشیار تھے۔

مغلیہ خاندان کو دوسری جنگِ وراثت لاہور میں لڑنی پڑی۔ جب بہادر شاہ نے فروری ۱۷۱۲ء/۱۱۲۴ھ میں انتقال کیا تو اُس کے چاروں بیٹے لاہور میں موجود تھے۔ بہادر شاہ ان میں سب سے زیادہ عظیم الشان کو عزیز رکھتا تھا۔ اور حقیقت بھی یہی تھی کہ اپنے بھائیوں میں وہی سب سے بہتر تھا۔ لیکن دربار کے سب سے زیادہ ذی اثر امیر ذوالفقار خاں نے جہاں دار شاہ کا ساتھ دیا اور اپنی حکمتِ عملی سے باقی تین بھائیوں کو عظیم الشان کے خلاف متحد کر دیا۔ جب لڑائی میں عظیم الشان کا ہاتھی بھاگ کر اپنے سوار کے ساتھ دریائے راوی میں ڈوب گیا تو پھر ایک ایک کر کے باقی دو حریف شہزادے بھی ختم کر دیئے گئے اور جہاں دار شاہ پوری سلطنت کا مالک ہو گیا۔

جہاں دار شاہ عیاش شخص تھا اور رات دن عیش و عشرت میں مُبتلا رہتا تھا۔ ایک بازاری رقاصہ لال کنور سے اُسے عشق تھا اس لئے جہاں پناہ کی زندگی اور سلطنت کے کاروبار اُسی کی چشم و ابرو کے اشارے پر چلتے تھے۔ ہیرے جواہرات کی بارشوں کے علاوہ لال کنور کو دو کروڑ روپے سالانہ وظیفہ ملتا تھا۔ وہ اپنے عہد کی نور جہاں بننا چاہتی تھی اور اُسی کی تقلید میں سلطنت کے کاروبار میں دخیل ہوتی تھی۔ اُس نے اپنے بہت سے اعزّہ اور ملاقاتیوں کو بڑے بڑے مراتب دِلا دیئے تھے۔ اُس کے یہ رشتہ دار اور سفارشی آئے دن درباریوں اور باعزت اُمراء کی توہین کا باعث ہوتے رہتے تھے۔ اس لئے بعض اُمراء نے خود دربار سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور بعض کو لال کنور کے اشارے پر برطرف کر دیا گیا۔ اب ہر طرف نااہل اور کمینے لوگوں کا دَور دورہ تھا۔ سلطنت کے تمام کارخانے درہم برہم ہو گئے تھے اور بقول خافی خان یہ گویّوں اور ڈوم ڈھاریوں کا عہد تھا۔ اس سلسلہ میں ایک لطیفہ تاریخ میں یادگار ہے کہ جب لال کنور کے ایک بھائی کو مُلتان کی گورنری عطا ہوئی تو درباری رسم

کے مطابق اُس نے وزیر السلطنت کو نذر پیش کرنی چاہی۔ وزیر نے نذر میں ایک ہزار طنبوروں کی فرمائش کردی۔ جب یہ بات بادشاہ کو معلوم ہوئی تو اُس نے وزیر سے اس فرمائش کی وجہ دریافت کی۔ ذوالفقار خاں نے جواب دیا کہ جب حضور ڈوم ڈھاریوں کو انتظامِ سلطنت سپرد فرمائیں گے تو ظاہر ہے کہ شرفاء کے لئے یہی کام رہ جائے گا کہ گھر میں بیٹھ کر طنبورے بجایا کریں۔ یہ بات سن کر بادشاہ کو بڑی خفت ہوئی لیکن وہ تو لال کنور کے عشق میں دیوانہ ہو رہا تھا اُسے دنیا اور مافیہا کی کچھ فکر نہ تھی [۱]

جہاں دار شاہ کی حکومت کچھ کم ایک سال اسی طرح چلتی رہی۔ آخر کار جب اُسے اطلاع ملی کہ اُس کے بھتیجے فرخ سیر نے سیّد حسین علی خان اور اُن کے بڑے بھائی سید حسن علی معروف بہ عبداللہ خاں سے امداد لے کر عظیم آباد میں جنگ کی تیاری شروع کردی ہے تو یہ خبر سُن کر اُس نے اپنے بیٹے عزالدین کو پچاس ہزار فوج دے کر مقابلہ کے لئے روانہ کیا۔ لیکن ولی عہد نے کھجوہ کے مقام پر شکست کھائی اور تمام مال و اسباب لٹا کر واپس بھاگ آیا۔ بیٹے کی شکست کا حال سُن کر جہاں دار شاہ اپنی محبوبہ کو ساتھ لئے ہوئے مقابلہ کے لئے دِلّی سے آگرہ پہنچا۔ لیکن عیش پرستی اور بدنظمی نے اُس کی مالی حالت اتنی کمزور کر دی تھی کہ فوج کی تیاری کے مصارف بھی برداشت نہیں ہو سکتے تھے، اس لئے مجبوراً سونے چاندی کے زیورات، ظروف اور محل کی چاندی کی چھتیں فروخت کرکے فوج کا سامان مہیا کیا گیا۔ شہزادہ عزالدین اور چورامن جاٹ کی جمعیت بادشاہ کے ساتھ تھی اور دوسری طرف فرخ سیر سادات بارہہ کی سرکردگی میں آگے بڑھ رہا تھا۔ بالآخر سموگڑھ کے قریب دونوں فوجیں ایک دوسرے کے مقابل آئیں۔ جب لڑائی تنت پر آئی تو جاٹوں نے بادشاہ کی حمایت میں لڑنے کے بجائے خود شاہی کیمپ کو لوٹنا شروع کردیا۔ بادشاہ کے پاؤں اُکھڑ گئے اور وہ لال کنور کی سواری میں بیٹھ کر روپوش ہو گیا۔ ایک رات کسی محفوظ مقام پر قیام کرکے اُس نے اپنی ریش قطع کی اور بھیس بدل کر دِلّی پہنچا جہاں وہ قید کر لیا گیا اور ۱۶ محرم ۱۱۲۵ھ

مطابق ۱۷۱۳ء کو فرخ سیر کے حکم سے قتل کر دیا گیا[۱]

فرخ سیر نے بادشاہ ہوتے ہی تیموری خاندان کے تمام شاہزادوں کو جن میں اُس کا دس سالہ حقیقی بھائی ہمایوں بجنت بھی شامل تھا اندھا کرادیا۔ جہاں دار شاہ کے طرف دار اُمراء کی املاک ضبط کر لی گئیں اور اُن میں سے بعض کو قتل بھی کرادیا گیا جب فتح مند فرخ سیر ۷ ارمحرم کو دِلّی میں داخل ہوا تو اُس کے جلوس کی یہ شان تھی کہ ایک نیزے پر مرحوم بادشاہ جہاں دار شاہ کا سر تھا اور ایک ہاتھی کی دُم سے اُس کے وزیر ذوالفقار خاں کی لاش بندھی ہوئی تھی۔[۲]

فرخ سیر کو حکومت دُو سید بھائیوں کی بدولت نصیب ہوئی تھی اس لئے دربار میں اُن کا اثر و اقتدار بڑھ جانا لازم تھا۔ یہ بات بعض درباری اُمراء کے جذبۂ حسد کو ناگوار تھی اس لئے وہ ہر وقت بادشاہ کو اشتعال دیتے رہتے تھے اور بادشاہ اپنی ناشکرانہ ذہنیت کی وجہ سے رات دِن اُن کی تباہی کے منصوبے باندھتا رہتا تھا۔ لیکن چونکہ وہ خود بُزدِل، نااہل اور متلوّن مزاج تھا اس لئے اُس کی کوئی سازش بھی پوری نہ ہو سکی اور ہر بار اُس کا راز طشت از بام ہو گیا۔ شاہی سازشوں کی مسلسل ناکامیوں اور پھر افشائے راز کے باعث درباری اُمراء کو ہر بار قطب الملک سے شرمندہ ہونا پڑتا تھا اس لئے وہ ایک ایک کر کے بادشاہ کی جماعت سے ٹوٹنا شروع ہوئے اور وزیرِ اعظم سے ملتے گئے۔ جب دونوں بھائیوں نے دیکھا کہ بادشاہ بار بار کی صلح صفائی کے بعد بھی اپنی مخالفانہ روش نہیں بدلتا تو انہوں نے مجبور ہو کر ایک دن فرخ سیر کو گرفتار کر لیا اور دربار کی عام رسم کے مطابق اُس کی بینائی زائل کر کے قید میں بھیج دیا۔ سید عظمت اللہ بیخبر نے اس واقعہ کی تاریخ کہی ہے

باشاہِ جنونی انچہ شاید کردند | ازدستِ حکیم انچہ آید کردند
بقراطِ خرد نسخۂ تاریخ نوشت | سادات دواش انچہ باید کردند

تزک جہانگیری کے مطابق جسمانی طور پر ناکارہ شہزادہ بادشاہ نہیں بن سکتا تھا اس لئے

فرخ سیر نے اپنی حکومت کے تحفظ کے طور پر تمام تیموری شہزادوں کو اندھا کرا دیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فرخ سیر کی معزولی کے بعد کوئی بھی شہزادہ حکمران بننے کے لائق نظر نہ آتا تھا اس لئے سیّدوں نے مجبوراً ایک مدقوق شہزادے رفیع الدرجات (پسر رفیع الشان) کو تخت نشین کر دیا۔ بالکل اسی زمانہ میں آگرہ کے قلعہ دار متر سین نے نکوسیر (پسر اکبر شاہ) کو قید سے نکال کر آگرہ میں بادشاہ بنا لیا۔ جب یہ خبر دلّی پہنچی تو بغاوت فرو کرنے کے لئے امیر الامراء سید حسین علی خاں آگرے کی طرف روانہ کئے گئے۔ اُنہوں نے آگرہ پہنچ کر قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ میر عبدالجلیل بلگرامی قصیدۂ غرا میں فرماتے ہیں ؎

آں امیرِ جماعتِ اُمراء — چوں حسینِ علی ہژبر شیم
کرد نہضت بدولت از دہلی — فضلِ حق ہمعناں ظفر ہمدم
آمد و قلعہ را محاصرہ کرد — ہمچو انگشت و حلقۂ خاتم
فتحِ قلعہ بزورِ تیغ نمود — ایں چنیں می کنند اہلِ ہمم

کرد عبدالجلیل در تاریخ
"قلعۂ آگرہ گرفت" رقم
۱۱۳۱ھ

بالکل اسی زمانے میں رفیع الدرجات نے تین ماہ اور چند روز حکومت کر کے دلّی میں قضا کی اور اُس کے بجائے اُس کا بھائی رفیع الدولہ بادشاہ بنا دیا گیا۔ آگرہ کے محاصرے میں متر سین خودکشی کر چکا تھا اور نکوسیر قید ہو گیا تھا لیکن متر سین کی حمایت کے لئے راجہ جے سنگھ سوائی آمیر (جے پور) سے چل پڑا تھا اس لئے اُس کی سرکوبی کے لئے قطب الملک دلّی سے اور امیر الامراء آگرہ سے روانہ ہوئے۔ دونوں بھائیوں کی فوجیں ودیاپور (نزد فتح پور سیکری) کے مقام پر جمع ہوئیں۔ نیا بادشاہ رفیع الدولہ بھی اُن کے ہمراہ تھا جو افیون کی کثرتِ استعمال کے باعث کمزور ہو گیا تھا۔ یہاں آ کر وہ عارضۂ اسہال میں مبتلا ہوا اور جانبر نہ ہو سکا۔ اب سیّدوں نے ۲۹ ستمبر ۱۷۱۹ء (۱۱۳۱ھ) کو روشن اختر (پسر جہاں شاہ) کو محمد شاہ کے لقب سے

بادشاہ بنا دیا جس نے کم وبیش تیس سال مسلسل حکومت کی۔

ملک کے سیاسی انتشار اور فرمانرواؤں کی نااہلی کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ اورنگ زیب کی وفات سے بارہ سال کے اندر ہی اندر آٹھ بادشاہ سریر آرائے سلطنت ہوئے۔ آٹھویں بادشاہت محمد شاہ کی تھی جس کے عہد میں چند تورانی اور بعض ایرانی اُمراء نے مل کر ساداتِ بارہہ کی سیاسی قوت کا خاتمہ کر دیا۔ اس کے صلہ میں نوعمر بادشاہ نے دربار کر کے اُن کے قاتلوں کو انعامات عطا کئے۔ چناں چہ محمد امین تورانی وزیر بنا دیئے گئے۔ اُن کے بیٹے قمرالدین کو ہفت ہزاری منصب ملا۔ اور سید محمد امین نیشاپوری جو بعد کو سعادت خان برہان الملک بن کر حکومتِ اودھ کے بانی ہوئے، کو پنج ہزاری کر دیا گیا۔

تخت نشینی کے وقت محمد شاہ کی عمر سترہ سال کے قریب تھی۔ اس میں سے سات سال اُس نے قید میں گزارے تھے اس لئے نہ اُس کی تعلیم ہی ڈھنگ کی ہو سکی تھی اور نہ تربیت ہی اچھی ملی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت ہاتھ میں آتے ہی بادشاہ رامش ورنگ میں مصروف ہو گیا۔ مملکت کے سارے کاروبار درباریوں کے ہاتھ میں آگئے جو رات دن ایک دوسرے کے خلاف سازشوں میں لگے رہتے تھے۔ سلطنت کی یہ حالت تھی جب ۱۷۳۸ء / ۱۱۵۱ھ میں نادر شاہ ایک زبردست فوج کے ساتھ ٹوٹ پڑا۔ اُس نے کرنال کے قریب محمد شاہ کی دو لاکھ فوج کو شکست دی اور پھر دلّی میں داخل ہو گیا جہاں اُس کی فوج نے قتلِ عام کر کے سلطنت کی بُنیادیں متزلزل کر دیں۔ وہ اٹھاون دن دلّی میں قیام کر کے ستّر کروڑ کا مال و اسباب اپنے ہمراہ لے گیا اور چلتے چلتے اٹک پار اور افغانستان کے علاقے بھی اُس کے زیرِ نگیں آگئے۔ سعادت خان برہان الملک نے نادر شاہ کے قیام کے دوران ہی میں خودکشی کر لی تھی اور نظام الملک دلّی کے کاروبار سے مایوس ہو کر دکن چلا گیا تھا۔ اس زمانہ میں بنگال، بہار، اڑیسہ اور روہیل کھنڈ وغیرہ کے

بہت سے صوبہ دار آزاد ہو گئے۔ نادر شاہ کے بعد اُس کے ایک عہدہ دار احمد شاہ ابدالی نے کئی بار پنجاب پر حملہ کیا اور لاہور و ملتان کے علاقوں پر قابض ہو گیا۔ غرض ملک کی حالت اس قدر سقیم تھی جب محمد شاہ نے انتقال کیا اور اُس کا بیٹا احمد شاہ بائیس سال کی عمر میں تخت نشین ہوا جس نے صفدر جنگ کو اپنا وزیر مقرر کیا۔

احمد شاہ کی تمام زندگی شاہی حرم میں بیگمات کے ساتھ گذری تھی اس لئے اُسے بھی اپنے باپ کی طرح انتظامِ سلطنت اور فوجی تربیت کا مطلق شعور نہ تھا۔ وہ بُزدل اور عیاش بھی تھا۔ اُس کے ذوقِ حُسن پرستی نے تمام محل کو خوبصورت عورتوں سے بھر دیا تھا۔ اُس کی ماں نواب قدسیہ بیگم سلطنت کے تمام کاروبار پر چھا گئی تھی۔ اُس نے جاوید خاں خواجہ سرا کو ہفت ہزاری منصب اور نواب بہادر کا خطاب دلا دیا تھا۔ اور اُس کا اثر اتنا بڑھ گیا تھا کہ وہ وزیر السلطنت تک کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ ایک بار اُس نے صفدر جنگ سے ناراض ہو کر ناصر جنگ کو وزارت کی پیش کش بھی کی تھی اور اُسی کی حرکات سے بیزار ہو کر صلابت خاں میر بخشی نے دربار کا آنا جانا چھوڑ دیا تھا۔ بالآخر صفدر جنگ نے ایک موقع پر بادشاہ کا اشارہ پاکر جاوید خاں کو مروا ڈالا۔ کچھ عرصہ بعد احمد شاہ ابدالی کا سفیر ستاپچیس لاکھ روپے بطور خراج طلب کرنے کے لئے دلی آیا۔ اس روپے کی فراہمی کے سلسلہ میں صفدر جنگ اور بادشاہ کا اختلاف یہاں تک بڑھا کہ خانہ جنگی کی نوبت آگئی۔ تقریباً چھ ماہ یہ ہنگامہ جاری رہا جس سے پرانا شہر بالکل تاراج ہو گیا۔ آخر مادھو سنگھ والیِ جے پور نے درمیان میں پڑ کر بادشاہ اور وزیر کی صلح کرادی جس کے نتیجہ میں صفدر جنگ اپنے صوبہ (اودھ) کو واپس چلے گئے۔ اب وزارت کا عہدہ انتظام الدولہ (پسر قمر الدین خاں) کو اور بخشی گری کا منصب اُس کے بھتیجے غازی الدین عماد الملک کو مل گیا۔

صفدر جنگ کے چلے جانے کے چھ ماہ بعد غازی الدین عماد الملک (نبیرۂ نظام الملک) اپنے چچا کو ہٹا کر خود وزیر السلطنت بن گیا۔ اُس نے بادشاہ کو اندھا اور معزول کر کے

سلیم گڑھ کے قلعہ میں قید کر دیا۔ اور اُس کے بجائے عزیزالدین (پسر جہاندار شاہ) کو عالمگیر ثانی کے لقب سے تخت پر لا بٹھایا۔ یہ بادشاہ بھی عماد الملک کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی تھا۔ اسے بھی عماد الملک نے نجیب الدولہ کی طرف داری پر ناراض ہو کر فیروز شاہ کے کوٹلے میں ایک فقیر کی قدم بوسی کے وقت دھوکے سے قتل کرا ڈالا۔ اب شاہجہان ثالث (نبیرۂ کام بخش) کو بادشاہ بنایا گیا۔ اسی کے زمانے میں احمد شاہ ابدالی نے دِلّی کو لوٹا اور پھر اُس کے چار سال بعد اُس نے پانی پت کے مقام پر مرہٹوں کو بھی شکستِ فاش دی۔ اس طرح اگر ایک طرف دِلّی کی کمر ٹوٹ گئی تو دوسری طرف اُس کے سب سے بڑے حریف مرہٹے دس سال کے لئے شمالی ہند سے نیست و نابود ہو گئے۔ اب احمد شاہ ابدالی نے شاہ عالم ثانی کو دِلّی کا بادشاہ بنایا اور شجاع الدولہ کو اُس کا وزیر مقرر کیا۔ اس بادشاہ نے طویل عمر پائی۔ اسی کے عہد میں دِلّی کا زوال انتہا کو پہنچ گیا اور سلطنت دم توڑنے لگی۔[1]

صوبوں کا انتظام

شاہی خاندان کے افراد، اُمرا اور دربار کی حالت آپ نے دیکھ لی۔ اب آیئے ذرا اُس کے بیرونی نظام کا جائزہ لیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اورنگ زیب کی وفات کے بعد دِلّی کی سلطنت کو متزلزل کرنے میں جن طاقتوں کا بڑا ہاتھ تھا اُن میں راجپوت، بُندیلے، مرہٹے، جاٹ، سکھ، رُہیلے، بنگش پٹھان، ایرانی و تورانی اُمراء اور انگریز سب ہی شامل تھے اور انہیں کی سرگرمیوں سے زوالِ دِلّی کی داستان مرتب ہوتی ہے۔ سب سے پہلے راجپوتوں کو لیجئے۔ ان کے مراکز جودھ پور اور آمیر (جے پور) تھے، جہاں اورنگ زیب کے زمانے میں بھی ایک دو بار شورش برپا ہو کر دب گئی تھی۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد راجہ اجیت سنگھ نے بغاوت کر کے اپنا موروثی علاقہ چھین لیا تھا لیکن بہادر شاہ نے بہت جلد امن قائم کرا دیا۔

جب بہادر شاہ کی وفات کے بعد وراثت کی جنگ سے انتشار پیدا ہوا تو اجیت سنگھ نے موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے شاہی افسروں کو جودھ پور سے نکال دیا اور اجمیر پر بھی

قبضہ کر لیا۔ فرخ سیر کے زمانے میں امیر الامُراء سیّد حسین علی خان نے اجیت سنگھ کو صلح پر مجبور کر دیا تھا لیکن جب محمد شاہ کا زمانہ آیا تو راجہ نے سادات بارہہ کی حمایت میں پھر بغاوت کی۔ اس بار پھر صلح ہو گئی اور راجپوت کچھ عرصہ کے لئے خاموش ہو گئے لیکن اجیت سنگھ کے بعد اُس کے بیٹے بخت سنگھ نے سر اُٹھایا اور آئے دِن حکومت کو تنگ کرتا رہا۔

جاٹوں کا علاقہ آگرہ کے شمال مغرب میں اُس شاہراہ پر واقع تھا جو دِلّی سے آگرہ اور دھول پور ہوتی ہوئی مالوہ سے گذر کر دکن جاتی تھی۔ اورنگ زیب جب دکن میں جنگ آزما تھا تو سلطنت کے تمام اعلیٰ افسر دکن کی مہم پر لگا دیئے گئے تھے۔ اس زمانہ میں جاٹوں نے آزادی پاکر ارد گرد کے علاقے میں لوٹ مار شروع کر دی تھی اور غیر آباد جنگلوں میں اپنی گڑھیاں بنالی تھیں جہاں وہ اپنے آپ کو محفوظ رکھتے تھے۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد جاٹوں کے ایک سردار چورامن نے سر اُٹھایا اور دلّی اور آگرہ کی درمیانی سڑک کو راستہ چلنے والوں کے لئے سخت مخدوش بنادیا۔ اُس نے کئی صوبوں کی مالگذاری چھین لی اور کئی وزیروں کو راستہ میں لوٹ لیا۔ راجہ جے سنگھ سوائی نے بیس ماہ جاٹوں کا محاصرہ کر کے ۱۷۱۶ء میں اُنہیں معافی مانگنے پر مجبور کر دیا تھا لیکن وہ خاموش نہ بیٹھ سکے اور انتشار کے مواقع سے فائدہ اُٹھاتے رہے۔ جب جہاندار شاہ اور فرخ سیر کے مابین جنگ ہوئی تو چورامن بھی جہاندار شاہ کے ساتھ میدان میں آیا لیکن اُس نے بادشاہ کی حمایت میں لڑنے کے بجائے دورانِ جنگ میں دونوں حریفوں کے کیمپ کو لوٹ لیا۔ اسی نوعیت کا ایک حادثہ اُس وقت ہوا جب محمد شاہ اور قطب الملک کے درمیان حسن پور میں معرکہ پڑا۔ یہاں بھی وہ بادشاہ کا حامی بن کر آیا تھا لیکن لڑائی کے وقت اُس نے دونوں مخالفین کے کیمپ لُوٹ لئے تھے۔ غرض کہ اسی طرح کی لوٹ مار سے جاٹوں کی طاقت مستحکم ہو گئی تھی۔ جب مرہٹوں کی شکست اور احمد شاہ ابدالی کی واپسی پر دِلّی

کے قرب و جوار میں سیاسی خلا پیدا ہوا تو جاٹوں کے ایک اور سردار سورج مل نے ہاتھ پاؤں نکالے۔ اُس نے بھی ایک بار ۱۷۶۳ء میں دلی کو لوٹا اور رنگ محل کی قیمتی چھت اُتار کر لے گیا۔

پنجاب کی طرف سکھوں نے سر اُٹھا رکھا تھا۔ گرو گوبند سنگھ کے مرجانے کے بعد بندہ نے اُنہیں اتنا منظم کر دیا تھا کہ انہوں نے سونی پت کے حاکم کو شکست دے کر تقریباً چالیس ہزار فوج جمع کر لی۔ اس کے بعد اُنہوں نے ساڈھورہ اور سرہند کو لوٹ کر ڈیڑھ کروڑ روپے کا مال و اسباب فراہم کر لیا اور وہ لاہور پر حملہ کے ارادہ سے امرتسر میں جمع ہو گئے۔ باری دوآب اور رچنا دوآب دونوں اُن کی زد میں تھے۔ بہادر شاہ نے اُن کی شورشوں کو دبا دیا تھا اور محمد امین خان اور رُستم دل خان نے پسرور کے قریب اُنہیں شکست دے دی تھی لیکن جب بہادر شاہ کے جانشینوں میں جنگِ وراثت شروع ہوئی تو سکھوں نے ساڈھورہ اور لوہ گڑھ پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ فرخ سیر کے عہد میں عبدالصمد گورنر نے اُن کا پیچھا کیا اور کوٹ مرزا جان سے سکھوں کو دھکیل کر گورداس پور میں گھیر لیا جہاں دسمبر ۱۷۱۵ء میں بندہ اور اُس کے سات سو چالیس ساتھی گرفتار ہو گئے۔ اُنہیں دلی بھیج کر قتل کر دیا گیا۔ اس شکست کے چالیس سال بعد سکھ پھر اُبھرے۔ اب کی بار اُنہوں نے اپنی بارہ مسلیں قائم کر کے لوٹ مار کا سلسلہ شروع کیا۔ پٹیالہ اُن کا مرکز تھا۔ اُن کے گروہ رات دن لوٹ مار کرتے پھرتے تھے لیکن اُن میں کوئی بڑا لیڈر نہ تھا اس لئے وہ ایک عرصہ تک مختلف گروہوں میں بٹے رہے۔ بالآخر مرہٹوں کی شکست اور ابدالی کی واپسی پر وہ مطمئن ہو کر پنجاب پر حکومت کرنے لگے۔ [۱]

سلطنتِ مغلیہ کے زوال کا ایک بڑا سبب مرہٹوں کی روز افزوں طاقت تھی۔ بہادر شاہ کے عہد میں شیواجی کے پوتے شاہو کو قید کر کے چھوڑ دیا گیا تھا اور اُس نے ستارا کو دارالسلطنت بنا کر اپنی حکومت کا اعلان کر دیا تھا۔ اس طرح دکن میں دو مرہٹہ طاقتیں قائم ہو گئیں۔

ایک شاہو کی، دوسری طاقت تارابائی کی جس کا صدر مقام کولھاپور تھا۔ محمد شاہ کے عہد میں اُنہیں "چوتھ" "سردیش مُکھی" اور "سوراجیہ" کے فرمان مِل گئے تھے جن سے اُن کی طاقت بہت بڑھ گئی تھی۔ جب دِلّی کی وزارت چھوڑ کر نظام الملک دوبارہ دکن واپس گئے تو اُنہوں نے کولہاپور کے مرہٹوں کی جماعت کو اپنے ساتھ مِلا کر شاہو پر حملہ کیا لیکن باجی راؤ پیشوا اُس کی امداد کو پہنچ گیا اور نظام الملک کو دب کر صلح کرنی پڑی۔ اس صلح کی رُو سے نظام نے وعدہ کیا کہ اگر مرہٹے شمالی ہند پر حملہ کریں گے تو وہ مداخلت نہ کرے گا۔ چنانچہ مرہٹوں نے جنوب کی طرف سے بے فکر ہو کر اپنی تاخت وتاراج کا رُخ شمال کی طرف پھیر دیا۔

مغلیہ عہد میں اُس علاقہ کا نام مالوہ تھا جو دریائے جمنا سے نربدا تک پھیلا ہوا تھا۔ اس صوبہ کے مغرب میں راجپوتانہ اور مشرق میں بندھیل کھنڈ واقع تھے۔ ۱۷۲۸ء تک راجہ گردھر بہادر اس صوبہ کا حاکم تھا جس نے اپنے حُسنِ انتظام سے مرہٹوں کو اپنے علاقہ میں پاؤں نہیں رکھنے دیا تھا لیکن جب ملہار راؤ ہلکر اور رانوجی سیندھیا نے اُسے سارنگ پور کے مقام پر قتل کر دیا تو دَیا بہادر کو مالوہ کا انتظام سپرد ہوا۔ یہ بھی مرہٹوں کے ہاتھ سے مارا گیا تو محمد خان بنگش صوبہ دار مقرر ہوا لیکن ایک تو وہ بندھیل کھنڈ میں پہلے ہی مرہٹوں سے شکست کھا چکا تھا اور دوسرے اُسے دِلّی سے کوئی امداد بھی نہ پہنچ سکی تھی اس لیئے وہ اُن کے مقابلہ کی تاب نہ لا سکا۔ اب صُوبہ کا انتظام راجہ جے سنگھ کے سپرد ہوا۔ راجہ بھی اُن کے فتنہ کو نہ روک سکا اور اُس نے پیشوا کو اس شرط پر مالوہ میں اپنی نیابت سپرد کر دی کہ مرہٹے شاہی علاقوں میں لُوٹ مار سے باز رہیں۔ مرہٹوں نے بظاہر تو یہ شرط مان لی تھی لیکن حقیقت میں اُنہوں نے اپنی غارت گری بدستور جاری رکھی اور کچھ عرصہ بعد تو وہ دریائے جمنا عبور کر کے دارالسلطنت کے قُرب وجوار تک پہنچنے لگے۔ بالآخر ۱۷۳۷ء میں اُنہوں نے دِلّی پر بھی دستک دی اور تال کٹورہ کی

جنگ میں مُغل فوج کے بہت سے افسر اور سپاہی ہلاک کر ڈالے۔ بادشاہ نے اُن کی سرکوبی کے لئے نظام الملک کو متعین کیا لیکن وہ خود بھوپال کے مقام پر اُن کے محاصرے میں آگیا۔ اب نئے صلح نامہ کی رُو سے مرہٹوں نے مالوہ حاصل کر لیا اور اس طرح وہ ہندوستان میں سب سے بڑی فوجی طاقت بن گئے۔ ایک بار صفدر جنگ نے اُنھیں بنگشوں کے خلاف استعمال کیا۔ پھر دربارِ شاہی نے اُنھیں پچاس لاکھ روپے معاوضہ اور آگرہ اور اجمیر کی صوبہ داری کے وعدہ پر احمد شاہ ابدالی کے مقابلہ کی دعوت دی لیکن مرہٹوں کے پہنچنے سے پہلے ہی ابدالی کو پنجاب اور ملتان کے علاقے دے کر صلح کر لی گئی تھی۔ اس لئے مرہٹوں نے قرب وجوار کے علاقوں کو لوٹنا شروع کر دیا اور چند لاکھ روپے تاوان وصول کر کے واپس گئے۔ انہوں نے غازی الدین عماد الملک کی حمایت میں پنجاب کو بھی لوٹا اور ابدالی کے لڑکے تیمور شاہ کو لاہور سے باہر نکال دیا۔ اس حادثہ کی اطلاع پاکر احمد شاہ ابدالی ۱۷۵۹ء میں لاہور کی طرف بڑھا اور اُس نے دتا جی سیندھیا کو شکست دے کر مار ڈالا۔ مرہٹوں کی بچی کھچی فوج راجپوتانہ کی طرف بھاگ کر ملہار راؤ ہلکر سے جا ملی۔ لیکن ابدالی کے ایک سردار جہان خان نے سکندر آباد کے مقام پر ہلکر کو بھی شکست دی۔ کچھ عرصہ بعد مرہٹے اپنی تمام طاقت کو سمیٹ کر شمال کی طرف بڑھے اور ۲ اگست ۱۷۶۰ء کو اُنھوں نے دلّی کے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ یہاں بھاؤ نے اپنی فوج کے صرفہ کے لئے دیوانِ عام کی چھتوں کی چاندی اُتار لی اور مقبروں اور زیارت گاہوں کو لوٹ لیا۔ اس وقت احمد شاہ ابدالی انوپ شہر میں خیمہ زن تھا اور برسات ختم ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ شجاع الدولہ اُس کے ساتھ تھا۔ برسات کے بعد تین بڑی اسلامی طاقتوں نے مل کر پانی پت کے مقام پر مرہٹوں کو شکست دی اور اُن کی فوجی تنظیم ختم کر دی۔ لیکن دس سال بعد پھر اُنھوں نے خود کو سنبھال لیا اور شاہ عالم کو الٰہ آباد سے بُلا کر دلّی کے تخت پر بٹھا دیا۔ شمالی ہند میں مرہٹوں کا زور ۱۸۰۳ء میں کم ہوا جب کہ اُنھیں انگریزوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔

اب تک ہم نے جن طاقتوں کا ذکر کیا وہ سب غیر مسلم تھیں آئیے اب ذرا دِلّی کی طرف مسلمان طاقتوں کے رویّے کا بھی جائزہ لیں۔ دِلّی کے مشرق میں ایک علاقہ کٹھیر کہلاتا تھا جو بعد میں روہیل کھنڈ کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ علاقہ دربار کی طرف سے نظام الملک کو بطور جاگیر ملا تھا اور اس کے بعد قمرالدین خاں کے قبضہ میں آیا تھا۔ یہاں شاہی فوج کے ایک افغان سپاہی کا متبنّٰی علی محمد خان رہتا تھا جس نے زمینداروں کی زمینوں کا ٹھیکہ لے کر اپنی قوّت بڑھالی تھی۔ قمرالدین خاں نے اُسے اپنی جاگیر کا بھی انتظام سپرد کر دیا تھا۔ جب نادر شاہ نے قندھار پر حملہ کیا تو وہاں کے پہاڑی علاقے کے بہت سے پٹھان جو رَوہ (یعنی پہاڑی علاقہ) کی مناسبت سے روہیلہ کہلاتے تھے ہندوستان آکر علی محمد خاں کے پاس جمع ہو گئے۔ علی محمد خان نے ایک مدّت سے قمرالدین خاں کی جاگیر کا حساب نہیں دیا تھا۔ اس لئے مرادآباد کے ناظم راجہ ہرنند کو حساب لینے کی تاکید کی گئی۔ علی محمد خان نے حساب دینے کے بجائے ناظم مرادآباد کو قتل کر دیا اور اپنی آزادی کا اعلان کر کے پٹھانوں کی ایک بڑی جمعیت اکٹھی کر لی۔ بالآخر گرفتار ہوا۔ جب احمد شاہ ابدالی کے حملے سے دِلّی میں ابتری پھیلی تو علی محمد خاں قید سے نکل کر مُرادآباد آگیا۔ اُس نے دوبارہ اپنی طاقت مستحکم کر لی۔ اُس کے مرنے کے بعد اُس کا مدارالمہام حافظ رحمت خاں بھی مدّت تک آزاد رہا۔ رُوہیلوں کی ایک شاخ میں نجیب الدولہ بھی تھے جنہیں پانی پت کی لڑائی کے بعد دِلّی میں مدارالمہام کے اختیارات مِل گئے تھے۔ وہ بھی ایک عرصہ تک سلطنت کے سیاہ و سفید کے مالک رہے۔ اُن کا بیٹا ضابطہ خان دِلّی سے آزاد ہو گیا تھا اور اُن کے پوتے غلام قادر روہیلہ نے ۱۷۸۸ء میں شاہی قلعہ کو لوٹ کر بادشاہ کی آنکھیں نکلوالی تھیں۔ [1]

فرخ سیر کے عہد میں ایک اور افغان سپاہی محمد خان بنگش کو جنوبی دوآبہ کا کچھ حصہ بطور جاگیر ملا تھا۔ اُس نے بھی رفتہ رفتہ اپنا اثر و اقتدار بڑھا کر اُس تمام علاقہ پر

قبضہ کر لیا تھا جو علی گڑھ سے کان پور تک پھیلا ہوا تھا۔ اس نئی ریاست کا مستقر فرخ آباد تھا جسے اس نے فرخ سیر کے نام پر آباد کیا تھا۔ ۱۷۴۳ء میں محمد خان کے انتقال کے بعد اُس کا بیٹا قائم خان اپنے علاقہ کا حکمران ہوا۔ ۱۷۴۹ء میں اُسے کٹھیر میں روہیلوں کی بغاوت فرو کرنے کے لئے بھیجا گیا جہاں وہ مارا گیا۔ قائم خان کے مرنے کے بعد صفدر جنگ اور احمد شاہ نے اُس کی املاک کی ضبطی کے سلسلہ میں اُس کی ماں سے ساٹھ لاکھ روپے وصول کر کے احمد خان بنگش کے پاس صرف وہ علاقے چھوڑ دیئے جو فرخ سیر نے عطا کئے تھے۔ کچھ مدت بعد احمد خاں نے اپنی قوت بڑھا کر اس جبر کے خلاف بغاوت کی اور خدا گنج کے مقام پر صفدر جنگ کے نائب نول رائے کو مار ڈالا۔ پھر سہاور اور پٹیالی کے درمیان اُس نے صفدر جنگ کو بھی شکست دی۔ اب اُس نے اپنے بیٹے محمد خاں بنگش کو لکھنؤ اور الٰہ آباد پر قبضہ کرنے کے لئے روانہ کیا لیکن کچھ عرصہ بعد صفدر جنگ نے بنگشوں پر دوبارہ حملہ کیا۔ اس مرتبہ روہیلے بھی بنگشوں کی امداد کو پہنچ گئے تھے لیکن آخر دونوں نے شکست کھائی۔ اب اُن کا نصف علاقہ مرہٹوں کو مل گیا۔ [۱]

دربار اور دِلّی کی حالت مغلیہ سلطنت کی تباہی کا بڑا راز اُس کے اُمراء، اراکینِ سلطنت اور وزراء کی خود غرضیوں میں مضمر ہے۔ سلطنت کے وزرا یکے بعد دیگرے ذوالفقار خاں، قطب الملک، محمد امین خاں، نظام الملک، خانِ دَوراں، قمر الدین خاں، روشن الدولہ، صفدر جنگ، انتظام الدولہ اور عماد الملک وغیرہ ہوئے۔ عام طور پر یہ سب کے سب اپنی عمر کی آخری منزل تک اپنے اقتدار کے لئے تگ و دو کرتے رہے اور سلطنت اور بادشاہ کے مفاد کو اِنہوں نے عموماً نظر انداز کیا لیکن ان سب میں خانوادۂ چُغتائی سے قریبی تعلق تورانیوں کا تھا جو مُغلوں کے ہم وطن ہونے کی وجہ سے شاہی خاندان سے خاص قُربت رکھتے تھے۔ بد قسمتی دیکھئے کہ دِلّی کی تباہی میں سب سے بڑا ہاتھ اِنہیں قریبی لوگوں کا ہے۔ زوالِ سلطنت کے وقت دِلّی

کو اِن کے خاندان کے پانچ وزیر ملے۔ لیکن پانچوں سازشی اور مطلب پرست تھے جن کے کارناموں کی مختصر روئیداد یہ ہے کہ انہوں نے جنگِ وراثت میں جس طرف کا پلّہ کمزور دیکھا اُسی کا ساتھ چھوڑ دیا اور محمد اعظم، کام بخش، رفیع الشان اور جہاندار شاہ کو عین لڑائی کے وقت دغا دی۔ اُنہوں نے اپنے آقا جہاندار شاہ کو قید میں قتل کر کے اُس کا سر فرخ سیر کے حضور میں پیش کیا۔ پھر فرخ سیر کو تخت سے اُتارنے اور قید کئے جانے میں وہ برابر کے شریک تھے۔ کچھ روز بعد اُنہوں نے مُلک کی عظیم فوجی طاقت ساداتِ بارہہ کو اپنی سازشوں کا شکار بنا کے ختم کرا دیا۔ پھر محمد شاہ کے عہد ہی میں مرہٹوں سے ایک خفیہ معاہدہ کر کے اُنہیں شہ دے دی کہ وہ شمالی ہند کو تاخت و تاراج کریں۔ اُنہوں نے احمد شاہ کو تخت سے اُتار کر سلیم گڑھ کے قلعہ میں قید اور اندھا کر دیا۔ اُنہوں نے ۱۷۵۲ء میں دوبارہ مرہٹوں کو بُلا کر دِلّی لُٹوا دی۔ اور ۱۷۵۹ء میں پنجاب کو تاخت و تاراج کرا دیا۔ شہزادہ عالی گہر اُن کے ہاتھ سے بچ کر اودھ چلا گیا تھا لیکن عالمگیر ثانی کو اُنہوں نے قتل کر ڈالا۔ گویا اُنہوں نے دِلّی کے دربار اور دِلّی کی سلطنت کو ایک کھلونا سمجھ لیا تھا کہ جب چاہا توڑ ڈالا۔ اُن کے آخری نمائندے عماد الملک کے کردار کی کچھ جھلک جاین لا (Jean Law) کے اِن الفاظ میں ملتی ہے:

> "میں نے اُس کے کردار میں سوائے فریب اور بے رحمی کے کچھ نہیں دیکھا۔ وہ ہر وقت نئی آرزوئیں رکھتا تھا لیکن اُس کا یہ خلوص سوائے فریب کے کچھ نہ تھا۔ جن پر زیادہ اعتماد کرتا تھا یا جو اُس کی ترقی میں ممد ہوئے تھے اُنہیں کا اُس نے قتلِ عام کیا" [۱]

اِنہیں تورانیوں کی دیکھا دیکھی بنگال، بہار، اڑیسہ اور اودھ وغیرہ بہت سے صوبے مرکزِ حکومت سے ٹوٹنے لگے اور اورنگ زیب کے چند سال بعد سے دِلّی ایک ایسا عبرت کدہ بن گئی جسے سیکڑوں حادثات سے دوچار ہونا پڑا۔ بادشاہوں کی برطرفی، قتل

اور تیموری شہزادوں کے اندھا کئے جانے کے بے شمار تماشے دلی نے دیکھے۔ اُمرا کے عروج وزوال اور ضبطیِ املاک کے بھی بہت سے مناظر اُس کی نگاہ سے گذرے۔ اُس نے تختِ مسند فرخ سیر کے جلوس کے ساتھ جہاندار شاہ کا سر نیزے پر اور اُس کے وزیر ذوالفقار خاں کی لاش ہاتھی کی دُم سے بندھی ہوئی دیکھی تھی۔ اُس نے کئی بادشاہ گروں کو عروج پاتے اور مٹتے دیکھا۔ نواب بہادر جاوید خاں کا سر وزیر کے دروازے پر اور لاش جمنا کی ریتی پر پڑی دیکھی۔ احمد شاہ (بادشاہ) کی لاش کو بھی بے گوروکفن دیکھا۔ عالمگیر ثانی کو بھی ایک فقیر کی قدم بوسی کے وقت ذبح ہوتے ہوئے دیکھا۔ اور شاہ عالم ثانی کی آنکھیں نکالے جانے کا دردناک منظر اُس کی نگاہوں سے گزرا۔

مختصر یہ کہ بادشاہوں کی نااہلی اور درباری اُمرا کی سازشوں اور باہمی کشمکش نے سلطنت کی جڑیں ہلا دی تھیں۔ اُمرا اور رعایا کے اخلاق بگڑ گئے تھے۔ دربار اور شہر دونوں سازشوں کے مرکز تھے۔ آج عروج اور کل زوال بادشاہوں کی طرح اُمرا کی بھی تقدیر ہو گیا تھا۔ جب جہاندار شاہ، بادشاہ ہوا تو اُس نے عظیم الشان کے بڑے بیٹے کریم اور اپنے بہت سے مخالف درباریوں کو قتل کرا دیا۔ جب فرخ سیر حکمران ہوا تو ذوالفقار خاں، سعد اللہ خاں، سیدی قاسم کوتوال، ہدایت کیش، سبھا چند، شادماں خاتون، شاہ قدرت اللہ اور میر جعفر زٹلی کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ بالآخر ایک دن وہ بھی آیا کہ خود فرخ سیر کو قید و موت دونوں کا منہ دیکھنا پڑا اور اُس کے وزیر اور بخشی کو بھی ایسا ہی روزِ بد پیش آیا۔

دلی نے ان حادثات کے ساتھ جہاندار شاہ کی محفلِ عیش، محمد شاہ کی بزمِ طرب، اور احمد شاہ کی مجلسِ حسن کا بھی لطف اُٹھایا تھا۔ جہاندار شاہ کا عہد ایک سال سے بھی کم رہا لیکن اُس کی محبوبہ لال کنور پر جو اہرات کی جو بارش ہوئی اور اس کے عزیزوں اور متوسلین کو جو مناصب ملے وہ بھی دلی کبھی نہیں بھول سکتی۔ لال کنور کے تین بھائیوں کو جو ڈوم ڈھاری تھے نامدار خاں، قسمت خاں، اور خانہ زاد خاں کے خطابات اور نوبت بجوانے کا حق مل گیا

تھا۔ نعمت خان کلاونت کو ملتان کی صوبہ داری عطا ہوئی تھی۔ بادشاہ اور اُس کی محبوبہ لال کنور جسے امتیاز محل کا خطاب تھا عجیب عجیب حرکات کرتے تھے۔ شراب کے نشے اور لال کنور کے عشق میں بادشاہ کو تن من کا ہوش نہ تھا۔ دربارِ شاہی میں سرِ شام ہی اہلِ نشاط جمع ہو جاتے تھے اور وہ شراب اُچھلتی تھی کہ اعلیٰ اور ادنیٰ، بادشاہ اور ڈوم ڈھاریوں کا فرق مٹ جاتا تھا۔ اکثر ایسا بھی ہُوا کہ بادشاہ اور ملکہ نشے کی حالت میں ایسی ایسی جگہ پا گئے جہاں اُن کا جانا باعثِ شرم تھا [۱]

فرخ سیر کا عہد تو تمام کا تمام سازشوں اور جوڑ توڑ ہی میں گزرا لیکن محمد شاہ نے تخت پر بیٹھتے ہی محل اور دربار میں دِن کو روزِ عید اور رات کو شبِ برات بنا دیا تھا۔ اٹھارہ اُنیس سال تک بادشاہ راگ رنگ اور عیش و طرب میں مصروف رہا۔ اُسے موسیقی سے عشق تھا اور وہ خود بھی بہت اچھی ٹھمریاں تصنیف کر لیتا تھا۔ اسی بادشاہ کے درباری گویّے نعمت خاں سدا رنگ نے خیال ایجاد کیا تھا اس بادشاہ کی درباری رنگینیوں کا تذکرہ الہٰ یار خاں کی حدیقۃ الاقالیم اور درگاہ قلی خاں کی مرقعِ دہلی میں نہایت تفصیل سے ملتا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ صحبتِ پری رُخاں اور جشنِ طوائفاں کے ساتھ ساتھ شراب نوشی اور امرد پرستی بھی دربار اور اُمراء کے معمولات میں داخل ہو گئی تھی۔ چنانچہ اعتماد الدولہ قمر الدین خاں، لطیف خاں وغیرہ بہت سے اُمراء شراب نوشی کے عادی تھے۔ اور جنگ نامۂ فرخ سیر و جہاندار شاہ، حدیقۃ الاقالیم، سفر نامۂ آنند رام مخلص اور مرقعِ دہلی وغیرہ کے بیانات سے بعض اُمرد پرست امیروں کے اعمال بھی سامنے آتے ہیں مثلاً اعظم خاں پسر فدوی خاں کے متعلق تحریر ہوا ہے کہ:

"طبعش اماردپسند است و مزاج بہ صحبتِ سادہ رویاں دربند۔ مداخلِ جاگیرش صرفِ اخراجاتِ ایں فرقہ است"

اور مرزا منوّر کی مجلس کو "دار العیارِ شاہداں" اور "محکِ امتحانِ گل رُخاں" سے تعبیر کرتے

ہوئے لکھتے ہیں؛

"ہر زخطِ رنگیں کہ برایں محفل ربط ندارد فردِ باطل است وہر ملیحے کہ برایں
مجمع مربوط نیست از حلیۂ اعتبار عاطل۔"

میرن صاحب کے یہاں تاریخ یازدہم کا جو جشن ہوتا تھا اُس میں:

"امارد رنگیں از کلاونت بچہ ہا وغیرہ در حلقۂ بزمش خیل در خیل و زخطان دلچسپ
از ہنود و مسلمین در دائرۂ مجلسش جوق در جوق" [۱]

دربار کے اس ہیجان بدمستی نے نظامِ مُلک دَرہم بَرہم کر رکھا تھا۔ ہر طرف قتل و غارت گری، سازشوں اور رشوتوں کا دَور دورہ تھا۔ پست اور کمینہ خصلت والوں کو فروغ حاصل تھا۔ کوکہ جیو، رحیم النساء، عبدالغفور شاہ جن اور روشن الدولہ خواجہ سرا دربار اور سلطنت پر چھائے ہوئے تھے اور اُن کے اعزہ و احباب نے دارالسلطنت کا امن و سکون تباہ کر رکھا تھا۔ رحیم النساء ایک رمال کی بیٹی تھی اُسے سلطنت کے کاروبار میں یہاں تک دخل تھا کہ شاہی مُہر اُس کے قبضے میں رہتی تھی۔ اُسی کے توسل سے عبدالغفور کو دربار میں عروج حاصل ہوا، جس نے اپنے تعویذ گنڈے پر حرم سرا تک کو لگا لیا تھا۔ اُس کے عیش و طرب کی محفلیں بھی رات دن آراستہ رہتی تھیں اور اہلِ دِلی اُس کی کمینہ خصلتوں سے پریشان تھے۔ اسی طرح بادشاہ کا رضاعی بھائی کوکہ خان بھی ایک مصیبت بنا ہوا تھا۔ شہر کے بہت سے بدمعاش اُس کے منہ چڑھے تھے جن میں سے ایک خان محمد ڈاکوؤں کا سرغنہ بھی تھا۔ اُس کی طاقت یہاں تک بڑھ گئی تھی کہ کوتوال اُس پر ہاتھ ڈالتے ہوئے ڈرتا تھا۔ جب بعض رہزنوں کے سلسلے میں خان محمد کا نام آیا تو کوتوال نے بادشاہ سے کہا کہ میری ہمت نہیں جو اُس کو گرفتار کر سکوں کیونکہ دربار کے بعض اُمراء اُس کے طرف دار ہیں۔ بادشاہ بھی یہ بات سُن کر خاموش ہو گیا۔ ایک دن اتفاق سے خان محمد اپنے مُربی کوکہ خاں کے ساتھ دربار میں آگیا۔ بادشاہ نے اُس کی گرفتاری کا حکم دیا لیکن اُس کی جرأت

دیکھئے کہ اُس نے بادشاہ کے حضور بھی فرار ہونے کی کوشش کی بالآخر گرفتار ہوا اور اُس سے بیس ہزار کی رقم وصول کی گئی۔ جب اُس پر سختی ہوئی تو اُس نے بہت سے درباریوں اور عہدہ داروں کا بھی پتہ دیا جو اُس کے گروہ میں شریک تھے اور چوری کا مال آپس میں تقسیم کر لیتے تھے۔ [۱]

اِس عہد کی سوسائٹی کا نقشہ شعر و ادب میں بھی ملتا ہے۔ ہماری زبان میں کئی شہر آشوب ایسے موجود ہیں جو اپنے زمانے کی اخلاقی گراوٹ اور معاشرتی زبوں حالی کا مرقع ہیں مثلاً شاہ حاتم فرماتے ہیں ؎

رذالے آج نشے بیچ زر کے ماتے ہیں
پہن لباسِ زری ہم کو پیچ دکھاتے ہیں
مسی پہ پان چبا سُرخرو کہاتے ہیں
کہیں ستار کہیں ڈھولکی بجاتے ہیں
غرورِ غفلت و خوبی کے مدہیں ہیں سرشار

شہوں کے بیچ عدالت کی کچھ نشانی نہیں
امیروں بیچ سپاہی کی قدردانی نہیں
بزرگوں بیچ کہیں بُوئے میہمانی نہیں
تواضع کھانے کی ڈھونڈو سو مِگ میں پانی نہیں
گویا جہان سے جاتا رہا سخاوت و پیار

یہاں کے قاضی و مُفتی ہوئے ہیں رشوت خور
یہاں کے دیکھ لو سب اہل کار ہیں گے چور
یہاں کرم سے نہیں دیکھتے ہیں اور کی اُور
یہاں سبھوں نے بھلایا ہے دل سے موت اور گور
یہاں نہیں ہے مدارا بغیرِ دار و مدار [۲]

محمد شاہ کا عہد اس قسم کی بدنظمیوں سے بھرا پڑا ہے لیکن ۱۷۲۹ء کا ایک واقعہ بہت اہم ہے جس نے ہندو مُسلم فساد کی نوعیت اختیار کر لی تھی۔ ہوا یہ کہ سُبھ کرن ایک جوہری، شاہی دربار سے توسّل رکھتا تھا۔ ایک بار جب شب برات کا زمانہ قریب تھا، وہ چوک سعد اللہ خاں کے پاس سے گزرا۔ یہاں مُسلمان جُفت فروشوں کی دُکانیں تھیں۔ کسی لڑکے نے آتش بازی چلائی تو سُبھ کرن کے طلائی ملبوس پر چنگاریاں جا پڑیں۔ اُس کی برافروختگی

نے تصادم کی صورت اختیار کر لی اور نوبت بادشاہ تک پہنچی۔ قمر الدین خاں وزیر، انصاف کرانے کے لئے متعین ہوئے۔ جامع مسجد میں اس واقعے کا فیصلہ ہونا تھا جہاں مجمع نے پیش نماز کو خطبہ پڑھنے سے منع کیا اور جب وہ باز نہ آیا تو گھونسوں، مکّوں اور لاتوں کی بارش ہونے لگی۔ وزیر نے بدقت امن بحال کرایا ہی تھا کہ کچھ دیر بعد سُبھ کرن کے طرف داروں میں سے روشن الدولہ ظفر خان جو طرّہ باز کہلاتے تھے شیر افگن کو ساتھ لے کر جامع مسجد پہنچ گئے۔ اُنہیں دیکھ کر پھر مجمع بے قابو ہو گیا اور دونوں پر جوتوں کی مار پڑنے لگی۔ بالآخر مشتعل مسلمانوں نے سُبھ کرن کی حویلی ڈھا کر مقتول کی لاش انتقاماً وہاں دفن کی۔ اُردو کے ایک شاعر بنؔیوا نے ایک مخمس میں اس جھگڑے کو نظم کیا تھا جس کے دو بند میؔر کے نکات الشعراء میں موجود ہیں:

یہ کیا ستم ہے لے فلک ہرزہ نابکار
مریخ پر جو تیز کی خنجر کی اپنے دھار
جوتہ فروش مرد مسلمان دیندار
مردود جوہری نے لیا ہے ستم سے مار
سنگِ جفا سے چُور کیا لعلِ آبدار

کتنوں کو مار جی سے قضا نے گرا دیا
کتنوں کو جی بچا کے بہت ہڑبڑا دیا
کاغذ پہ بنیوا نے یہ سن کر چڑھا دیا
لگتے ہی مار جوتیوں طرّہ گرا دیا
تا حشر ہر زباں پہ رہے گا یہ یادگار [۱]

غرض کہ دربار اور دِلّی کا یہ عالم تھا جب ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ نے دستک دی اور اُس کی فاتح فوج نے ایک اتفاقی حادثے سے متاثر ہو کر دِلّی میں قتلِ عام شروع کر دیا۔ شہر کے کوچہ و بازار میں خون کی ندیاں بہہ گئیں اور کئی ہزار آدمی قتل ہوئے۔ نادر شاہ نے طرح طرح کی سختیاں کر کے قمر الدین خاں اور نظام الملک سے ایک کروڑ پچاس لاکھ کے جواہرات وصول کر لئے۔ سعادت خاں برہان الملک کو بھی ایک کثیر رقم ادا کرنی پڑی۔ نادر شاہ ستّر کروڑ کا ساز و سامان جس میں جواہرات کے علاوہ تختِ طاؤس، کوہِ نُور ہیرا، دس ہزار گھوڑے، لاتعداد اونٹ اور تین سو ہاتھی بھی تھے اپنے ساتھ لے گیا۔ اس طرح دِلّی کا جاہ و جلال

خاک میں مل گیا۔ ایک طویل مدت تک کوچہ و بازار مردہ زار معلوم ہوتے تھے اور شہر ایک جلے ہوئے جنگل کی طرح خاک سیاہ تھا۔ اس زمانے میں دلی کے عسکری نظام کی ابتری کا اندازہ شاکر ناجی کے شہر آشوب سے بھی ہو جاتا ہے ؎

لڑے ہوئے نہ برس بیس اُن کو بیتے تھے — دُعا کے زور سے دائی وَدوں کے جیتے تھے
شرابیں گھر کی نکالے مزے سے پیتے تھے — نگار و نقش میں ظاہر گویا کہ چیتے تھے
گلے میں ہیکلیں بازو اوپر طلائی نال

قضا سے بچ گیا مرنا نہیں تو ٹھانا تھا — کہ ئیں نشان کے ہاتھی اوپر نشانا تھا
نہ پانی پینے کو پایا وہاں نہ کھانا تھا — ملے تھے دھان جو لشکر تمام چھانا تھا
نہ ظرف و مطبخ و دُودکاں نہ غلہ و بقال [۱]

دربار کی اس کمزوری سے فائدہ اُٹھا کر جہاں تہاں بغاوتیں اور فتنہ و فساد ہونے لگے تھے۔ آئے دن کے حادثات نے محمد شاہ کو اتنا متاثر کیا کہ وہ آخر تصوف کی طرف مائل ہو گیا۔ اُس نے کئی صوفیوں کو معزز خطابات دے کر کسی کو برہان الطریقت کسی کو برہان الحقیقت اور کسی کو فصیح البیان بنا دیا۔ اور بقول جادو ناتھ سرکار اس سے اثر لے کر دلی کے اُمرا اور عوام درویش پرستی کے رنگ میں رنگ گئے۔ [۲] یہاں تک کہ دلی کے ایک بادشاہ نے تو ایک فقیر کی قدم بوسی کے وقت ہی جان دی۔ اس تصوف اور قبر پرستی کے خیالات کو ملک کے سیاسی انتشار اور معاشی بدحالی نے ایسی ہوا دی کہ بے ثباتیِ عالم اور انسانی بے بسی کے تصورات ذہنوں میں راسخ ہو گئے اور اس سے ذوقِ عمل اور جذبۂ تخلیق دونوں کو نقصان پہنچا۔

نادر شاہ کی واپسی کے چند سال بعد اُس کے جانشین احمد شاہ ابدالی نے اپنے پے درپے حملوں کا آغاز کیا۔ اُس کی آمد کی ہر افواہ سے دلی کے لوگوں کے اوسان خطا ہو جاتے تھے کیونکہ وہ نادر شاہ کا قتلِ عام دیکھ چکے تھے۔ اب ذرا سے کھٹکے پر شرفائے دہلی اپنے ناموس کو شہر کے باہر کسی محفوظ مقام پر پہنچا دیتے تھے اور شہر میں ایسی سراسیمگی پھیل جاتی تھی کہ بازاروں میں

غلہ اور اجناس کی درآمد تک بند ہو جاتی تھی۔ اس انتشار کا زمانہ تھا جب محمد شاہ نے انتقال کیا اور اُس کا اکلوتا نوعمر بیٹا احمد شاہ دِلّی کا بادشاہ ہوا۔ یہ نیا بادشاہ بھی اپنے باپ کی طرح نہایت عیش پسند اور حُسن پرست واقع ہوا تھا۔ اس لئے بہت جلد اُس کا حرم حسین عورتوں سے بھر گیا۔ بادشاہ نے سلطنت کو بھی بچّوں کا کھیل سمجھ رکھا تھا چنانچہ اُس نے شہزادۂ محمود کو تین سال کی عمر میں پنجاب کا گورنر مقرر کر دیا اور ایک سالہ بچّے کو اُس کا نائب بنا دیا۔ دربار میں یہ طفلانہ حرکات ہو رہی تھیں جب سلطنت کے بخشی عماد الملک نے مرہٹوں کو دِلّی پر چڑھائی کرنے کی شہ دی۔ شہر کے گلی کوچوں میں غارت گری کا بازار گرم ہوا۔ بادشاہ مقید ہوئے، انتظام الدولہ مارے گئے اور دِلّی پھر ایک بار بے آبرو ہو گئی۔ عماد الملک نے مرہٹوں کے قرضے کی ادائی کے لئے دِلّی کے کوچہ و بازار میں جبریہ چندہ جمع کرایا جس کی وجہ سے امیر و غریب، صنعت کار اور عہدہ دار تجارت پیشہ اور مزدور سب زیر بار ہو گئے۔ جس شخص نے چندہ دینے سے گریز کیا اُس پر ظلم و ستم کی انتہا کر دی گئی۔ شہر کے ستائے ہوئے لوگ قلعۂ معلّیٰ کے جھروکے کے پاس جا جا کر بے بس بادشاہ سے فریاد کرتے تھے لیکن وہاں کون سُنتا تھا۔ بالآخر نو لاکھ روپیہ جمع کر کے مرہٹوں کا تاوان ادا ہوا۔ شاہی خزانے کی حالت بد سے بدتر ہو گئی۔ صوبوں کی آمدنی بالکل بند ہو چکی تھی۔ فوج کے سپاہیوں کو تین چار سال سے تنخواہ نہیں ملی تھی وہ تنگ دستی کی وجہ سے اپنے گھوڑے، وردی اور اسلحہ تک بیچ کر کھا چکے تھے اور تنگ آ کر آمادۂ فساد تھے۔ وہ کبھی شاہی دیوان کو پتھر مارتے تھے، کبھی بخشی الملک کو پالکی سے گھسیٹ لیتے تھے، کبھی وزیر کے گھر کا محاصرہ کر لیتے تھے اور کبھی بازار کی دکانوں کو لوٹ لیتے تھے۔ حد یہ تھی کہ اُنھوں نے صمصام الدولہ میر بخشی کی میّت پر اس غرض سے قبضہ کر لیا کہ جب تک ہماری تنخواہیں نہیں ملیں گی دفن نہیں ہونے دیں گے [۱] دِلّی کے ان مشاغل کی کچھ جھلک شاہ حاتم کے شہر آشوب میں ملتی ہے ؎

خراب خاقوں میں بیٹھے ہیں ہفت ہزاری کے
چھپا کے بیچیں ہیں جالی لگے کناری کے
پلاؤ کس کو ہے محتاج ہیں بہاری کے
ہمیشہ گالی دیتے لوگ ہیں سواری کے
سپاہ کیا کرے بھوکوں سے بلبلاتے ہیں

جو خانہ زاد تھے وہ منصبوں سے کرتے ہیں راج
غنیم لُوٹے دکھو بادشہ سے لیں ہیں خراج
نکل کے فرقوں سے مُلاگری کے ہیں محتاج
پر اس غضب پہ بھی ہے نور بائی جی کا رواج
زنانے محل میں کچھ مُردیاں دکھاتے ہیں

رسالے نقدی کی بالکل طلب سے رُو بیٹھے
بہت امیر جاگیروں سے ہاتھ دھو بیٹھے
غنیم چاروں طرف صوبہ دار ہو بیٹھے
جہاں پناہ ستی ملک کو ڈبو بیٹھے
دلیک دُور سے تو بھی دھمک دکھاتے ہیں

بہت سے عُمدوں کے بیٹے بھی مستیاں مل مل
گئے ہیں وے بھی زنانوں کی صحبتوں میں رل
ہوئے ہیں پاجیوں میں اس طرح سے گل در گل
نہیں پھرے ہے جو پھیرا ہے ہم نے اُن کا دل
غضب تو یہ ہے کہ راتوں کو خرچی جاتے ہیں

ہمارے دیکھتے ہی کچھ زمانہ اور آیا
دلوں سے مہر گئی اب جفا و جور آیا
نجیب کیا کریں دُنیا کا اور طور آیا
کمینے پھیل گئے پاجیوں کا دَور آیا
گلی دکوچوں میں بن کے سپہی دکھاتے ہیں [۱]

اس بدنظمی اور افراتفری کا دَور تھا جب جنوری ۱۷۵۷ء میں احمد شاہ ابدالی دلی پہنچا۔ اس دفعہ وہ جاٹوں کو سزا دے کر اور قرب و جوار کے علاقوں کو لوٹ کر واپس چلا گیا لیکن چلتے وقت بادشاہ کی شکایت پر عمادالملک کو برطرف کر کے نجیب الدولہ کو بادشاہ کا محافظ بنا گیا۔ اس کا اُدھر جانا تھا کہ عمادالملک مرہٹوں کو ساتھ لے کر دلی پر ٹوٹ پڑا۔ اس نے بادشاہ اور نجیب الدولہ دونوں کو محصور کر لیا۔ بالآخر صلح ہو گئی۔ اس زمانے میں بادشاہ کی مالی حالت بہت خراب ہو گئی تھی۔ صوبوں کی آمدنی تو عرصہ سے بند ہی تھی اب خالصہ

زمینوں پر بھی نجیب الدولہ، مادھو سنگھ، اور جاٹوں کا قبضہ ہو گیا۔ بادشاہ کے پاس بیگمات کے کھانے پینے تک کا بندوبست نہ تھا۔ شاہی سواری کے جانور کئی کئی وقت بھوکے رہتے تھے اور شاہی مطبخ میں بھی کئی کئی دن آگ نہیں جلتی تھی۔ ۱۰ مئی ۱۷۵۵ء کو عید کا دن آیا تو بادشاہ کو محل سے پتھر والی مسجد تک پیدل جانا پڑا [۱] ان تاریخی حقائق کو نظر میں رکھ کر سودا کا شہر آشوب پڑھیے جس سے ہر ہر بات کی تصدیق ہوتی ہے ؎

نہ صرفِ خاص میں آمد نہ خالصہ جاری — سپاہی تا متصدی سبھوں کو بے کاری
اب آگے دفترِ تن کی میں کیا کہوں خواری — سوالِ دستخطی پھاڑ کر کے پنساری
کسی کو آنولہ دے باندھ کر کسی کو کٹول

کروں معاش کا حضرت کی تجھ سے کیا میں بیاں — کہ توشہ خانہ ہے اُن کا پرانچی کی دُکاں
نکل تنور کے منہ سے کہے ہے گاؤ زباں — بکی ہوں تب میں کہ جب کاتبِ خُلد مکاں
بکے ہے تیسرے فاقے میں کوڑیوں کے مول

جو اصطبل میں کئی گھوڑے ہیں تو کیا امکان — کہ ہو وے گھاس کے پُھلے کا اُن کے آگے نشان
کسو کی ٹوٹی ہے تنگڑی کسو کا جھڑ گیا کان — طویلہ اُس کو کہوں یا میں پنج پیر کی تھان
اسی خیال میں رہتی ہے عقل ڈانواں ڈول

اور اب جو زعم میں آتا کے فیل خانہ ہے — جو ہتھنی اندھی ہے اُس میں تو ہاتھی کانا ہے
نہ ٹھور چارے کا، راتب کا نے بہانہ ہے — ہر ایک بھوک سے سوئے عدم روانہ ہے
اب اُس کو خواہ وہ پائل سمجھ لیں خواہ نچھول

کرے ہے بھوک سے شاگرد پیشہ اب یہ معاش — کہیں پُلاؤ تو باورچی واں پکا دیں آش
کریں قناتوں میں دربان بیٹھے پردہ فاش — گلے سے کھینچ لے مسند کو آن کر فراش
اگر کہیں کو مِٹا اُٹھ کے چاندنی کے جھول [۲]

قلعۂ معلّیٰ اور دربار کی یہ حالت تھی جب ۱۷۵۷ء میں مجبور بادشاہ کو عماد الملک

کے ظالم ہاتھوں نے قتل کر ڈالا اور شاہجہان ثالث کو تخت پر لا بٹھایا۔ اس تبدیلی کی اطلاع پاکر احمد شاہ ابدالی پھر تیز رفتاری سے دلی پہنچا۔ یہ اُس کا پانچواں اور آخری حملہ تھا۔ اس دفعہ اُس نے شہر کو خوب تاخت و تاراج کیا اور دلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ اس حادثے کی تفصیل میر تقی میر نے "ذکرِ میر" میں دیتے ہوئے کہا ہے کہ ــــــ "منکہ فقیر بودم فقیر تر شدم" [۱] اس سلسلے میں وہ تفصیل سے لکھتے ہیں کہ:

"سات آٹھ دن تک یہ ہنگامہ رہا۔ ایک وقت کے کھانے اور ستر ڈھکنے کے وسائل بھی کسی کے گھر میں نہ رہے۔ مردوں کے سر ننگے تھے اور عورتوں کے پاس اوڑھنی بھی نہ تھی۔ چونکہ راستے بند تھے بہت لوگ زخم کھا کھا کر مر گئے، کچھ سردی کی شدت سے اکڑ گئے (اس فوج نے) بڑی بے حیائی سے لوٹ مچائی اور شہریوں کو بے آبرو کیا۔ غلہ زبردستی چھینتے اور مفلسوں کے ہاتھ دھونس سے فروخت کرتے۔ ان غارت گروں کا شور و ہنگامہ ساتویں آسمان تک پہنچ رہا تھا مگر بادشاہ جو خود کو فقیر سمجھتا تھا، استغراق کے باعث سنتا ہی نہ تھا۔ ہزاروں خانہ خراب اس ہنگامے سے نکل کر بعد حسرت ترکِ وطن کر گئے اور جنگل کی طرف منہ اٹھا کر چل دیئے مگر راستے ہی میں مر گئے۔ بہت سے مجبوروں کو وہ ظالم قید کر کے اپنے لشکر میں لے گئے۔ چونکہ ان جفا کاروں کی بن آئی تھی، لوٹتے کھسوٹتے، ایذائیں دیتے، ستم ڈھاتے، عورتوں کی بے حرمتی کرتے، اُپی تلواریں لئے مال بٹورتے پھرتے تھے۔ شہریوں سے کچھ نہ ہو سکتا تھا کیونکہ اُن میں قوتِ مدافعت نہیں تھی۔ کوئی سراسیمہ و مضطرب تھا۔ کوئی حسرت اور افسوس کرتا تھا، ہر گھر میں، ہر گلی کوچے میں، ہر بازار میں یہ غارت گر تھے اور ان کی داروگیر۔ ہر طرف خوں ریزی۔ ہر سمت ظلم و ستم، ایذا بھی دیتے اور طمانچے (بھی) مارتے۔ عزیب لوگ خوف سے سہمے جاتے اور یہ لٹیرے ملندریاں مارتے پھر رہے تھے۔ گھر جل گئے۔ محلے ویران ہو گئے۔ سیکڑوں لوگ ان سختیوں کی تاب

نہ لاکر چل بسے اور کسی کی فریاد سننے والا کوئی نہ تھا۔ ایک عالم اُن کے ستم سے ہلاک ہو گیا مگر کسی کو دَم مارنے کی مجال نہ تھی۔ پُرانے شہر کا علاقہ جسے ارونق وشادابی کے باعث، جہانِ تازہ کہتے تھے، کسی گری ہوئی منقش دیوار کی مانند تھا۔ یعنی جہاں تک نظر جاتی تھی مقتولوں کے سر، ہاتھ، پاؤں اور سینے ہی نظر آتے تھے۔ ان مظلوموں کے گھر ایسے جل رہے تھے کہ آتش کدے کی یاد تازہ ہو رہی تھی۔ یعنی جہاں تک آنکھ دیکھ سکتی تھی خاکِ سیاہ کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ جو مظلوم مرگیا (وہ گویا) آرام پا گیا، (اور) جو اُن کی زد میں آگیا بچ کے نہ جا سکا" [۱]

اس طرح کے پے درپے حادثات جس شہر پر مدت تک گزرتے رہے ہوں اگر اُس کے شاعر اپنے معاشرے کی تباہی پر خون کے آنسو بہائیں تو اس پر تعجب نہیں ہوگا۔ دلّی کی اس تباہی پر تمام حساس شعراء نے ماتم کیا ہے چنانچہ جعفر علی حسرت فرماتے ہیں ؎

نہیں ہے مرثیہ سے کم جہان آباد کا حال — اگر لکھوں تو قلم نالہ زن ہونے کی مثال
وگر پڑھوں تو کہاں غم سے ہے سخن کی مجال — اگرچہ چرخِ ستمگر یہ اُس پہ لایا زوال
پر آپ روو ے ہے رکھ منھ پہ ابر سے رُومال

کیا غنیم کے لشکر نے یوں اُسے ویراں — کہ جیسے بادِ خزاں سے ہو حالتِ بُستاں
نہ سیلِ حادثہ لاوے کسی پہ یُوں طوفاں — گزر گیا ستم افغاں کے ظلم سے جو وہاں
فغاں کہ ہو گیا یہ کشتِ سبز سب پامال

وہ باغ جس میں کہ گُل رُو تھے سب جُسیں گُل سے — اور اُن کی زُلفیں فزوں تر تھیں جعدِ سُنبل سے
چمن کے رشک تھے رُخسار خطّ و کاکُل سے — دراز اُس پہ ہو دستِ ستم تطاول سے
دریغ مٹ گیا نقشہ رہا نہ وہ خط و خال

رہے نہ آئینہ خانے نہ دیکھنے والے
پڑے ہیں آبلے پاؤں میں سینوں میں چھالے

نہیں وہ مست وہ شیشے وہ جام وہ پیالے
جو دل تھے شیشہ صفت توڑ چرخ نے ڈالے

پڑے ہیں خاک میں نکلیں جو کیجئے غربال [۱]

دِلّی کے اس سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی اور اخلاقی زوال کی داستان طویل ہے۔ ہندوستان کی تاریخ ان اذکار سے بھری پڑی ہے۔ شعراء کے دواوین اور کلیات بھی ان حادثات کی تفصیل سے خالی نہیں۔ شہر آشوب کی شکل میں جو نظمیں ملتی ہیں اُن میں خلوص کی وجہ سے بڑی دلسوزی آگئی ہے۔ اس نوعیت کی نظموں کو اگر تاریخ تصنیف کے لحاظ سے ترتیب دے دیا جائے تو یہ نظمیں بھی دِلّی کی تباہی کی ایک مسلسل تاریخ بن سکتی ہیں۔ ہم خاتمۂ کلام کے طور پر مصحفی کے ایک قصیدے کا انتخاب یہاں اور پیش کرتے ہیں جو اُس زمانے کے انتشار پر مزید روشنی ڈالتا ہے ؎

کہتی ہے اُسے خلقِ خدا سب شہِ عالم
شاہی جو کچھ اُس کی ہے وہ عالم پہ عیاں ہے

اطراف میں دلّی کے یہ لٹھ ماروں کا ہے شور
جو آوے ہے باہر سے وہ بشکستہ دہاں ہے

اور پڑتے ہیں راتوں کو جو نت شہر میں ڈاکے
باشندہ جو واں کا ہے بفریاد و فغاں ہے

اس شہر کا جس دن سے ہوا سیندھیا حاکم
چوروں کی وہاں سیندھ سے ہر اک نگراں ہے

اُترے ہیں وہاں پگڑیاں بس شام کے ہوتے
چالاکیِ دست ایسی یہ اندھیر کہاں ہے

بیداد سے نائب کی یہ احوال ہے واں کا
ہر روز نیا قافلہ پورب کو رواں ہے

اس شہر کے باشندوں سے جاکر کوئی پوچھے
جز خونِ جگر کچھ بھی غذائے دلِ وجاں ہے

بازار نشیں تھا جو کوئی صاحبِ حرفہ
اس شہر میں، سو اُس کو کہوں کیا وہ کہاں ہے

اے مصحفی اس کا کروں مذکور کہاں تک

ہے صاف تو یہ گلشنِ دہلی پہ خزاں ہے [۲]

سید انشاء اللہ خاں انشاؔ نے بھی دِلّی کو خیرباد کہہ کر جب دوبارہ لکھنؤ کا رُخ کیا اور

الماس علی خاں کے حضور میں قصیدہ پڑھا تو شہنشاہِ ہند کے افلاس کی طرف اِس طرح اشارہ کیا ہے

وقت آنست کہ از گرسنگی جاں بدہد　　بادشہ زادہ کہ اولادِ تمر خاں باشد

غرض دِلّی اور دربارِ دلّی کی یہ حالت تھی جب فیض آباد سے شجاع الدولہ کے استحکامِ حکومت، داد و دہش اور انعام و اکرام کا شہرہ بلند ہوا اور ایک دُنیا اُدھر کھنچ کر چلی گئی۔ اَودھ پہنچنے والوں میں زیادہ تعداد شاہجہان آباد ہی کے بے خانماں گھرانوں کی تھی جنہوں نے تقریباً نصف صدی سے امن و آسائش کی صورت نہیں دیکھی تھی۔



رومی دروازہ (عقبی منظر) و جلو خانہ ۔ لکھنؤ

بابِ دوم

حکومتِ اودھ کا قیام، عروج اور زوال

مغلیہ عہد میں ہندوستان اور ایران کے تعلقات بہت دوستانہ تھے اور ظہیرالدین بابر اور شاہ اسمٰعیل صفوی کے باہم خوشگوار تعلقات ہی کا نتیجہ تھا کہ ہمایوں نے شیرشاہ کے خلاف شاہ طہماسپ سے فوجی امداد طلب کی تھی۔ اکبر کے عہد میں بھی شاہ عباسِ اعظم کی طرف سے تحفے تحائف آتے رہتے تھے اور یہ سلسلہ جہانگیر اور شاہجہاں کے عہد تک برابر جاری رہا۔ یہاں تک کہ بہت سے ایرانی شعراء، مصوّر اور اُمراء ہندوستان آکر مغلیہ دربار سے وابستہ ہو گئے۔ اورنگ زیب کے زمانے میں بھی یہ سلسلہ کسی نہ کسی حد تک قائم رہا۔

ایرانی اپنی شائستگی، علم و فضل اور ذہانت کے لئے بہت مشہور تھے۔ وہ مالگذاری اور دفتری کاروبار کے ماہر تھے [۱] اس لئے ہندوستان کے دربار میں اُنہیں وزیرالسلطنت اور بخشی الملک کے دفاتر میں بہت جلد جگہ مل جاتی تھی۔ ان میں سے بعض لوگوں کو شاہی مطبخ اور شاہی حرم کے انتظامات بھی سپرد ہو جاتے تھے۔ ان ایرانی نو واردوں میں ایک شخص سیّد محمد امین نیشاپوری بھی تھے جو ۱۷۰۸ء/۱۱۲۰ھ میں ہندوستان آئے۔ یہ پہلے سربلند خان کے میر منزل ہو گئے اور بعد میں قطب الملک کے توسط سے ان کو ایسا عروج حاصل ہوا کہ پہلے شہزادوں کی جاگیر کا ٹھیکہ ملا پھر سعادت خاں کے خطاب اور ہنڈون اور

بیانہ کی فوجداری سے سرفراز ہوئے ۔ اس کے بعد انہوں نے ایک اور کروٹ لی اور ۱۷۲۰ء میں اپنے مربی قطب الملک کے خلاف تحریک سازش میں شریک ہو گئے اور بیانہ کے مقام پر قطب الملک کے بھائی امیر الامراء سید حسین علی کو قتل کرادیا۔ جب اس حادثے کے دوسرے دن بادشاہ نے ایک عارضی دربار منعقد کرکے سادات کے قاتلوں کو انعامات تقسیم کئے تو سعادت خان کو پانچ ہزار سواروں کا منصب مل گیا۔ پھر جب وزیر السلطنت محمد امین کا انتقال ہوا تو انہیں بادشاہ نے آگرہ کی گورنری دے دی، اس کے کم و بیش دو سال بعد سعادت خاں برہان الملک کو آگرہ کے علاوہ اودھ کی صوبہ داری بھی عنایت ہو گئی لیکن کچھ عرصے بعد وہ صرف اَوَدھ کے صوبہ دار رہ گئے۔

اس وقت اَوَدھ کا صُوبہ پانچ سرکاروں (یعنی اَوَدھ، گورکھپور، بہرائچ، لکھنؤ اور خیر آباد) پر مشتمل تھا، اس کی آمدنی ستر لاکھ کے قریب تھی جو بعد میں سعادت خان کے حُسنِ انتظام سے دُو کروڑ سالانہ تک پہنچ گئی ۔ جب برہان الملک (سعادت خاں) نے اس کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیا تو تمام ملک میں نیم آزاد جاگیرداری کا طریقہ رائج تھا۔ بہت سے بڑے چھوٹے زمینداروں نے دُور اُفتادہ دیہات میں اپنی گڑھیاں بنا رکھی تھیں جہاں وہ حسبِ حیثیت اپنی حفاظت کے لئے بندوقیں اور بہت سے سپاہی پیادے جمع رکھتے تھے۔ یہ زمیندار کبھی کبھی ایک دُوسرے سے بھی لڑتے رہتے تھے لیکن شاہی حُکّام کے مقابلے میں اکثر ایک ہو جایا کرتے تھے۔

جب برہان الملک اس صُوبے میں داخل ہوئے تو اُنہیں سب سے پہلے لکھنؤ کے شورہ پُشت اُمراء کو زیر کرنا تھا اور اس کے بعد مضافات میں بیسواڑہ، بلرام پور، تلوئی، پرتاب گڑھ، گونڈہ اور رسول پور وغیرہ کے سرکش زمینداروں کو فرماں بردار بنانا تھا۔ اُنہوں نے پہلے لکھنؤ پر توجہ دی۔ یہاں اکبر کے عہد سے شیخ عبدالرحیم بجنوری کی نسل آباد چلی آرہی تھی۔ ان شیخ زادوں نے لکھنؤ میں پانچ محل بنا رکھے تھے جن کو "پنچ محلہ"

کہتے تھے۔ اس وقت لکھنؤ کا شہر اور اُس کے مضافات انہیں شیخ زادوں کی ملکیت تھے اور ان کے حدود میں ان کی مرضی کے بغیر داخل ہونا بھی خطرے سے خالی نہ تھا۔ جب برہان الملک صوبہ دار مقرر ہو کر لکھنؤ کے لئے روانہ ہوئے تو فرخ آباد کے بنگش نواب نے انہیں صورت حال سے آگاہ کر دیا تھا۔ اُنہوں نے گومتی کے پار قیام کر کے بڑی حکمت عملی سے قلعہ مچھی بھون حاصل کر لیا اور اُس کے سامنے ہی نقار خانہ تعمیر کرایا۔ جس میں واجد علی شاہ کے وقت تک دن میں چھ بار نوبت بجتی تھی۔

چونکہ فتح لکھنؤ کی شہرت دُور دُور پہنچ چکی تھی اس لئے اَودھ کے اُمراء، جاگیر دار اور زمیندار ایک ایک کر کے سرِ تسلیم خم کرنے لگے اور ہر طرف سے فرماں برداری کی درخواستیں آنے لگیں۔ برہان الملک نے ان کے مقبوضہ علاقے اس وعدے پر ان کے سپرد کر دیئے کہ مالگذاری کی معینہ رقم باقاعدگی سے ادا ہوتی رہے۔ جن راجاؤں اور تعلقہ داروں نے سرتابی کی اُنہیں بالآخر زیر ہونا پڑا اور اس طرح بہت جلد تمام علاقے کا انتظام دُرست ہو گیا۔

برہان الملک نے اپنی ریاست کے دُور دراز علاقوں پر گرفت مضبوط رکھنے کے لیے اجودھیا سے چار میل کے فاصلے پر دریائے گھاگرا کے کنارے ایک بلند مقام پر اپنا بنگلہ بنا لیا تھا جس کے چاروں طرف ایک کچی دیوار کھینچ کر قلعہ کی صورت دے دی تھی۔ اس احاطے کی وسعت اور گنجائش اتنی تھی کہ متعدد سوار، پیدل، توپ خانے، اصطبل اور دوسرے دفاتر یا کارخانے اس میں آسانی سے سما سکتے تھے۔ چونکہ یہاں اُنہیں کسی خاص عمارت کے بنانے کا خیال نہ تھا اس لئے بیگمات کے قیام کے لئے بھی ایسے ہی کچے مکانات تعمیر ہوئے۔ یہ جگہ اوّل اوّل بنگلہ کے نام سے موسوم ہوئی اور پھر صفدر جنگ کے عہد میں اس کا نام فیض آباد رکھا گیا [۱] جو رفتہ رفتہ اودھ کا پہلا دار السلطنت قرار پایا۔

اَودھ کی صوبہ داری کو مستحکم دیکھ کر برہان الملک نے اپنے بھانجے مرزا مقیم کو نیشاپور سے بُلا لیا اور کچھ عرصے بعد اپنی بڑی بیٹی صدر جہاں بیگم کے ساتھ اُن کو منسوب کرکے دِلّی دربار سے اَودھ کی نائب صوبہ داری اور ابوالمنصور کا خطاب دلا دیا۔ برہان الملک نے تقریباً سترہ سال (۱۷۲۲ء تا ۱۷۳۹ء) بڑے اطمینان کے ساتھ صوبہ داری یا نیم فرماں روائی کی۔ اُن کے عہدِ دولت میں اَودھ کی فوج بائیس ہزار سوار اور پچاس توپوں پر مشتمل تھی۔ اسی سے اُنہوں نے ۱۷۳۷ء میں ملہار راؤ ہلکر کو شکست دی تھی۔

برہان الملک کا کردار متضاد خصوصیات کا حامل تھا۔ اگر ایک طرف وہ بہادر، باحوصلہ اور اعلیٰ درجے کے منتظم تھے تو دوسری طرف حصولِ اقتدار کے لالچ میں اکثر اخلاقی ذمّہ داریوں کو بھی خیرباد کہہ دیتے تھے۔ اُن کے اس کردار کا مظاہرہ سب سے پہلے اُس وقت ہوا جب اُنہوں نے محمد امین خاں تورانی کے ساتھ سازش کرکے اپنے مربّی سیّد حسین علی خاں کو قتل کرا دیا اور پھر اُن کے خاندان کے استیصال میں ایسی سرگرمی دکھائی جو دغابازی کی حد سے گزر کر نمک حرامی کے زُمرے میں آجاتی ہے۔ یہ سرگرمی ڈاکٹر سری واستو کے الفاظ میں اس توقع پر تھی کہ نظام کی تبدیلی سے جو انتشار پیدا ہوگا اُس میں وہ زیادہ سے زیادہ منفعت حاصل کر سکیں گے۔ [۱]

آصف جاہ نظام الملک کی طرح اُن کا مطمحِ نظر بھی چونکہ اپنے صوبے میں ایک آزاد سلطنت قائم کرنا تھا اس لئے اُنہوں نے اُن تمام احکام کی خلاف ورزی کی جو اُن کی مطلق العنانی کے راستے میں حائل ہو سکتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ کرنال کی جنگ میں اس توقع پر نادر شاہ سے جا ملے کہ ایسا کرنے سے اُنہیں زیادہ سے زیادہ مفاد حاصل ہو جائے گا۔ اُنہوں نے محمد شاہ کو دھوکا دے کر تاریکی میں رکھا اور فوجی تصادم نہ ہونے دیا۔ [۲]

اُنہوں نے اَودھ کو اپنی ذاتی ریاست سمجھ لیا تھا اس لئے یک سُو ہو کر اپنا تمام وقت اس کی درستی اور اصلاح پر صرف کیا اور اپنے علاقے کے تمام باغی عناصر کو مٹا کر امن و

امان قائم کر دیا۔ ڈاکٹر سریواستو نے ہمعصر مورخین کی شہادت کے پیشِ نظر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ سترھویں صدی عیسوی کے رُبعِ آخر سے اُودھ کا انتظام کسی گورنر نے برہان الملک سے بہتر نہیں کیا۔ [۱] اُنہوں نے تمام نافرمان عناصر کو اپنی فراست سے زیر کر کے اودھ کی آمدنی میں معتد بہ اضافہ کیا چنانچہ اُن کی وفات کے وقت خزانے میں کئی کروڑ روپیہ موجود تھا۔

نواب صفدر جنگ

جب سعادت خاں برہان الملک نے نادر شاہ کے حملے کے وقت دِلّی میں خودکشی کر لی تو اودھ کی صوبہ داری کے لئے دو دعویدار پیدا ہو گئے۔ ایک شیر جنگ جو برہان الملک کے بھتیجے تھے اور دوسرے ابو المنصور مرزا مقیم جو اُن کے بھانجے اور داماد تھے۔ مرزا مقیم چونکہ برہان الملک کے زمانے میں اُن کے نائب رہ چکے تھے اور مرحوم نواب کا تمام اثاثہ اُن ہی کے قبضے میں تھا اس لئے جیت اُن ہی کی رہی۔ اُن کی طرف سے برہان الملک کے وکیل لچھمی نرائن نے نادر شاہ کے حضور میں یادداشت پیش کی جس میں صفدر جنگ کے حقوق کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا کہ اگر اس التجا کو شرفِ قبول بخشا جائے تو دو کروڑ روپیہ بطورِ نذر پیش کیا جائے گا [۲] نادر شاہ نے یہ درخواست منظور کر لی اور لچھمی نرائن کے ہمراہ دو سو قزلباش سوار اودھ بھیج دیئے گئے جو چند روز بعد ایک کروڑ اسی لاکھ نقد اور کچھ قیمتی اشیاء جن میں ایک زبردست ہاتھی بھی تھا لے کر واپس آ گئے۔ اس رقم میں بائیس لاکھ روپیہ دلّی میں سعادت خان کی حویلی سے مزید شامل کر کے تمام دولت نادر شاہ کے خزانے میں جمع کر دی گئی۔ [۳] اور محمد شاہ کی طرف سے خلعتِ وزارت صفدر جنگ کو بھجوا دیا گیا۔

صفدر جنگ پندرہ سال سے اس صوبے میں نائب ناظم کا کام کر رہے تھے اس لئے وہ یہاں کے مقامی حالات اور طرزِ انتظام سے اچھی طرح واقف تھے۔ وہ فوج کی تنظیم اور آراستگی میں دل کھول کر حصّہ لیتے تھے اور بہترین اسلحہ کی فراہمی کے علاوہ سپاہیوں کے انعام و اکرام میں بھی کمی نہ کرتے تھے اس لئے بہت تھوڑے عرصے میں اُن کے پاس

بڑی اچھی فوج جمع ہوگئی۔ اُن کی فوج مشاہرے کے لحاظ سے دو حصّوں میں منقسم تھی معمولی ہندوستانی سپاہی پینتیس روپے ماہانہ سے کم نہ پاتے تھے اور ولایتی مغل یا قزلباش جو ترکی یا فارسی زبان بولتے تھے اُنہیں پچاس روپے ماہوار سے کم تنخواہ نہ ملتی تھی۔ ان میں بعض ایسے ہندوستانی بھی شامل ہوگئے تھے جو مغل انداز سے رہتے اور فارسی بول سکتے تھے۔ ان میں خصوصیت کے ساتھ کشمیر کے اثنا عشری محلہ زڈی بل کے لوگ شامل تھے۔ نواب کا یہ دستور تھا کہ فوجی معائنہ کے وقت جس سوار پر اُن کی خصوصی نظر پڑجاتی اُس کی تنخواہ میں دس روپے ماہوار اور جس پیادے پر توجہ ہوجاتی اُس کی تنخواہ میں دو روپے ماہوار اضافہ ہوجاتا تھا[۱] غرض نواب کے حُسنِ انتظام اور عدل و انصاف کی وجہ سے مُلک سرسبز ہوگیا اور فوجی قوّت مستحکم۔ اُن کی نظامت کے زمانے میں اودھ کے ایک دو جاگیرداروں نے سر اُٹھایا لیکن راجہ تلوئی اور راجہ گنگیر کی سرکوبی کے بعد کسی کو سرکشی کی ہمت نہ ہوئی اور تمام علاقے میں مستحکم امن و امان قائم ہوگیا۔

صفدر جنگ پانچ چھ سال سے نہایت انہماک کے ساتھ انتظام میں مصروف تھے کہ مارچ ۱۷۴۳ء میں محمد شاہ نے دلّی بلا کر اُنہیں میر آتش مقرر کیا اور کشمیر کی صوبہ داری بھی دے دی جہاں صفدر جنگ نے شیر جنگ کو اپنا نائب بنا کر بھیج دیا۔ اس سے اگلے سال محمد شاہ کی مرضی سے شجاع الدولہ کی شادی موتمن الدولہ اسحٰق خاں کی لڑکی سے کردی گئی۔ ۱۷۴۶ء میں عمدۃ الملک امیر خاں کے انتقال کے بعد صفدر جنگ ایرانی پارٹی کا سربراہ ہونے کی حیثیت سے دربار پر چھا گیا۔ صفدر جنگ کا قیام بحیثیتِ وزیر السلطنت تقریباً پانچ سال دِلّی میں رہا۔ وہاں اُن کے مشاغل کیا تھے، یہ سوال ہمارے موضوع سے باہر ہے۔ ہمیں تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ اُنہوں نے اودھ کی بہتری کے لئے کیا کام کیے۔ اپنی گوناگوں مصروفیات کے پیشِ نظر اُنہوں نے اودھ میں راجہ نول رائے کو اپنا نائب بنا کر چھوڑ دیا تھا اور راجہ نے انتظام بھی بہت اچھا کیا تھا لیکن فرخ آباد کے بنگش پٹھانوں کے مقابلے میں وہ مارا گیا

اور پھر صفدر جنگ کو بھی اُن کے مقابلے میں [illegible] رہنا پڑا اس لئے احمد خاں بنگش نے اپنے بیٹے محمود خاں کو اودھ پر قبضہ کرنے کے لئے روانہ کیا لیکن وہ پہلے ہی موقع پر بلگرام کا دفاع توڑنے میں ناکام رہا پھر لکھنؤ میں بھی صفدر جنگ کے ایک سردار نے فوج اور شہریوں کی مدد سے پٹھانوں کو پسپا کر دیا۔ اس کے علاوہ خود صفدر جنگ بھی مرہٹوں اور جاٹوں کو ساتھ لے کر بنگشوں کی سرکوبی کے لئے روانہ ہوئے۔ بالآخر بنگش اور روہیلے فتح گڑھ کے مقام پر شکست کھا کر کمایوں کی پہاڑیوں میں بھاگ گئے۔ صفدر جنگ اپنے عہدۂ وزارت سے علیحدہ ہو کر اودھ واپس آگئے تھے لیکن ابھی اُنہوں نے یہاں مشکل ہی سے کچھ عرصہ قیام کیا تھا کہ ۵ اکتوبر ۱۷۵۴ء کو پاپر گھاٹ کے مقام پر اُن کا انتقال ہو گیا۔

صفدر جنگ بڑے شکیل اور وجیہ آدمی تھے۔ پندرہ سال کی عمر تک اُنہوں نے ایران کی اعلیٰ درسگاہوں میں تعلیم پائی تھی اور پھر اودھ پہنچ کر درباری امور کی تربیت برہان الملک سے حاصل کی تھی جن کے زیرِ سایہ اُنہوں نے اودھ میں پندرہ سال تک نیابت کا کام انجام دیا۔ مکتوباتِ منصوری میں صفدر جنگ کے خطوط اور فرمان دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ القاب و آداب کے رسمی طرزِ تحریر کے علاوہ کسی خط میں کہیں بھی فارسی کے مروجہ تکلفات کو دخل نہیں ہے۔ اُن کی زبان سادہ اور رواں اور اُن کا طرزِ تحریر نہایت واضح اور پُر جوش ہے۔ صفدر جنگ کو ادب و شعر کا بڑا اچھا ذوق تھا۔ اُنہوں نے ایک شاعر سے اپنے دِلّی کے قیام میں "نہرِ فیض" کی تعریف سُن کر پانچ ہزار روپے نقد اور ایک عُرکی گھوڑا مع مرصّع سازو یراق عطا کیا تھا۔ اُنہوں نے بہت سے فضلاء اور علماء کی بھی قدردانی کی چنانچہ مرزا علی نقی، سیّد زین العابدین طباطبائی، ملک العلماء مولوی فضل حسین، شیخ محمد حسن، میر غلام نبی بلگرامی، سیّد محمد علی اورنگ آبادی اور شاہ باسط اُن کے دامنِ دولت سے وابستہ اور فیض یاب رہے [۱]

صفدر جنگ ایک نیک طینت مسلمان تھے اور تمام مذہبی فرائض کی پابندی نہایت خلوص سے کرتے تھے۔ اُن کی غُربا پروری کے متعلق صاحبِ عماد السعادت کا بیان ہے کہ جب کبھی

کوئی نادار انسان اُن سے سوال کرتا تو اُس کا کلام منقطع ہوتے ہی پچاس اشرفیاں اُسے دے دیتے تھے۔ یہ کوئی ایک دن کی بات نہ تھی بلکہ یہ طریقہ برابر جاری رہا۔ اُنہوں نے بہت سے نادار سیدوں کو وہ جاگیریں بھی واپس کر دی تھیں جو مقامی عاملوں نے ضبط کر لی تھیں۔ اور یہی نہیں بلکہ بہت سے مستحقین کے وظائف بھی مقرر کر دیئے تھے۔ مذہبی عصبیت اُن میں بالکل نہ پائی جاتی تھی۔ ہندوؤں تک سے اُن کا سلوک نہایت خوشگوار تھا چنانچہ اُنہوں نے راجہ نول رائے کو اپنا نائب بنا کر اودھ میں چھوڑ رکھا تھا۔ اسی طرح راجہ جینیدر گیر گوشائیں اُن کا ایک سپہ سالار تھا۔ راجہ رام نرائن دیوان تھا اور راجہ لچھمی نرائن اُن کی طرف سے دِلّی دربار میں وکیل تھا۔ وہ بلا تخصیصِ مذہب و ملّت اپنے دوستوں سے وفاداری برتتے تھے لیکن اس رواداری کے باوصف وہ سیاسی تعصب سے بالاتر نہ تھے اور اپنے مخالفین کو نیچا دکھانے، اُن کی جاگیریں ضبط کرنے اور اُن کے مناصب توڑنے کی فکر میں لگے رہتے تھے۔ اُنہیں شان و شوکت عزیز تھی چنانچہ اِسی جذبے کی تسکین کے لئے اُنہوں نے شجاع الدولہ کی شادی پر چھیالیس لاکھ روپیہ صرف کر دیا۔

شجاع الدولہ

نواب صفدر جنگ کی وفات کے بعد اُن کے صاحبزادے مرزا جلال الدین حیدر جنہیں شجاع الدولہ کے خطاب سے یاد کیا جاتا ہے، چوبیس سال کی عمر میں فیض آباد میں مسند نشین ہوئے۔ اوّل اوّل اُن کا قیام مستقل طور پر لکھنؤ میں رہا جہاں وہ زیادہ تر حرم کی دلچسپیوں، سیر و شکار کے مشغلوں اور مختلف تفریحوں میں محو رہتے تھے۔ لیکن اس سرخوشی کے زمانے میں بھی وہ سیاسی ذمّہ داریوں سے بے خبر نہ رہے۔ اُنہوں نے بنارس کے راجہ بلونت سنگھ کی بغاوت فرو کی۔ ۱۷۶۰ء میں مرہٹوں کے سردار گوند پنتھ کو چاندپور کے مقام پر شکست دی اور احمد شاہ ابدالی کے شریک ہو کر پانی پت میں مرہٹوں کی فوجی تنظیم ہمیشہ کے لئے توڑ دی۔ اس فتح کے صلے میں احمد شاہ ابدالی نے اُنہیں سلطنتِ دہلی کا وزیر مقرر کر دیا۔ اب نواب وزیر بن کر شجاع الدولہ ہندوستانی بساطِ سیاست پر ایک اہم

مہرے کی حیثیت سے آگے بڑھے۔ اُنہوں نے میر قاسم کی امداد میں انگریزوں کے خلاف فوج کشی کی لیکن عظیم آباد اور بکسر کی لڑائیوں میں شکست کھا کر بریلی اور فرخ آباد کی طرف چلے گئے اور مرہٹوں سے امداد لے کر ایک بار پھر کوڑہ جہان آباد کے مقام پر انگریزوں سے جنگ آزما ہوئے۔ دوبارہ پھر شکست کھائی جس کے نتیجے میں اوَدھ پر انگریزی فوج کا قبضہ ہو گیا لیکن شجاع الدولہ نے کوڑہ کی شکست سے پہلے ہی اپنے فرانسیسی دوست موسیو جینیل ______ (Monsieur Gentil) کو صلح کی گفتگو کے لئے جنرل کارنک (General Carnac) کے پاس بھیج دیا تھا اور اُس نے نہایت خلوص سے کوشش کر کے جنرل کو ہموار کر لیا تھا۔ کمپنی خود بھی آئندہ جنگ سے بچنا چاہتی تھی اور کسی مخالف محاذ کے قائم ہونے میں اپنا خسارہ محسوس کرتی تھی۔ اُس کے سامنے اب مزید علاقہ فتح کرنے کا سوال نہیں تھا بلکہ مفتوحہ صوبوں یعنی بنگال، بہار اور اُڑیسہ میں اپنی طاقت کو منظم اور مستحکم کرنا اُس کے پیشِ نظر تھا۔ اس لئے کمپنی ایک ایسی ریاست کی ضرورت محسوس کر رہی تھی جو انگریزوں کی دوست بن کر شمال کی طرف سے آنے والے حملہ آوروں کے خلاف دیوار کا کام دے سکے۔ اس سلسلے میں اُس کی نظر شجاع الدولہ پر تھی۔ جب تُو ماہ کی معزولی و محرومی کے بعد شجاع الدولہ نے موسیو جنیتل (Monsieur Gentil) اور شتاب رائے کے مشورے سے خود کو غیر مشروط طور پر جنرل کارنک (General Carnac) کے حوالے کر دیا تو کمپنی کو شجاع الدولہ کی ذات میں اپنے مقصد کا حصول ممکن نظر آیا اس لئے ۱۶ اگست ۱۷۶۵ء کو الٰہ آباد کا صلح نامہ مرتب ہوا جس کی رُو سے شجاع الدولہ سے پُرخلوص دوستی، دائمی امن اور مضبوط اتحاد کا معاہدہ ہوا اور یہ طے پایا کہ بیرونی حملے کی صورت میں دونوں ایک دوسرے کی امداد کریں گے۔ اس پیمان کی شرائط کے مطابق کمپنی نے اوَدھ کا تمام علاقہ شجاع الدولہ کو واپس کر دیا۔ صرف کوڑہ اور الٰہ آباد کے اضلاع اُن سے لے کر شاہ عالم کو دے دیئے۔ راجہ بلونت سنگھ والیٔ بنارس کی جاگیر اس شرط پر بحال رکھی گئی کہ وہ باقاعدہ شجاع الدولہ کو مالگذاری ادا کرتا رہے۔ شجاع الدولہ

پر کمپنی نے پچاس لاکھ تاوانِ جنگ لگایا او[illegible]ے ہوا کہ اس رقم کی ادائی تک چنار گڑھ کا قلعہ کمپنی کے قبضے میں رہے گا۔

اس صلح نامے نے اودھ کے سیاسی معاملات ہمیشہ کے لئے طے کر دیئے۔ شرائط کو دیکھ کر یہ احساس بھی نہیں ہوتا تھا کہ شجاع الدولہ اپنی حیثیت اور وقار میں کسی طرح بھی کمپنی سے کمتر ہیں لیکن بعد میں انگریزوں کے بڑھتے ہوئے مطالبات اور صلح نامے کی بعض دفعات کی تاویلوں نے انہیں رفتہ رفتہ اُس مساوات سے گرانا چاہا لیکن شجاع الدولہ نے اپنی زندگی تک ایسی حکمتِ عملی سے کام لیا کہ اُن کا وقار برابری کے درجے سے گرنے نہیں پایا۔ اُنہوں نے اپنی شکست سے زندگی کا بہت بڑا تجربہ حاصل کیا تھا اس لئے وہ اُن عناصر کی طرف سے بہت محتاط ہو گئے تھے جو اُن کی ناکامی کا سبب ہوئے تھے۔ اب اُنہیں مرہٹوں اور افغانوں کی دوستی پر بالکل اعتماد نہیں رہا تھا۔ وہ ایک طرف تو سیاسی اشتراک کا مفہوم اچھی طرح سمجھ گئے تھے اور دوسری طرف اُنہیں انگریزوں کی فوجی تنظیم، اُن کے طور طریق اور اُن کی حکمتِ عملی سے بھی پوری واقفیت ہو گئی تھی۔ اس لئے صلح نامے کے بعد شجاع الدولہ کی زندگی کا نیا باب شروع ہوا جو زیادہ محتاط، زیادہ بافراغت لیکن نہایت اہم سیاسی حکمتِ عملی کا دَور تھا۔ اس صلح کے چھ روز بعد وہ فیض آباد پہنچے۔ اُنہوں نے کمپنی سے اپنے ملک کا قبضہ لینے کے لئے پہلے پورے علاقے کا دَورہ کیا پھر مستقل طور پر فیض آباد کو دارالسلطنت بنا کر اپنی کھوئی ہوئی قوت اور مٹے ہوئے اقتدار کو دوبارہ حاصل کرنے میں منہمک ہو گئے۔ اُنہوں نے نئی فوج بھرتی کی اور اُسے بالکل یورپین انداز میں تربیت دلائی۔ بعض فرانسیسی افسر اُن کے دوست تھے جنہیں توقع تھی کہ اگر کبھی ضرورت ہوئی تو ہندوستان میں فرانسیسی مفاد کے تحفظ کے لئے شجاع الدولہ اُن کی مدد کریں گے۔ اس لئے اُنہوں نے بڑے خلوص اور محنت سے شجاع الدولہ کی فوج کو آراستہ کیا۔ بالکل انگریزی طرز پر چھاؤنیاں بنائی گئیں، توپیں، بندوقیں اور گولے ڈھالنے والی فیکٹریاں

قائم ہوئیں اور ہندوستان کے مختلف دربا(روں) میں اپنے سفارت خانے کھولے۔ شجاع الدولہ خود ہی اپنی فوج کا معائنہ کرتے خود ہی انتظامِ سلطنت کی دیکھ بھال کرنے اور اس کے علاوہ شہر اور دربار کی تعمیر میں دن رات مصروف رہتے۔ اُن کی فوجی تیاریوں کا کچھ اندازہ بارکر (Barker) (کمپنی کا کمانڈر ان چیف) کے ایک خط سے بھی ہوتا ہے جو اس نے فروری ۱۷۶۸ء میں کمپنی کو لکھا تھا۔ اس میں اطلاع دی گئی ہے کہ شجاع الدولہ نے اس عرصے میں جو فوجی ترقی کی ہے وہ تصور سے بالاتر ہے۔ اس وقت اُن کے پاس سترہ بٹالین (Battalion) تیار ہیں جن میں سے پانچ یورپ کے بنے ہوئے ہتھیاروں اور سامان سے مسلح ہیں۔ اِن کے علاوہ تیس ہزار تربیت یافتہ سوار بھی موجود ہیں۔ شجاع الدولہ نے گھوڑے خریدنے کے لئے تین لاکھ روپے گجرات بھیجے ہیں۔ اُنہوں نے احمد شاہ ابدالی کے ایک تجربہ کار افسر عمر خاں کو بھی ملازمت کی دعوت دی ہے، اور سیدی بلوچ کو پانچ ہزار بلوچ بھرتی کرنے کے لئے کہا ہے۔ ایک سکھ سردار کو بھی دو ہزار سپاہی لانے کے لئے لکھا ہے۔ [۱]

اِس فوجی تیاری سے شجاع الدولہ کا مقصد یہ تھا کہ پہلے وہ اپنے کھوئے ہوئے مقبوضات یعنی کوڑہ، الٰہ آباد اور بندھیل کھنڈ واپس لے لیں، پھر روہیل کھنڈ پر قبضہ کرکے جب قوت پوری طرح مستحکم ہو جائے تو کمپنی سے سمجھ لیں۔ لیکن شجاع الدولہ کی بڑھتی ہوئی فوجی طاقت نے بہت جلد کمپنی کو مشتبہ کر دیا۔ پھر شاہ عالم کے بعض درباریوں نے جن میں منیر الدولہ خاص طور پر سرگرم تھے اِن شکوک کو بہت ہوا دی۔ بالآخر کمپنی نے شجاع الدولہ کو مجبور کیا کہ پچھلے صلح نامے کی وضاحت کے لئے بعض فقرات تتمّے کے طور پر بڑھا دیئے جائیں۔ یہ نیا معاہدہ ۲۹ نومبر ۱۷۶۸ء میں بنارس کے مقام پر ہوا جس کے ذریعے شجاع الدولہ پر پابندی لگائی گئی کہ اُن کی باقاعدہ اور بے قاعدہ فوج کی تعداد پینتیس ہزار سے زیادہ نہیں ہونی چاہیئے۔ اس معاہدے کے بعد بھی شجاع الدولہ نے اپنی فوج میں کوئی تخفیف نہیں کی[۲]

اتنا ضرور ہوا کہ وہ اس میں کوئی نیا اضافہ نہ کرے اس لئے کم و بیش چار سال کے لئے اودھ کی فوجی ترقی رُک گئی۔ آخر شجاع الدولہ نے وارن ہیسٹنگز سے مِل کر بنارس کا معاہدہ منسوخ کرا دیا۔

پانی پت کی لڑائی کے بعد روہیلوں نے اپنے تمام مقبوضات مرہٹوں سے چھین لئے تھے لیکن جب مرہٹے نئے سرے سے منظم ہو گئے تو انہیں یہ علاقے دوبارہ واپس لینے کی فکر ہوئی چنانچہ وہ روہیل کھنڈ پر آچڑھے اور اس علاقے پر قبضہ کر لیا۔ ایسے نازک وقت میں شجاع الدولہ نے اس شرط پر روہیلوں کی امداد کا وعدہ کیا کہ اگر وہ خطرہ دُور ہو جانے پر چالیس لاکھ روپیہ ادا کرنے پر آمادہ ہوں تو شجاع الدولہ مرہٹوں سے اُن کا علاقہ خالی کرا دیں گے۔ بالآخر شجاع الدولہ کی سفارش پر مرہٹے واپس ہو گئے لیکن جب کچھ روز بعد مرہٹوں کو یہ علم ہوا کہ شجاع الدولہ نے روہیلوں سے درپردہ صلح کر کے چالیس لاکھ روپیہ طے کر لیا ہے تو وہ شجاع الدولہ سے انتقام لینے کی فکر میں مصروف ہو گئے۔ اُنہوں نے سب سے پہلے شاہ عالم کو مجبور کر کے کوڑہ اور الٰہ آباد کے اضلاع حاصل کرنے کا فرمان لیا۔ یہ اضلاع شاہ عالم الٰہ آباد سے رُخصت ہوتے وقت شجاع الدولہ کو دے آئے تھے لیکن ان پر قبضہ ابھی تک انگریزوں کا تھا۔ اس فرمان کو لے کر مرہٹے ۲؍ فروری ۱۷۷۳ء کو دوآبے میں داخل ہوئے اور ایک طرف تو اُنہوں نے روہیلوں سے تاوانِ جنگ کا مطالبہ کیا اور دوسری طرف شجاع الدولہ سے ان دونوں اضلاع کا قبضہ مانگا۔ شجاع الدولہ اس کے جواب میں کرنل بارکر (Col. Barker) اور چیمپئین (Champion) کی انگریزی فوجیں ساتھ لے کر روانہ ہوئے اور رام گھاٹ کے مقام پر اُنہوں نے مرہٹوں کو شکست دے کر بھگا دیا۔

اس جنگ میں روہیلوں نے شجاع الدولہ کا ساتھ نہیں دیا تھا اور وہ چالیس لاکھ روپے کی ادائی میں بھی ٹال مٹول کر رہے تھے۔ اس لئے شجاع الدولہ نے کمپنی سے روہیلوں کے خلاف امداد طلب کی۔ اسی اثنا میں ستمبر ۱۷۷۳ء میں ایک نئے معاہدے کی رُو سے شجاع الدولہ

نے کمپنی سے پچاس لاکھ روپے میں کوڑہ اور الہ آباد کے اضلاع کا قبضہ لے لیا اور یہ بات بھی طے کرلی کہ فوجی امداد کے زمانے میں نواب وزیر کمپنی کو فی بریگیڈ دو لاکھ دس ہزار روپے ماہانہ ادا کریں گے۔ یہ معاملات طے ہو جانے کے بعد شجاع الدولہ دوآبے سے مرہٹوں کا اثر زائل کرنے کے لئے نکلے۔ پچاس ہزار فوج اُن کے ساتھ تھی۔ وہ قنوج سے گزر کر مرہٹوں کی چوکیوں پر قبضہ کرتے ہوئے عید کے دن (۱۸ دسمبر ۱۷۷۳ء) اٹاوہ میں داخل ہوئے۔ اس مہم میں اٹاوہ، مین پوری، اور ایٹہ کے علاوہ کول اور آگرہ کے بعض علاقے بھی اُن کے قبضے میں آگئے۔ یہاں سے فراغت پانے کے بعد وہ روہیل کھنڈ کی طرف متوجہ ہوئے۔ کمپنی کا کمانڈر ان چیف چمپین (Champion) سیکنڈ بریگیڈ (Second Brigade) کو ساتھ لے کر شاہ آباد کے جنوب میں شجاع الدولہ سے آکر ملا اور پھر دونوں کی فوجیں شمال مغرب کی طرف بڑھیں۔ میران پور کٹرہ کے قریب روہیلوں سے مقابلہ ہوا اور محض دو گھنٹے کی لڑائی کے بعد تمام روہیل کھنڈ پر شجاع الدولہ کا قبضہ ہوگیا۔ شجاع الدولہ نے پندرہ لاکھ روپیہ لے کر خراج کے وعدے پر رام پور کے قرب و جوار کا علاقہ فیض اللہ خاں کو دے دیا اور باقی علاقے کو ایک نیا صوبہ بنا کر اپنے بیٹے سعادت علی خاں کو اس کا صوبہ دار مقرر کر دیا۔ شجاع الدولہ کو اس فتح کی خوشی زیادہ عرصے تک دیکھنی نصیب نہ ہوئی اور نو مہینے بعد ۲۶ جنوری ۱۷۷۵ء ۱۱۸۸ھ کو بیالیس سال کی عمر میں اُن کا انتقال ہوگیا۔

شجاع الدولہ دراز قامت، شکیل اور توانا انسان تھے۔ اُن کے اعضاء بقول الیگزینڈر ڈو (Allexander Dow) اتنے مضبوط تھے کہ تلوار کے ایک وار میں وہ بھینسے کا سر کاٹ سکتے تھے۔ اُن کی آنکھیں چمکدار اور تیز تھیں جن سے ذہانت ٹپکتی تھی اور دماغ کی آنچ کا پتا چلتا تھا۔ وہ بڑے پھُرتیلے، جذباتی اور حوصلہ مند انسان تھے۔ [۱] اُن کا جسم ایسا جامہ زیب تھا کہ ہر قسم کا کپڑا یا لباس پھب جاتا تھا۔ فرانسیسی جنرل جین لا (Jean Law) نے اُنھیں تیس سال کی عمر میں دیکھا تھا اور اُن کی شکل و صورت کے متعلق یہ رائے قائم کی تھی کہ: میں نے ہندوستان

میں اُن سے زیادہ خوبصورت آدمی نہیں دیکھا۔" [۱] اس شکل و شباہت کے ساتھ اُن کی آواز بھی دلکش تھی، گفتگو کا طریقہ بھی بہت پسندیدہ تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ بہت بامذاق انسان تھے۔ اُن کی تعلیم بہت اعلیٰ پیمانہ پر ہوئی تھی۔ فارسی زبان و ادب پر پوری قدرت رکھتے تھے۔ ترکی اور عربی کی بھی اچھی قابلیت تھی۔ وہ مرہٹی اور ہندی سے بھی واقف تھے۔ اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی بھی سمجھ لیتے تھے۔ اُن کا خط بہت پاکیزہ تھا اور فارسی میں اندازِ تحریر بھی صاف، رواں اور پُر مغز ہوتا تھا۔ اُن کی ریاضی کی استعداد ایسی تھی کہ سلطنت کے تمام حسابات کی خود ہی جانچ پڑتال کر لیتے تھے۔ ہر شخص کے ساتھ نہایت اخلاق اور ہمدردی سے پیش آتے تھے۔ اُن کے حُسنِ اطوار، گفتگو کی نرمی اور اخلاقی جھکاؤ کی جارج فورسٹر (George Forster) نے بہت تعریف کی ہے۔ اور صاحبِ معدن السعادت نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ ہر وہ شخص جو اُن سے مِل کر آتا یہی تاثر لے کر آتا تھا کہ نواب وزیر اُس کے ساتھ بہت شفقت سے پیش آئے اور دورانِ ملاقات میں سب سے زیادہ اُسی پر مہربان رہے۔ [۲]

اسمتھ (Smith) نے کمپنی سے اپنی خط و کتابت میں شجاع الدولہ کو مغرور انسان بتایا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے چھوٹوں پر شفقت کرتے تھے لیکن اپنے سیاسی حریفوں سے مِلنے میں اُن کے یہاں ایک خاص قسم کی تمکنت پائی جاتی تھی۔ اور ڈاکٹر سریواستو کے خیال میں یہی تمکنت تھی جس نے اُنہیں تباہی سے بچالیا ورنہ میر جعفر، میر قاسم اور شاہ عالم کی طرح اُن کا حشر بھی خراب ہوتا۔ وہ سیاسی مسائل میں انگریزوں سے معاملہ کرتے وقت اکثر اکڑ جاتے تھے اور اسی اکڑ کی وجہ سے کمپنی کے نمائندے اُن کی نزاکتِ طبع کا خاص خیال رکھتے تھے۔ اور اس طرح بہت سے کام حسبِ منشا طے ہو جاتے تھے۔ شجاع الدولہ نے انگریز گورنروں سے جو خط و کتابت کی ہے اُس کی ضخیم جلدیں اس بات کی شاہد ہیں کہ وہ نہایت جہاں دیدہ اور تجربہ کار ماہرِ سیاست تھے۔ سیاسی مسائل میں اُن کے تدبر، ذہانت اور مزاج کے اعتدال کا

پورا ثبوت ہمیں ان خطوط سے مِل جاتا ہے۔ وہ اپنی زندگی بھر اپنے مقاصد کی تکمیل میں سرگرم رہے اور ہر ماحول میں اُنہوں نے اپنے لئے بہتر سے بہتر صورت نکال لی۔ سیاسی میدان میں اُن کی نمایاں آرزوئیں دو تھیں ایک تو یہ کہ اُن کی برائے نام وزارت، عملی حیثیت اختیار کرلے اور دوسرے وہ اپنے کھوئے ہوئے مقبوضات اور آس پاس کے علاقوں کو فتح کر کے ایک مستحکم ریاست قائم کرلیں۔ ایک کامیاب ہیرو کی طرح اُنہوں نے اپنے مقاصد کی تکمیل اپنی زندگی ہی میں دیکھ لی۔

شجاع الدولہ کے اخلاق کی نرمی اور جھکاؤ کا سبب کسی حد تک اُن کی پسندیدگیٔ حسن میں مضمر تھا۔ عشق پیشہ انسان عام طور پر زیادہ با اخلاق ہوتے ہیں اور شجاع الدولہ کے یہاں تو ہمیں اِس ذوق کا سراغ ابتدائے شعور ہی سے ملتا ہے۔ یہ ذوق رفتہ رفتہ اتنا بڑھا کہ ہر وقت اُن کے حرم سرا میں دو ہزار کنیزیں اور نواب بہو بیگم کے علاوہ سات سو محل اور تھے۔ زن پرستی کے اس ذوق نے فیض آباد کے گلی کوچوں کو طوائفوں اور اہلِ نشاط سے بھر دیا تھا۔ وہ جب کسی مہم پر جاتے تھے تو اربابِ نشاط کے طائفے بھی اپنے ڈیروں اور خیموں کے ساتھ اُن کے ہمرکاب ہوتے تھے۔ صاحبِ عماد السعادت کا بیان ہے کہ روہیل کھنڈ کی فتح کے بعد جب نواب وزیر اپنا دربار کر کے قیام گاہ پر واپس آئے تو اُنہوں نے اپنے افسروں کو انعامات دیئے اور ہزاروں روپے اربابِ طرب میں تقسیم کئے۔ ہرچرن لکھتا ہے کہ ایک بار اُنہوں نے مینا بازار میں ایک حسین طوائف سے متاثر ہو کر پوچھا کہ کیا تم گھوڑے پر سواری کر سکتی ہو؟ اُس نے کہا ضرور، لیکن اِس شرط کے ساتھ کہ اگر میں کامیاب رہی تو آپ یہ گھوڑا مجھے بخش دیں گے۔ نواب نے شرط منظور کرلی اور لڑکی نے حسبِ دلخواہ سواری کا مظاہرہ کر کے گھوڑا حاصل کرلیا۔ غرض اس قسم کے طائفے فیض آباد کی زندگی پر اس طرح چھاگئے تھے کہ ہر تقریب میں ہزاروں عورتیں نظر آجاتی تھیں۔ ایک بار مُنیرالدولہ کی دعوت کے موقع پر جو جشن منعقد ہوا تھا اُس میں پانچ ہزار سے زیادہ اہلِ نشاط، موسیقار، اداکار اور بازی گر وغیرہ جمع تھے۔

صرف شاہد پرستی پر ہی منحصر نہ تھا بلکہ شاید ہی کوئی ایسا کھیل تماشا ہوگا جس کا نواب وزیر کو ذوق نہ ہو۔ وہ موسیقی اور رقص سے بہت دلچسپی رکھتے تھے اور اس میں اُنہیں بہت کچھ نظریاتی درک بھی حاصل تھا۔ وہ پتنگ بازی اور کبوتر بازی کا بھی شوق رکھتے تھے اور اُن کے چڑیا گھر میں ہزاروں اقسام کے کبوتر موجود تھے۔ وہ جانوروں کی لڑائی دیکھنے کے بھی شائق تھے اور اُنہوں نے مارچ ۱۷۷۱ء میں منیر الدولہ کو بھی اپنے محل کے نیچے دریائے گھاگرا کی ریتی میں ہاتھیوں کی لڑائی دکھائی تھی۔ سپاہیانہ فنون سے بھی اُنہیں خاص دلچسپی تھی۔ اُن کا نشانہ بہت اچھا تھا اور وہ شکار کھیلتے وقت، تیر، نیزہ، خنجر اور تلوار ہر چیز سے کام لے سکتے تھے۔ ایک بار وہ ایک قزلباش سوار کا بھیس بدل کر ملازمت کی تلاش کے بہانے سے مرہٹوں کے لشکر میں جا پہنچے۔ مرہٹوں نے اُن سے پوچھا کہ تم کون سا ہتھیار اچھا چلا سکتے ہو۔؟ شجاع الدولہ نے کہا نیزہ، چنانچہ امتحان کے لئے چار مرہٹے نیزے ہاتھ میں لے کر کھڑے ہوئے اور شجاع الدولہ چاروں کو بھگا کر اپنے کیمپ میں واپس آگئے۔ [۱]

شجاع الدولہ کو شکار سے خاص دلچسپی تھی۔ فیض بخش لکھتا ہے کہ وہ صرف برسات کے موسم میں فیض آباد میں قیام پذیر ہوتے تھے اور باقی دو موسم ملک کے دَورے اور شکار میں بسر کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں بعض دوسری شہادتوں سے بھی تصدیق ہوتی ہے کہ وہ سال میں سات مہینے دَورے پر رہتے اور ان میں تقریباً روزانہ انتظامی امور کے علاوہ سیر و شکار میں بھی مصروف رہتے تھے۔ صاحبِ گلزارِ شجاعی نے ان کے بعض شکاروں کا حوالہ دیا ہے۔ مثلاً ۱۷۶۹ء میں جب حسبِ دستور وہ سردیوں کے موسم میں گورکھپور کی طرف شکار کو گئے تو تین جنگلی ہاتھی زنجیروں میں جکڑ کر لے آئے۔ اس سے اگلے سال فروری ۱۷۷۰ء میں انہوں نے چودہ [۱۴] شیر مارے۔ ان میں سے ایک شیر گولی کھا کر دریا کے پار بھاگ گیا تھا، اُسے شجاع الدولہ نے تلوار سے مار لیا۔ ایک بار اُن کا ایک سفید ہاتھی مشتعل ہو گیا اور زنجیریں توڑ کر بھاگ گیا۔ شجاع الدولہ نے خود اُس کا پیچھا کیا اور ہاتھی کو رام کر کے لے آئے۔ ہرچرن ایک اور جگہ لکھتا ہے کہ نواب وزیر کشتی لڑنے

میں اپنے وقت کے بہترین پہلوان تھے اور پیراک ایسے تھے کہ بھری برسات میں جب دریائے گھاگرا طغیانی پر ہوتا تو وہ پَیر کر ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پہنچ جاتے تھے[۱]

شجاع الدولہ مذہبِ اثنا عشری کے پابند تھے اور اُس کے رسوم و فرائض پر نہایت خلوص سے کاربند رہتے تھے۔ نماز پڑھنے اور روزہ رکھنے میں اُنہوں نے ہمیشہ باقاعدگی دکھائی [۲]، فریضۂ پنجگانہ کے علاوہ وہ محرم کی رسوم بھی نہایت پابندی سے ادا کرتے تھے۔ پانی پت کی لڑائی سے کچھ مدت پہلے جب وہ احمد شاہ ابدالی کے ساتھ انوپ شہر میں خیمہ زن تھے تو عشرۂ محرم آگیا اور اُنہوں نے پورے رسومِ عزاداری ادا کئے۔ اسی طرح جب شاہ عالم، الہ آباد سے دلی کی طرف روانہ ہوئے اور اُنہوں نے نواب وزیر کو طلب کیا تو عشرۂ محرم شروع ہونے والا تھا۔ نواب وزیر نے تمام سامانِ عزا اور تعزیے وغیرہ ساتھ لئے اور سفر پر چل دیئے۔ وہ اور اُن کے ساتھی دن میں سیاہ اور سبز کپڑے پہن کر چلتے تھے اور شب میں مجالسِ عزا منعقد کرتے تھے[۳]

شجاع الدولہ کو اپنی ذمہ داریوں کا صحیح احساس تھا اس لئے وہ انتظامِ ملکی اور فوجی تربیت کی طرف سے غافل نہ تھے۔ اُنہوں نے وقت کے تقاضوں کو محسوس کرکے اپنی فوج میں بڑی نمایاں اصلاحات کی تھیں اور کئی چھاؤنیاں اور آلاتِ حرب بنانے والی فیکٹریاں یورپ کے جدید طرز پر بنوائی تھیں۔ اپنے سفارت خانے اور جاسوسی کے عملے بھی مختلف ریاستوں اور درباروں میں قائم کئے تھے۔ اکثر انگریزوں نے اُن کے فوجی انتظام اور ملکی انصرام کی بڑی ستائش کی ہے۔ چنانچہ گورنر ویرلسٹ (Verelst) لکھتا ہے کہ وہ ہر چیز کا منصوبہ خود ہی بناتے تھے، خود ہی اُس کے متعلق احکام جاری کرتے تھے، خود ہی اُس کی نگرانی کرتے تھے اور خود اُسے تکمیل تک پہنچاتے تھے [۴] اس طرح اُنہوں نے وارن ہیسٹنگز (Warren Hastings) سے جو معاہدہ ۱۷۷۳ء میں کیا تھا اُس موقع پر بھی گورنر اور نواب وزیر کی گفتگو کے درمیان کوئی مترجم موجود نہ تھا۔

اُن کی اقتصادی پالیسی بھی ایسی تھی کہ اُن کے زمانے تک اودھ کی تجارت اور صنعت و حرفت

بنگال کے غیر ملکی تاجروں سے شکست نہ کھا سکی۔ غیر ملکی سامان بغیر محصول کے اودھ میں داخل نہیں ہو سکتا تھا اور یہاں سے سونا، چاندی اور قیمتی جواہرات برآمد کرنے کی اجازت نہ تھی۔ زراعت کی وسعت اور پیداوار کی فراوانی کی کوششوں پر بھی نواب وزیر کی خاص توجہ تھی۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ تھا کہ اودھ میں ضروریاتِ زندگی کا سامان کمپنی کے مقبوضات کے مقابلہ میں بہت سستا اور افراط سے ملتا تھا [۱] مختصر یہ کہ شجاع الدولہ کے دم تک تمام ملک میں بہتات، فراغت اور خوش حالی موجود تھی جس کی وجہ سے دربار کی علمی، ادبی اور تہذیبی روایات تمام ملک میں پھیل چلی تھیں اور ادب و آرٹ کے ساتھ عیش پسندی اور درباری شان و شوکت فیض آباد کے باہر لکھنؤ، ردولی، سندیلہ، کاکوری اور بلگرام وغیرہ میں بھی عام ہو گئی تھیں۔

شجاع الدولہ کو عمارات بنانے اور باغات لگانے کا بھی بڑا شوق تھا۔ انہوں نے پانڈیچری سے ایک فرانسیسی معمار بلایا تھا جس نے اینٹوں کے ایک خوبصورت محل کا نمونہ (MODEL) بنایا تھا لیکن عمارت کی تعمیر شروع ہونے سے قبل ہی انہیں مرہٹوں کے مقابلے کے لئے جانا پڑا، اور پھر بعض وجوہ سے وہ تجویز ملتوی ہو گئی۔ اس کے کچھ زمانے بعد انہوں نے بنگال گورنمنٹ کی معرفت سوئٹزرلینڈ کے ایک انجینئر میجر پولیر (Major Polier) کی خدمات حاصل کیں، اور اس کی نگرانی میں انہوں نے برہان الملک کے کچے قلعہ کی دیواریں دوبارہ تعمیر کرائیں اور ایک محل اور دو مٹی کے قلعے بنوائے۔ تمام عمارتوں اور محلوں کو رنگین نقش کاری سے سجایا۔ قلعہ کے ایک طرف دریائے گھاگرا واقع تھا، باقی تین اطراف میں دو دو میل تک میدان چھوڑ کر چاروں طرف خندق بنوادی۔ اس میدان کے بیچ میں اُن کے رشتہ داروں، فوجی افسروں اور عملہ کے ملازموں نے مکانات اور دیوان خانے تعمیر کرا لئے تھے۔ یہاں چونکہ ہر نسل اور ہر قوم کے سپاہیوں، شہریوں، اور تاجروں کے آنے کا تانتا بندھ گیا تھا اس لئے بہت جلد یہ وسیع زمین تنگ نظر آنے لگی تھی ...... کچھ عرصہ بعد تمام شہر کے چاروں طرف ایک فصیل بنوادی گئی، جس کی چوڑائی درمیان میں دس گز اور منڈیر پر پانچ گز ہو گی۔ اس شہر پناہ

کے اُوپر سُرخ وردی میں باقاعدہ فوج اور سیاہ وردی میں بے قاعدہ فوج ، دن رات متعین رہتی تھی۔ شجاع الدولہ نے شہر کی زیبائش کے خیال سے ترپولیا اور چوک بازار بھی بنایا۔ یہ بازار قلعہ کے جنوبی دروازے سے الٰہ آباد کے ناکے (Turnpike) تک چلا گیا تھا اور اس کی چوڑائی اتنی تھی کہ دس گاڑیاں بیک وقت آسانی سے گزر سکتی تھیں [۱]

سیر و شکار کی غرض سے شجاع الدولہ نے دو زبردست رَمنے اور چار باغات بھی تیار کرائے تھے۔ ایک رَمنہ مغرب کی طرف گورجی بیگ خاں کی مسجد سے گُپتار گھاٹ تک پھیلا ہوا تھا جس کے اندر بے شمار جنگلی جانور مثلاً کالے ہرن، چیتل، بارہ سنگھے وغیرہ چھوڑے تھے۔ دوسرا رَمنہ مشرق کی طرف چھاؤنی گوشائیں سے شروع ہو کر دریا کے کنارے کنارے چھ میل تک چلا گیا تھا۔ حصارِ شہر کے اندر ہی چار باغ جرابی انداز پر لگائے گئے تھے۔ ان میں موتی باغ چوک بازار کے وسط میں واقع تھا۔ لال باغ جو رقبہ میں تمام باغوں سے بڑا تھا اپنے پھولوں کے تنوع اور خوبصورتی کی وجہ سے تمام صوبہ میں مشہور تھا۔ یہ اتنا دلکش باغ تھا کہ جب شاہ عالم الٰہ آباد سے فیض آباد آئے تو اُنہوں نے اِسی باغ میں قیام کیا۔ ان باغوں کے علاوہ آصف باغ اور بلند باغ، لکھنؤ کی سمت حصارِ شہر کے اندر ہی تھے۔ انگوری باغ، محل میں واقع تھا اور اس میں قلعہ کا ایک چوتھائی حصہ آگیا تھا۔ اِن باغات کی دیکھ بھال کے لئے ایک ہزار مالی ملازم تھے۔ [۲]

شجاع الدولہ کے استحکامِ قوت کی شہرت کے ساتھ ساتھ شہر کی آبادی میں اضافہ بھی ہوتا جا رہا تھا اور سامانِ تجارت بڑی کثرت اور بہت تنوع کے ساتھ بازاروں میں موجود رہتا تھا۔ جب مُلکی استحکام کا شہرہ نزدیک و دُور پہنچا تو اطراف و جوانب سے ہزارہا خاندان فیض آباد آ آکر جمع ہونے لگے۔ شہر کے عروج کا پانچواں سال تھا جب تاریخِ فرح بخش کا مؤلف ۱۷۶۹ء / ۱۱۸۳ھ میں فیض آباد پہنچا۔ وہ لکھتا ہے کہ مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میں اپنے وطن سے پہلی مرتبہ ممتاز نگر پہنچا جو شہر کے مغربی دروازے سے چار میل کے فاصلے پر ہے، تو یہاں

ایک بازار لگا ہوا تھا، اور خرید وفروخت کی گرم بازاری تھی۔ انواع و اقسام کے پکوان مٹھائیاں، شربت، کباب، پراٹھے، بھنا ہوا گوشت، پانی کے بتاشے، فالودہ، اور نان خطائیاں وغیرہ نظر آتی تھیں اور مسافر خریدنے میں سبقت کرنے کی وجہ سے ایک دوسرے پر گرے پڑتے تھے۔ یہ ہنگامہ دیکھ کر میں نے خیال کیا کہ ضرور چوک بازار یہی ہے لیکن مجھے کسی نے بتایا کہ ابھی تو میں شہر پناہ کے دروازے میں بھی داخل نہیں ہوا۔ بالآخر جب میں شہر میں پہنچا تو میں نے ہر طرف ناچنے اور گانے والے طائفے دیکھے جنہیں دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ صبح سے شام تک اور غروبِ آفتاب سے طلوعِ سحر تک فوجوں کے ڈھول اور باجوں کی آوازیں برابر چلی آتی تھیں۔ گھڑیالوں کی صداؤں اور نوبت کی آوازوں سے کان بہرے ہوئے جاتے تھے۔ گھوڑے، ہاتھی، اونٹ، خچر، شکاری کتے، بیل اور بیل گاڑیاں اور توپیں لے جانے والی گاڑیاں شمار سے باہر تھیں۔ لباسِ فاخرہ پہنے ہوئے، شرفائے دہلی کے نوجوان رشتہ دار، اطبا، ہر ملک کے گانے بجانے اور ناچنے والے مرد وزن، سب بڑی بڑی تنخواہوں پر ملازم تھے، اور ہر چھوٹے بڑے کی جیبیں سونے چاندی سے بھری ہوئی تھیں۔ مفلسی اور فلاکت کا کسی کو وہم بھی نہ تھا۔ نواب وزیر شہر کی آبادی اور رونق پر خاص طور پر متوجہ تھے، اس لئے محسوس ہوتا تھا کہ فیض آباد بہت جلد دلی سے ہمسری کا دعوےٰ کرے گا۔ [۱] اور چونکہ ہندوستان کا کوئی حکمران بھی شجاع الدولہ کی طرح شان و شوکت سے نہیں رہتا تھا علاوہ ازیں یہاں پہنچ کر لوگوں کو دولت و مراتب ہر گلی کوچے میں بکھرے نظر آتے تھے اس لئے علماء اور اہلِ حرفت، ڈھاکہ، بنگال، گجرات، مالوہ، حیدر آباد، شاہجہاں آباد، لاہور، پشاور، کابل، کشمیر اور ملتان سے آ آکر یہاں جمع ہو گئے تھے۔ اگر نواب وزیر دس بارہ سال اور زندہ رہتے تو یہاں دوسرا شاہجہاں آباد (دلی) وجود میں آجاتا۔ محض نو سال کے اندر، جب کہ اُنہیں ہر سال صرف برسات کے چند مہینے رہنے کا موقع یہاں ملتا تھا، یہ گنجان شہر آباد ہو گیا۔ اور یہاں ایک کثیر آبادی اُن کے سائے میں امن و آسائش

سے زندگی گزارنے لگی۔ شجاع الدولہ چونکہ فطرۃً عورتوں کی صحبت پسند کرتے تھے اس لئے بازاری عورتیں اور ناچنے گانے والے طائفے اس کثرت سے جمع ہو گئے تھے کہ کوئی گلی کوچہ یا محلہ اُن سے خالی نہ تھا۔ طوائفیں اس قدر خوش حال تھیں کہ اکثر دو دو، تین تین خیمے رکھتی تھیں اور سفر کے وقت نواب وزیر کے خیموں کے ساتھ اُن کے ڈیرے بھی پہلے سے بھیج دیئے جاتے تھے۔ ان عورتوں میں سے ہر ایک کے پاس دس بارہ مسلح سپاہی بھی ہوتے تھے۔ [۱]

آصف الدولہ

شجاع الدولہ کے بعد اُن کے بڑے بیٹے آصف الدولہ مسندنشینِ وزارت ہوئے۔ اُن کی تخت نشینی گویا اودھ کی سیاسی قوت ٹوٹ جانے اور انگریزی عمل دخل بڑھ جانے کا پیش خیمہ تھی۔ آصف الدولہ اپنے قدوقامت، فکرودماغ، اور کردار کے لحاظ سے کمزور آدمی تھے۔ نہ اُن کی تعلیم اچھی ہوئی تھی اور نہ اُنہیں انتظامِ ملکی کا سلیقہ تھا۔ اُن کے برخلاف اُن کے دُوسرے بھائی مرزا سعادت علی خاں، خیرآباد کے ناظم اور بریلی کے صوبہ دار رہ چکے تھے، لیکن ایک تو آصف الدولہ اپنے بھائیوں میں سب سے بڑے تھے، دوسرے اصلی محل کے بطن سے یہی ایک تھے، پھر شجاع الدولہ کو بہو بیگم کی خاطرداری بھی منظور تھی، اس لئے اُنہوں نے اپنی وفات سے چند روز قبل ایک خط لکھوا کر میجر پولیر (Major Polier) کی معرفت گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز (Warren Hastings) کو بھیج دیا تھا جس کی رُو سے اپنا جانشین آصف الدولہ کو تجویز کیا تھا۔ اس خط میں گورنر جنرل کو یقین دلایا تھا کہ اگر کمپنی کا رویہ ٹھیک رہا تو آصف الدولہ ہمیشہ کمپنی کا خیرخواہ اور مخلص رہے گا اور اُن کی رائے اور مشورے کے مطابق عمل کرے گا۔ یہ خط ۶ فروری ۱۷۷۵ء کو کلکتہ پہنچا لیکن انگریزوں کی نیت چونکہ شروع ہی سے خراب تھی اس لئے سُپریم کونسل (Supreme Council) نے اس خط کو کوئی وقعت نہ دی اور اُس نظریاتی مساوات کو جو اب تک اودھ اور کمپنی کے مابین موجود تھی ہمیشہ کے لئے

ختم کرکے نئی شرائط کے ساتھ آصف الدولہ کو تخت نشین کر دیا۔ ان شرائط نے نواب وزیر کو مساوی تعلقات سے گرا کر کمپنی کا محکوم بنا دیا۔ اب ایک بریگیڈ (Brigade) جبریہ نواب کی امداد کے بہانے سے اودھ میں چھوڑی گئی جس کا صرفہ چھبیس ۲۶ لاکھ روپے ماہوار نواب کے ذمے عائد ہوا [۱]

آصف الدولہ میں اتنی فراست نہیں تھی کہ وہ اپنی طویل مدتِ حکومت میں اپنے باپ کی طرح موقع پاکر کھویا ہوا وقار واپس لے سکتے، بلکہ اُن کے حدود و اختیار اور کم ہوتے جا رہے تھے۔ چنانچہ اوّل بنارس کا صوبہ اُن کے ہاتھ سے نکل گیا، پھر کمپنی نے تجارت کا مال بے روک ٹوک مُلک میں داخل ہونے کی اجازت لے لی۔ اس تباہی میں نواب وزیر کی کم ہمتی کے علاوہ اُن کے وزراء کی بدنیتی کو بھی دخل تھا۔ بدقسمتی سے اُنہوں نے ایسے لوگوں کو اپنا وزیر اور مشیر بنا لیا تھا جو اُن کے خاندان سے کوئی خلوص یا محبت نہیں رکھتے تھے، اور اُن کا جھکاؤ ہمیشہ اپنی خود غرضی کی وجہ سے کمپنی کی طرف رہتا تھا۔ شجاع الدولہ اپنے تمام منصوبے خُود ہی بناتے، خود ہی احکام صادر کرتے اور خود ہی اپنے مفاد کی نگہداشت کرتے تھے۔ اُنہوں نے کبھی اپنے وزیر یا عہدہ داروں پر بھروسہ نہیں کیا لیکن اُن کے برخلاف آصف الدولہ کے زمانے میں مختار الدولہ مرتضیٰ خاں اور حیدر بیگ خاں سلطنت کے سیاہ و سفید کے مالک تھے۔ فیض بخش لکھتا ہے کہ اگر کوئی شخص آصف الدولہ کے سامنے حاضری چاہتا تو وہ کہلا دیتے کہ مختار الدولہ (مرتضیٰ خاں) کے پاس جاؤ، اور خود دن رات بُری صحبتوں میں پڑے رہتے اور شراب کے نشے میں ذلیل مشاغل میں مبتلا رہتے [۲] وزراء عزل و نصب کے ایسے مالک بن گئے تھے کہ وہ جس کسی کو چاہتے نکال دیتے۔ چنانچہ مختار الدولہ (مرتضیٰ خاں) نے شجاع الدولہ کے تمام تجربہ کار ملازموں کو برطرف کرکے دیوان بخشی اور نظارت کے عہدوں پر اپنے آدمی بھر لیئے۔ خود نواب کے ہاتھ سے بنارس کا صوبہ کمپنی کو دلوا دیا اور حد یہ ہے کہ نواب ہی کے ہاتھوں اُن کی ماں بہو بیگم کی توقیر لُٹوا دی۔ فیض بخش نے بہو بیگم

کے لُٹنے کی پُوری تفصیل دی ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ یُوں تو صاحبزادے آئے دن ماں سے مُطالبہ کر کے کئی کئی لاکھ روپے اُڑا لے جاتے تھے لیکن پانچویں بار جو لُوٹ ہوئی اُس میں مختار الدولہ (مرتضیٰ خاں) اور صاحب رزیڈنٹ بہادر جان برسٹو (John Bristow) بھی شریک تھے۔ اس بار چوبیس [۲۴] لاکھ روپے نقد اور چھتیس [۳۶] لاکھ روپے کا سامان وصول کیا گیا جس میں زر وجواہر کے علاوہ ستر ہاتھی، آٹھ سو ساٹھ بیل گاڑیاں، ستر ہزار کا ایک پیچوان، سترہ ہزار کی طلائی زین، جواہرات جڑے ہوئے چالیس سرپوش، اور اطلس، زربفت، کمخواب اور کاشانی مخملوں کے بے شمار تھان بھی شامل تھے۔ اس کے بعد چھٹی اور آخری لُوٹ ۱۷۸۲ء / ۱۱۹۶ھ میں اُس وقت ہوئی جب حیدر بیگ خاں نائب السلطنت اور مسٹر مڈل ٹن (Middleton) رزیڈنٹ بہادر تھے۔ یہ لُوٹ گورنر جنرل کے اشارے پر ہوئی تھی۔ اس میں بہو بیگم کے دو خواجہ سراؤں یعنی جواہر علی خاں اور بہادر علی خاں کو گرفتار کر کے لکھنؤ کے مقام پر انگریزی چھاؤنی میں رکھا گیا جہاں اُن پر سخت مظالم کئے گئے اور اس طرح پچپن [۵۵] لاکھ روپے کا ساز وسامان حاصل کر لیا گیا [۱] یہ مظالم اکلوتے بیٹے نے اپنی اُس ماں پر کئے تھے جس کا دُنیا میں اُس کے علاوہ کوئی دوسرا سہارا نہ تھا۔ آصف الدولہ کے کردار کا مطالعہ کیا جائے تو شاید اِن غیر ذمہ دارانہ حرکات کی وجہ سمجھ میں آجائے۔

آصف الدولہ اپنے والد کے ہم صُورت تھے لیکن اُن کا جسم بڑا بے ڈول تھا۔ کمر سے اوپر کا حِصّہ خاصا لمبا تھا، کان، گردن اور ٹھوڑی بھاری تھے۔ انگلیاں چھوٹی اور موٹی تھیں مگر کمر کے نیچے کے اعضاء بہت چھوٹے تھے۔ اتنے چھوٹے کہ پاؤں رکاب تک نہ پہنچ سکنے کی وجہ سے گھوڑے کی سواری نہیں کر سکتے تھے۔ وہ بیٹھے ہوئے اچھے جوان معلوم ہوتے تھے۔ لیکن جب کھڑے ہوتے تھے تو اُن کا سر دُوسروں کی کمر تک بھی نہیں پہنچتا تھا۔ زیریں اعضاء کی اس معیوب بناوٹ کی وجہ سے وہ بہت سی نفسیاتی بیماریوں کا شکار ہو گئے تھے۔ بچپن ہی سے اُنہیں کمینہ خصلت لوگوں کی صحبت کی طرف رغبت تھی۔ وہ بہت بے موقع ہنستے

تھے اور گالم گلوج اُن کی عادت میں داخل تھا۔ دوسروں سے گالیاں سُننے میں بھی کوئی عار نہ آتا تھا۔ اُن کے سامنے جتنی زیادہ بے ہُودہ باتیں کی جاتیں تھیں اُتنا ہی زیادہ اُنہیں مزہ ملتا تھا۔ زمانۂ شہزادگی میں، محمد شاہی دربار کے تربیت یافتہ سیّد شرف الدین اُن کی تعلیم اور اخلاق کی اصلاح کے لئے ملازم رکھے گئے، لیکن جب کئی سال کی مسلسل کوشش کے بعد بھی کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا تو شجاع الدولہ نے خوش اطوار مصاحب اُن کے گرد جمع کر دیئے تاکہ اُن کی صحبت میں سپاہیانہ فنون، آراستگیٔ فوج کے دستور، مُلک ستانی کے آئین اور لوازمِ امارت سیکھ سکیں۔ لیکن سوا تیر اندازی اور بندوق زنی کے کسی چیز میں بھی مہارت حاصل نہ ہو سکی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عنانِ سلطنت ہاتھ میں لینے کے بعد اُمورِ ملکی کو اچھی طرح نہ چلا سکے۔ اُنہیں دوست دشمن کی بھی پہچان نہ تھی۔ جس کے دوست بنتے اُس کیلئے گھر تک لُٹا دیتے اور ایک دم کے لئے بھی اُس کے بغیر آرام نہ آتا لیکن جس سے ناراض ہوتے اُس کی شکل تک دیکھنے کے روادار نہ ہوتے۔ اُن میں جسمانی نقائص کی وجہ سے جو کبیدہ خاطری پیدا ہو گئی تھی اُس کا اخراج شروع شروع میں بے ہودہ باتیں سُن کر اور کہہ کر ہوتا تھا لیکن عمر کی پختگی کے ساتھ اُن کی نفسیاتی کمزوریاں اپنے دھارے بدلنے لگیں۔ اُنھوں نے شراب چھوڑ دی۔ بذل و سخاوت، سیر چشمی اور دریا دلی کا جذبہ بڑھا۔ مذہبی فرائض کی پابندی پر توجہ ہوئی۔ پھر تو یہ معمول ہو گیا کہ دو ساعت رہے خواب سے بیدار ہو کر پہلے قرآنِ مجید پڑھتے۔ مُلّا محمد کو ساتھ بٹھا کر سُناتے۔ اس کے بعد نمازِ صبح پڑھتے اور صحن میں خاک پر بیٹھ کر "سجدۂ شکر" اور کلمات اپنی عاجزی و غربت کے درگاہِ خداوندی میں نہایت خضوع و خشوع کے ساتھ اس طرح فرماتے کہ بارِ الٰہ میرے اعضائے رئیسہ پر جو میرا جسم پایا میں ناقص ہے تُو نے یہ رُتبہ عنایت فرمایا۔ تیرا شکر کس زبان سے ادا کروں۔ اس کے بعد پالکی یا ہاتھی پر سوار ہو کر ہوا خوری کو جاتے۔ نو بجے دربار ہوتا۔ پرچۂ اخبار ملاحظہ فرماتے [1]

آصف الدولہ نے تخت نشینی کے بعد لکھنؤ کو اپنا دار المستقر بنا لیا تھا اس لئے فیض آباد

کی ساری چہل پہل اور وہاں کے سرکاری دفاتر و کارخانے جوں کے توں لکھنؤ منتقل ہو گئے تھے۔ خود نواب وزیر کی دریا دلی کی شہرت سینکڑوں ماہرینِ فن کو ہندوستان کے گوشے گوشے سے کھینچ لائی تھی اور اب لکھنؤ میں چوٹی کے شاعروں، ادیبوں، منجموں، طبیبوں، مصوروں اور مغنیوں کے ہجوم موجود تھے۔ آصف الدولہ کی فیاضیوں کا حال ابوطالب نے اُن کے اِسراف پر تنقید کرتے ہوئے اس طرح لکھا ہے:

"پھاگن کے مہینے میں ہولی کے رسم و رواج کی ادائی کے سلسلے سے چراغاں، کھیل تماشوں، اور دوسری تقریبوں پر پانچ لاکھ روپے صرف ہوتے ہیں۔ محرم پر اس سے کم صرفہ نہیں ہوتا ہے۔ ہاتھیوں، اصطبلوں اور اونٹوں کے مصارف کا اندازہ اس سے کیجئے کہ حکومتِ اودھ نے بارہ ہزار ہاتھی اور دو تین ہزار گھوڑے اور ایک ہزار کتّے پال رکھے ہیں۔ آصف الدولہ کے کبوتر خانوں، مرغ خانوں، مینڈھوں، ہرنوں، بندروں، سانپوں، بچھوؤں اور مکڑیوں کے رکھنے کا خرچ اس قدر ہے کہ اگر اُن کا انتظام باقاعدہ کیا جائے تو شاہی محل کے اخراجات کے برابر ہوگا۔ آصف الدولہ کے یہاں تین لاکھ کبوتر اور مرغ موجود ہیں۔ بعض بعض سانپ اس قبیل کے ہیں کہ جن کا جوڑا ایک من گوشت کھاتا ہے۔ دوسرا زبردست خرچ اُن کے ملازمین کا ہے جن کی تعداد کئی ہزار ہے۔ ان میں دو ہزار فراش، سو چوبدار اور خدمت گار، چار ہزار باغبان اور سو مشعلچی ہیں۔ نواب کے مطبخ کا صرفہ دو تین ہزار روپے روزانہ ہوگا۔ ایسے بے فکرے جو سیر و شکار میں اُن کے ہمراہ رہتے اور سامانِ سفر اور خیمہ جات اُٹھا کر چلتے ہیں، تقریباً ایک ہزار ہوں گے۔ ان لوگوں کو تنخواہ نہیں ملتی۔ صرف کھانا دیا جاتا ہے۔" [۱]

اِن تمام اخراجات کے علاوہ اسّی ہزار فوج ملک میں موجود تھی جس کو براہِ راست سرکاری خزانے سے تنخواہ ملتی تھی [۲] شاہی عمارات کی تعمیر اور اُن کی آراستگی پر بھی کچھ

کم صرفہ نہیں ہوتا تھا۔ اسی زمانے میں نواب نے اپنا محل، دولت خانۂ آصفی، تعمیر کرایا تھا۔ اُس کے بعد لاکھوں روپے صرف کرکے اپنا شہرۂ آفاق امام باڑہ اور اُس کے متصل مسجدِ آصفی کی عمارت بنوائی تھی۔ یہ عاشور خانہ ۱۲۰۵ھ / ۹۱-۱۷۹۰ء میں مکمل ہوا تو اسے بیش قیمت سامان سے آراستہ کرایا گیا۔ اس کے شہ نشین میں چودہ بُرج تھے اور ہر بُرج میں چہاردہ معصومین کی ضریحیں جو نقرۂ خالص سے بنی ہوئی تھیں استادہ کی گئیں پھر ڈاکٹر بلین ——— (DR. BLANE) کی معرفت انگلستان سے دو سبز اور سُرخ بلور کے تعزیے منوائے گئے۔ ان میں سے ایک تعزیہ ۱۲۱۱ھ / ۹۷-۱۷۹۶ء میں لکھنؤ پہنچ گیا تھا اور دوسرے کے لئے آئندہ سال پہنچنے کا وعدہ کیا [۱] امام باڑے کے ساتھ ہی جلو خانہ اور رومی دروازہ تعمیر ہوا۔ جھنجھٹ کی کرھٹی، بیباپور کا محل، حسن باغ، عیش باغ اور چہار باغ بھی اسی زمانے کی یادگار ہیں [۲]

درباری زندگی کی دھوم دھام اور شان و شوکت کے اندازے کے لئے وہ تفصیل بڑی مفید ہے جو میر تقی میرؔ نے لارڈ کارنوالس کے استقبال اور ضیافت کے سلسلے میں "ذکرِ میرؔ" میں بیان کی ہے:

"ایک منزل پہلے نواب گردوں رکاب سے ملاقات ہوئی۔ وہاں سے اپنے ساتھ لکھنؤ لائے جو سلطنت کا صدر مقام ہے۔ ہر منزل پر نئی نئی ضیافت ہوتی تھی۔ نئے نئے خیمے، عجیب و غریب کھانے، ترکی و تازی گھوڑے، کوہ پیکر ہاتھی، قیمتی پوشاک اور جواہر کی کشتیاں، خوشگوار شربت، ان گنت میوے، اس علاقے کے اچھے تحفے، جنوب اور مغرب کی بنی ہوئی تلواریں، چاچی کمانیں ہر جگہ بہار دکھا رہی تھیں، جب لکھنؤ میں آئے اور محل میں اقامت فرما ہوئے تو ہر روز رنگا رنگ کے فرش فروش، جن پر اعلیٰ درجے کا کام کیا ہوا، مکان کے کونوں میں گلاب چھڑکا ہوا، نرم و ملائم بستر خواب، معطر و معنبر لباس، مخمل کے اچھوتے فرش، سیم گل کی ہوئی دیواریں، پردوں اور جھالروں سے آراستہ ایوان، عنبر کی خوشبو جسے مستی آفریں تھی سمجھتے ہوئے پیتے اور

بادام اور انگریزی چیزیں نقل کے لئے رکھی ہوئی۔ راتوں کو حسین وجمیل عورتوں کا رقص ہوتا بلکہ وہ رقاصائیں بہشت کی حوروں سے زیادہ دلکش تھیں۔ شیشے اور چینی کے گلدان سلیقے سے چُنے ہوئے تھے۔ تمام طاق تازہ میووں سے بھرے تھے۔ فرنگی رقص تھا، عجب مکان تھا، عجب ہوا تھی۔ شام کو چراغاں ہوا، آتش بازی لائی گئی۔ "ستارہ" اور "ہوائی" آسمان تک پہنچ رہی تھی۔ چراغاں کا نظارہ دل کو لبھا رہا تھا اور مہتابی سے رات روزِ روشن کا نمونہ بن گئی تھی۔ زر بفت کا سائبان اس خوبی سے کھینچا گیا تھا کہ سورج کی نگاہوں نے اُس کا جواب نہ دیکھا ہوگا! تمام اُمراء خاطر میں لگے ہوئے، راجہ خدمت پر آمادہ، اچھے اچھے شعراء مدح خوانی کر رہے تھے۔ خوش منظر جوان تھے۔ ہر جگہ خوب سایہ پھیلا ہوا۔ پانی کے فوارے بہتے ہوئے۔ نرگس دان برابر رکھے تھے جیسے پائیں باغ آراستہ ہو۔ اور برف ایسی بہہ رہی تھی گویا پگھلی ہوئی چاندی ہے۔ طرح طرح کے خوش رنگ شربت، قسم قسم کی بنی ہوئی روٹیاں، نانِ بادام بڑی نزاکت سے بنی ہوئی، شیرمال اور باقرخانی خورشید کی مثل، نانِ جوان ایسی کہ بوڑھا کھالے تو جوان ہو جائے۔ نانِ ورقی کی تعریف کروں تو دفتر بھر جائے۔ نانِ زنجبیل کو دیکھ کر ذائقہ محظوظ ہوتا تھا۔ ہر نوع کے قلیے، دو پیازے رکھے تھے کہ تمام مہمانوں کا جی للچا رہا تھا۔ کئی قسم کے کباب دسترخوان پر حاضر تھے۔ "کبابِ گل" اپنی تازگی اور خوبی میں لاجواب، اور خوش ذائقہ "کبابِ ہندی" دل موہ لے رہا تھا۔ "کبابِ قندھاری" اپنی طرف مائل کر رہا تھا۔ "کبابِ تنگ" ایسے کہ رات کے تھکے ماندوں کو تسکین کریں۔ "کبابِ ورق" نہ جانے کس ترتیب سے تلے گئے تھے کہ طبیعتوں کو اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔ یہ سب کباب بہت ہی خوش ذائقہ اور لذیذ تھے۔ ایک ایک کھانے کی دس دس قابیں رکھی ہوئی تھیں اور ہر ایک مہمان کے سامنے طرح طرح کے پلاؤ، شوربے اور کھانے چنے گئے۔ "سُبحَانَ ذِی الجُودِ وَالکَرَام" [۱]

اسی طرح کی دھوم دھام شہزادہ وزیر علی خاں کی شادی کے موقع پر نظر آئی تھی جس کا تزک و احتشام بقول مولانا شرر، تاریخِ ارض کے تمام تکلفات سے بڑھ گیا تھا۔ برات کے جلوس میں بارہ سو ہاتھی تھے۔ دولہا جو شاہی خلعت پہنے تھا اس میں بیس لاکھ کے جواہرات ٹنکے ہوئے تھے۔ مہمانوں کے قیام کے سلسلے میں دو خیمے ایسے بنائے گئے تھے جن کی لاگت دس لاکھ روپے تھی [۱] ابو طالب کا خیال ہے کہ اُس موقع پر روشنی کے انتظام، چراغاں، اور نمود و نمائش کی دوسری چیزوں کا صرفہ اس قدر تھا کہ اُن کی تفصیل کے لئے پوری کتاب درکار ہے۔ [۲]

سید عبداللطیف شوستری نے اپنے سفرنامہ "تحفۃ العالم" میں لکھنؤ کی جو تفصیلات دی ہیں وہ بھی آصف الدولہ کے عہد کو سمجھنے میں بڑی مدد دیتی ہیں۔ ہم یہاں اُس کے کچھ حصے کا ترجمہ پیش کرتے ہیں:۔

"اگرچہ آصف الدولہ ضبطِ مملکت اور تنسیقِ امورِ حکمرانی میں جیسا چاہیئے تھا ویسے نہ تھے اور انگریزوں کی مدد سے حکمرانی کرتے تھے لیکن ذاتی سخاوت اور فطری جود و کرم میں وہ حاتمِ روزگار تھے۔ ہر وضیع و شریف پر بے حد و حساب بذل و ایثار کرتے تھے۔ ایسا کوئی شخص نہ ہوگا جو اُن کے کفِ دریا بار کی بارش سے محروم رہا ہو۔ اُن کی نظرِ ہمت کے سامنے دُنیا کے سمندر اور کانیں تنکے کی برابر تھیں اور وہ روئے زمین کے خزانوں کو برگِ گیاہ کے برابر بھی وقعت نہ دیتے تھے۔ عتباتِ عرش درجات میں اُنہوں نے زوار کے قیام کے لئے ایک اعلیٰ کارواں سرائے بنوائی تھی جس میں ہمیشہ ایک جمِ غفیر رہتا تھا۔ اور روزِ ورود سے ہر شخص کے مرتبے کے مطابق کچھ نہ کچھ مقرر ہو جاتا تھا۔ اور جب وہ واپس جاتا تھا تو جو کچھ اُس کے مقسوم میں ہوتا مل جاتا تھا۔ آصف الدولہ کے کارہائے خیر میں دریائے فرات سے نجف اشرف تک پانی کی نہر نکلوانا ایسا کام ہے جس کے لئے اُنہیں قیامت تک سندِ افتخار مل گئی ہے۔ یہ کام بڑے بڑے صاحبِ قدرت سلاطین

بھی سرانجام نہ دے سکتے تھے۔ آصف الدولہ نے فرط ولائے اثنا عشری میں اپنے مکان کے قریب ہی ایک عزاخانہ اور مسجد تعمیر کرائی اور عمارت اور اس کی تزئین پر زر کثیر صرف کیا۔ ان کی سرکار کے عملہ اور بعض ثقہ لوگوں کا بیان ہے کہ اس پر دو کروڑ سے زیادہ روپیہ صرف ہوا۔ اس تمام کشور میں ایسی شاندار، وسیع اور پُر فضا عمارت کوئی دوسری نہیں ہے۔ اس عزاخانہ اور مسجد کو میں نے دیکھا ہے۔ یہ دنیا کے نادرات میں سے ہے۔ اس کے اندر چودہ گنبد ہیں جن میں چہاردہ معصومینؑ کی خالص چاندی سے بنی ہوئی ضریحیں رکھی ہوئی ہیں۔ ایام عشرہ میں اسے سجاتے ہیں۔ چار پانچ سو بلوریں جھل چراغ اس میں لٹکائے جاتے ہیں اور دو ہزار کے قریب مجلسی "جھل چراغ" اور بلوریں فانوس جن میں کافوری شمعیں نصب ہوتی ہیں روشن کئے جاتے ہیں۔ سنہرے اور مرصع ساز و سامان کے ساتھ عزاخانہ کی تزئین ہوتی ہے۔ امام باڑے کے اندر در و دیوار میں بدن نما آئینے نصب ہیں جب ان تمام شمعوں، چراغوں، اور اسباب طلا و جواہر کا عکس آئینوں پر پڑتا ہے تو وہ تمام عزاخانہ کوہ نور بلکہ رونق شکن وادی طور بن جاتا ہے۔ عشرۂ محرم کے صرف کے لئے تین لاکھ روپیہ سرکار سے مقرر ہے۔ اگر اس سے کچھ زائد مل جاتا ہے تو وہ زواروں اور حاجت مندوں پر تقسیم کر دیا جاتا ہے۔

ان کے مکان کے ساز و سامان، وضع قطع، اور سج دھج کا اگر شمہ بھی بیان کیا جائے تو پڑھنے اور دیکھنے والوں کے اطناب و ملال کا باعث ہوگا۔ بس مختصراً یہ سمجھئے کہ ان کے کتب خانہ میں تین لاکھ منتخب کتابیں میں نے دیکھی تھیں جو نہایت پاکیزہ خط میں لکھی ہوئی تھیں۔ ہر سو کتاب پر ایک گماشتہ مقرر تھا۔ اکثر کتابوں کی میں نے بتدریج سیر کی۔ مختلف فنون و اصناف پر عربی فارسی اور انگریزی میں کتابیں تھیں۔ نظم و نثر کی کتابیں، تاریخیں اور دواوین بے شمار تھے۔ ان کے علاوہ خوشنما قطعات جو اوّلین اور آخرین خوشنویسوں کے ہاتھ کے لکھے ہوئے تھے اور ایران، ہند، روم اور فرنگ کے مصوروں کی بنائی ہوئی

تصویریں اتنی تعداد میں تھیں کہ اُن کے دیکھنے سے تمام عمر فراغت نہ مل سکے۔ علمی کتابوں میں سے بہت سی جلدیں میری نظر سے گذریں۔ میں نے دیکھا کہ شرائع، مدارک، مسالک، مفاتیح، اور کشکول میں بہت سی کتابیں اور بعض مجلّدات بحار الانوار تو خود مصنفین کے قلم سے لکھی ہوئی تھیں اس لئے میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ تخریب سلطنت کے بعد سلاطینِ تیموریہ کا کتب خانہ جس کسی کے بھی ہاتھ لگا ہو گا اُس کے خزائن اور دفائن اور سامانِ طلا و جواہر اس کتب خانہ کے عشرِ عشیر بھی نہ ہوگا۔

اس تمام سطوت و جلال کے باوصف وہ علماء، سادات، مومنین اور زوارین سے چاہے وہ کتنے ہی پست اور فرومایہ کیوں نہ ہوں مساوات کا سلوک کرتے ہیں اور اُنہیں اپنے پاس بٹھاتے ہیں، تعصبِ مذہبی میں بھی وہ غلوے عظیم کرتے ہیں، مجھے لکھنؤ میں وارد ہوئے تیسرا دن تھا کہ نواب نے طلب فرمایا۔ میں اُن کے پاس پہنچا تو نہایت ملاطفت سے پیش آئے۔ عوارضِ جسمانی کے متعلق دریافت کرکے اپنے درباری اطبا کو طلب فرمایا اور معالجہ کے متعلق ہدایت کی۔ پھر اپنے اُمراء کو حکم دیا کہ ہر روز سرکاری باغات میں سے ایک ایک کی مجھے سیر کرائیں۔ چار سَو عماراتِ مفروش اور باغاتِ مشجّر شہر اور بیرونِ شہر میں واقع تھے جن میں ہر ایک اپنے اپنے موقع پر بے نظیر تھا فرنگی فلاح اور چینی باغبان ان پر متعین تھے جو چمن بندی، خیابانوں کی طراحی اور درختوں کی پیوند سازی میں ماہر تھے۔ ان میں سے ہر ایک ان قطعات کو رشکِ روضۂ رضوان اور حسرت افزائے نو بہارِ اصفہان بنائے رکھتا تھا۔ میں نے ان باغوں میں سے عیش باغ میں ایسے درخت دیکھے ہیں جن کی نسل ایک یا دو ذرع دست سے زیادہ نہ تھی لیکن وہ پھر بھی میووں سے لدے ہوئے تھے، اسی طرح گلاب کی ایک قسم دیکھی جو چاروں فصلوں میں برابر پھول دیتی تھی صرف یہ تھا کہ اپنے موسم پر زیادہ اور غیر موسم میں قدرے کم۔ [1]

اِس تزک و احتشام کے ساتھ اُن کی سخاوت بھی ہندوستان میں ضرب المثل ہو گئی تھی۔ اُن کی فیاضی کی عجیب و غریب حکایتیں مشہور ہیں مثلاً ایک مرتبہ لاکھ دانوں کی تسبیح سادہ دِل بن کر ایک بڑھیا سے ایک لاکھ روپے میں خرید لی۔ کسی اور موقع پر ایک ضعیفہ کو اُس کے اس گمان پر کہ وہ کچے لوہے کی تلوار کو پارس سمجھتی تھی اُس تلوار کے ہموزن سونا دلا دیا۔ غربا کی پرورش اور اہلِ کمال کی قدر دانی کی نئی نئی تجویزیں نکالا کرتے تھے اور داد و دہش کو بمنزلۂ ضروریاتِ زندگی سمجھتے تھے [۱] انعام و اکرام کی یہ فراوانی ممکن ہے اُن کی سیاسی بے اختیاری کے ردِّ عمل کے طور پر ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ اِن واقعات کی کثرت نے اُن کی سیر چشمی اور دریا دلی کو افسانوی رنگ دے کر پیش کیا اور بقولِ شرر عوام کو نواب کی صورت میں ایک عیش پرست فرماں روا نہیں بلکہ ایک بے نفس اور درویش صفت ولی نظر آنے لگا۔ ہندوؤں کا مذہبی کو آنکھ کھلتے ہی جوشِ عقیدت میں "یا آصف الدولہ وَلی!" کہنے لگے [۲]

آصف الدولہ کی داد و دہش کا مُلک اور بیرونِ مُلک میں ایسا چرچا ہوا کہ جسے سُن کر گوشے گوشے سے ماہرینِ فن دربارِ اودھ میں سمٹ آئے اور کثرتِ تعداد کی وجہ سے لکھنؤ کی آبادی اس قدر بڑھی کہ اُس زمانے میں رکاب گنج، امانی گنج، دولت گنج، نواب گنج، فتح گنج، ٹکیٹ گنج، ترمنی گنج، بانک گنج، حسن گنج، بھوانی گنج، محبوب گنج، خدا گنج، عنبر گنج، تحسین گنج، نواز گنج، خیالی گنج، وزیر گنج، جھاؤلال کا پُل، توپ دروازہ، حسین الدین خاں کی چھاؤنی، صورت سنگھ کا احاطہ، کشمیری محلہ، انگریا اور نخاس وغیرہ بہت سے محلے آباد ہو گئے۔ [۳]

اس تمام فراغت و آسائش کے باوجود آصف الدولہ کو اپنی سیاسی بے بسی اور انگریز برتری کا شدید احساس تھا۔ اُنہوں نے کئی بار سلطنت سے دستبردار ہونے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ انگریز شاطر ذرا ذرا سی سہولت بہم پہنچانے کے لئے ریاست کا سودا کرتے تھے مثلاً سعادت علی خان کو بریلی کی صوبہ داری سے واپس بلانے کے انعام میں بنارس لے لیا۔ آصف الدولہ نے اپنے دربار کے اندر بھی انگریز پرست لوگوں کا اثر دیکھ کر حیدر بیگ نائب اور ٹکیٹ رائے

دیوان کو برطرف کر دیا لیکن رزیڈنٹ نے نواب پر زور ڈالا کہ وہ اُنہیں واپس لے لیں آصف الدولہ نے قسم کھا کر عہد کیا کہ چاہے سلطنت رہے یا ہاتھ سے جائے میں انہیں واپس نہیں لوں گا بالآخر اُنہوں نے رزیڈنٹ کی سفارش پر علاّمہ تفضّل حسین خان کو اپنی نیابت تفویض کرنی قبول کر لی حالانکہ اُن کا میلانِ طبع بھی انگریزوں ہی کی طرف تھا۔ نواب کو اپنے ایک درباری راجہ جھاؤ لال کے برطرف ہو کر عظیم آباد بھیج دیئے جانے کا بھی بڑا ملال تھا۔ مختصر یہ کہ وہ اپنی بے بسی کا شدید احساس رکھتے تھے اسی وجہ سے اُنہوں نے مایوس ہو کر غذا ترک کر دی تھی اور اطبّاء کے مشورے کی بھی پروا نہ کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ نقاہت بڑھی، عوارض نے زور پکڑا بالآخر اُنہوں نے ۲۸ ربیع الاوّل ۱۲۱۲ھ مطابق ۲۱ ستمبر ۱۷۹۷ء کو انتقال کیا اور اپنے نوتعمیر امامباڑے میں مدفون ہوئے۔ ایک فاضلِ عصر نے تاریخِ وفات کے سلسلے میں حسبِ ذیل اشعار تصنیف کئے تھے ؎

گلشنِ عشرت بتاراجِ خزاں رفت اے ندیم — شامہ استشمامِ حسرت مے نماید از نسیم
آصفے کایں نُہ صدف را یک دُرِ شہوار بود — آں دُرِ شہوار رفت از دست، عالم شد یتیم
لکھنؤ بے آصف است و آسماں بے آفتاب — شہرِ یوناں بے مسیح و طورِ سینا بے کلیم
وارد آصف عشرتے در صحنِ آصف باغِ خُلد — انبیا ہمدم، سلیماں ہمنشیں، آصف ندیم
نقشبندِ کاف و نوں بر تربتِ آصف نوشت — ھٰہنا رُوحٌ و ریحانٌ و جنّتُ النعیم

سعادت علی خاں

نواب آصف الدولہ نے اپنی رحلت سے کچھ زمانہ پہلے وزیر علی خاں کو ولی عہد مقرر کر دیا تھا اس لئے اُن کی وفات کے بعد رزیڈینٹ لمسڈن نے علاّمہ تفضّل حسین خاں نائب السلطنت کے مشورہ سے وزیر علی خاں کو مسند نشین کرا دیا تھا۔ اُس وقت سعادت علی خاں لکھنؤ میں موجود نہ تھے۔ جب اُنہیں وزیر علی خاں کی تخت نشینی کی اطلاع ملی تو وہ بہت پریشان ہوئے کیوں کہ وارن ہیسٹنگز نے بیس سال پہلے اُنہیں یہ یقین دلایا تھا کہ آصف الدولہ کے بعد مسندِ وزارت کے حق دار وہی ہوں گے۔ اسی

انتظار میں اُنہوں نے آصف الدولہ کی حکومت کا یہ طویل زمانہ گزارا تھا جب سوءِ اتفاق سے یہاں دوسری صورت پیدا ہو گئی تو اُنہوں نے ہاتھ پیر مارنا شروع کئے اور اپنے اُستاد علامہ تفضل حسین خاں کے ذریعہ جو اُن دِنوں اَودھ کے نائب تھے رزیڈینٹ کے ساتھ جوڑ توڑ شروع کئے اور خود بھی راج محل کے مقام پر پہنچ کر گورنر جنرل سے ملے۔ اس مقام پر خفیہ طور پر بعض ایسی شرائط طے ہوئیں کہ جن کے پیشِ نظر گورنر کو اُن کی مسند نشینی میں کمپنی کا بہت زیادہ مالی فائدہ نظر آیا۔ گورنر جنرل (سرجان شور) نے اسی مقصد کی تکمیل کے لئے لکھنؤ کا سفر اختیار کیا اور ایک عرضداشت تیار کرا کے حسن رضا خاں اور راجہ ٹکیت رائے کی معرفت بعض عمائدینِ شہر، درباری اُمرا اور شاہی خاندان کے بعض افراد کے دستخط حاصل کر لئے۔ اس عرضداشت میں وزیر علی خاں کو آصف الدولہ کا شرعی وارث ماننے سے انکار کیا تھا۔ یہ کاغذ مکمل ہو جانے کے بعد گورنر جنرل نے وزیر علی خان کو نظر بند کرا کے بنارس بھیج دیا اور نواب سعادت علی خاں کو اُن کے بجائے تخت نشین کر دیا۔

سعادت علی خاں خرد محل کے بطن سے تھے۔ بچپن ہی سے زیرکی اور دانائی کے آثار اُن میں پائے جاتے تھے۔ اس لئے نواب شجاع الدولہ نے اُنہیں بارہ سال کی عمر ہی میں خیرآباد سرکار کا فوجدار مقرر کر دیا تھا۔ پھر کچھ زمانے بعد وہ اُنہیں اپنا نمائندہ بنا کر شاہ عالم کے دربار میں الٰہ آباد چھوڑ آئے تھے۔ جب ۱۷۷۴ء میں روہیل کھنڈ فتح ہوا تھا تو اُنہیں بریلی کا صوبہ دار مقرر کر دیا تھا۔ یہ تقریباً چار سال نجف خاں کی رفاقت میں بھی رہے تھے جس سے انہیں میدانِ کارزار کا تجربہ بھی ہو گیا تھا اور ہنڈون اور بیانہ کا انتظام سنبھالنے کی وجہ سے اُمورِ جہاں بانی سے بھی اچھی طرح واقفیت ہو گئی تھی۔ لیکن یہ ان کی بدقسمتی تھی کہ انہیں اپنی مسند نشینی کے لئے انگریزوں سے گھاٹے پر صلح کرنی پڑی۔ اُنہوں نے باون لاکھ کے بجائے چھہتر لاکھ کمپنی کو خراج دینا قبول کر لیا تھا لیکن کمپنی اس پر بھی مطمئن نہ تھی۔ کیونکہ وہ اَودھ کے نصف علاقے کو اپنے تصرف میں لانا چاہتی تھی اس لئے گورنر جنرل نے کمپنی کے مفاد کی خاطر حسن رضا

خاں کو نائب السلطنت اور راجہ ٹکیت رائے کو دیوان ریاست مقرر کرادیا۔ یہ دونوں انگریزوں کے پٹھو بلکہ جاسوس تھے اور ان کے اسی جرم پر آصف الدولہ نے انہیں ملازمت سے برطرف کر دیا تھا۔ سعادت علی خاں کمپنی کے منصوبوں سے اچھی طرح واقف تھے اس لئے وہ ہر وقت ان دونوں کی برطرفی کی تدبیریں سوچتے رہتے تھے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ کچھ ہی زمانے بعد راجہ ٹکیٹ رائے وفات پا گئے اور اب نواب وزیر نے حسن رضا خاں کا وہ ناطقہ بند کیا کہ اُسے چھٹی کا دودھ یاد آ گیا۔

سعادت علی خاں کی مسند نشینی کو ابھی چند ماہ گزرے تھے کہ گورنر جنرل تبدیل ہو گیا اور اُس کے بجائے لارڈ ولزلی مقرر ہو کر آیا جس نے اودھ پر انگریزی اقتدار بڑھانے کے خیال سے دو کام رزیڈینٹ کے سپرد کئے۔ ایک یہ کہ نواب وزیر کی فوج رفتہ رفتہ کم کر کے انگریزی فوج اودھ میں بڑھائی جائے اور دوسرے طریقہ مالگذاری میں اہم تبدیلیاں کر دی جائیں۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے یہ صورت اختیار کی گئی کہ پنجاب کی طرف سے زمان شاہ کا اور مغرب کی طرف سے مرہٹوں کا خطرہ ظاہر کر کے نواب کو مجبور کیا کہ وہ اپنے ملک میں انگریزی فوج کی تعداد بڑھائیں۔ نواب اپنی مالی مجبوریوں کی آڑ لے کر رزیڈنٹ کا وار خالی دیتا رہا اور اس سلسلہ میں ایک بار بد دل ہو کر تخت سے دستبردار ہونے کی بھی خواہش ظاہر کی لیکن یہ تاویلیں کام نہ آ سکیں اور گورنر جنرل نے نواب کی مرضی کے خلاف اُس کے علاقے میں اتنی فوج بڑھا دی کہ نواب کے ذمہ اُس کا خرچ ایک کروڑ تیس لاکھ روپے سالانہ سے بھی بڑھ گیا۔ نواب نے ہزار فریادیں کیں لیکن ایک نہ سُنی گئی اور پھر اس جبری فوج کے صرفہ کے لئے اوَدھ کا نصف علاقہ مانگ لیا گیا۔ نواب نے بہت عذر و معذرت کی، دلائل پیش کئے، گذشتہ عہد ناموں کے حوالے دیئے لیکن کچھ پیش نہ گئی۔ رزیڈینٹ اور گورنر جنرل نے دھمکیوں سے کام لیا اور نواب کو طوعاً و کرہاً انگریزی مطالبات قبول ہی کرنے پڑے۔ چنانچہ ۱۰ر نومبر ۱۸۰۱ء کو بنارس میں نئے عہد نامے پر اُن کے دستخط کرا لئے گئے۔ اس عہد نامے کی رُو سے کمپنی نے اوَدھ کا نصف علاقہ حاصل کر لیا جس میں روہیل کھنڈ،

فرخ آباد، مین پوری، ایٹہ، اٹاوہ، کانپور، فتح گڑھ، الٰہ آباد، بستی اور گورکھپور وغیرہ اضلاع شامل تھے۔ ان علاقوں کی آمدنی ایک کروڑ پینتیس لاکھ تیس ہزار روپے سے زیادہ تھی۔ اسی عہد نامے سے یہ بھی طے پا گیا تھا کہ آیندہ کمپنی نواب سے فوجی امداد کے معاوضے میں کوئی مطالبہ نہیں کرے گی اور اُس کے بیرونی دفاع اور اندرونی انتظام کے لئے بلاصرفہ فوج رکھی جائے گی۔ یعنی نواب کو اپنے باقی نصف علاقہ پر کُلّی اختیار حاصل ہوگا جہاں وہ اپنے اہل کاروں کے ذریعہ اور کمپنی کے افسروں کے مشورے سے ایسا انتظام کریں گے جس سے رعایا کی بہبودی اور اُس کی جان و مال کی حفاظت ہو سکے گی۔ گورنر جنرل کے اس بے جا تشدد پر ایک انگریز ہی نے اس طرح طنز کیا تھا۔

"جب لارڈ ولزلی صاحب ہندوستان میں داخل ہوئے اُس وقت مُلکِ اودھ دوستی میں انگلستان سے زیادہ تھا اور انگریزوں کا سب سے زیادہ وفادار دوست تھا۔ لارڈ موصوف نے اُسی دوستی کے بدلے میں مُلکِ اودھ کا نصف حصّہ نکال کر احاطۂ بنگال میں ملحق کر لیا کیوں کہ ان کے ذہن میں اس سے بہتر کوئی صلہ و مکافات نہ معلوم ہوا کہ جس ملک کے حکمران نے اُن کے ساتھ وفاپرستی کا اظہار کیا اُس کی رعایا کو اپنی گورنمنٹ کے ماتحت کر لیں [۱]

جنوری ۱۸۰۲ء میں گورنر جنرل اپنے دورے کے لئے لکھنؤ آیا۔ نواب نے حسبِ دستور کانپور تک اُس کا استقبال کیا۔ اس دورے کے زمانے میں ایک اور کاغذ بصورتِ استفسار و جواب مکمل ہوا جس سے معاہدے کی بعض دفعات کی وضاحت کی گئی تھی۔ اس کی تکمیل کے بعد یہ محسوس کیا جانے لگا تھا کہ شاید اب کمپنی اور نواب کے تعلقات میں کوئی الجھاؤ نہیں پیدا ہوگا اور نواب اپنے بقیّہ علاقے میں سیاہ و سفید کا مالک ہوگا۔ لیکن کچھ زیادہ وقت نہیں گذرا تھا کہ دربارِ اودھ کے رزیڈنٹ میجر بیلی (Baillie) نے اودھ کے انتظامی امور میں پھر مداخلت شروع کی کیوں کہ نئے صلحنامے کی دفعہ چھ میں یہ لکھا ہوا تھا کہ نواب وزیر اپنے مُلک میں کمپنی

کے افسروں کے مشورے سے انتظام کریں گے۔ بیلی (Baillie) اس فقرہ کا یہ مطلب لیتا تھا کہ حکومت کے معمولی سے معمولی اُمور بھی رزیڈینٹ کے مشورے کے بغیر طے نہیں ہونا چاہئیں۔ چنانچہ اُس نے اپنے خط مورخہ ۲/ جولائی میں نواب کو لکھا کہ آپ نے ایک ضلع مالگذاری کے لئے مستاجری پر دے دیا ہے۔ ایک دفترِ عدالت نیا قائم کیا ہے اور پولیس کے ایک شعبہ میں کچھ اصلاحات کی ہیں۔ یہ امور چاہے کتنے ہی معمولی کیوں نہ ہوں لیکن مجھے اطلاع دیئے بغیر اور میری مرضی حاصل کئے بغیر عمل میں آئے ہیں۔ ان کے لئے پہلے سے ہماری گورنمنٹ سے مشورہ کرنا ضروری تھا۔[۱] اور صرف یہی نہیں بلکہ درباریوں اور بعض سرکاری ملازموں کی جاگیر اور پنشن بھی دونوں حکومتوں کے درمیان ایک تلخ اور مسلسل اختلاف کا ذریعہ بن گئی۔ مثلاً رزیڈینٹ اور گورنر جنرل دونوں نے نواب پر زور دیا کہ علی نقی خاں اور حسین علی خاں کی جاگیر واپس کی جائے اور انہیں پنشن دی جائے [۲] اسی طرح تحسین علی خاں کی ذاتی ملکیت کے انتظام کے متعلق بھی ایسی ہی مداخلت ہوئی۔ بعض اوقات تو رزیڈینٹ کی مداخلت اس درجہ بڑھ جاتی تھی کہ خود اپنی حدودِ ریاست ہی میں نواب کے وقار کو صدمہ پہنچتا تھا۔

مختصر یہ کہ سعادت علی خاں کی تمام مدتِ حکومت ایسے ہی ذہنی خلفشار میں گذری۔ بالآخر نئے گورنر جنرل لارڈ ہیسٹنگز نے آکر انہیں اُس کوفت سے نجات دلائی اور ۳۱ / دسمبر ۱۸۱۳ء کو برطانیہ کی پالیسی تبدیل کر کے نواب کی ہمت افزائی کی اور یہ فیصلہ صادر فرمایا کہ جب ہم نے اپنے فائدے کے لئے نواب وزیر کا نصف ملک لے لیا ہے تو عہد نامہ کی چھٹی دفعہ کے مفہوم پر ہمیں زیادہ سختی سے کاربند نہیں ہونا چاہیئے اور نواب کو اپنے بقیہ علاقے پر بغیر کسی مداخلت کے حکومت کرنے کا موقع دینا چاہیئے۔ اس نئی پالیسی کے تحت نواب سعادت علی خاں اپنی آزاد سلطنت کا لطف صرف چھ مہینے ہی اُٹھانے پائے تھے کہ ۱۲/ جولائی ۱۸۱۴ء مطابق ۲۴/ رجب ۱۲۲۹ھ کو اُن کا انتقال ہو گیا۔

پے در پے کئی سیاسی چوٹیں کھانے کے بعد نواب سعادت علی خاں کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔

اس لئے بنارس کے عہد نامہ کے بعد انہوں نے اپنی ریاست میں نہایت احتیاط کے ساتھ انتظام شروع کر دیا تھا۔ سلطنت کی آمدنی نصف باقی رہ جانے کی وجہ سے وہ اپنے مالی وسائل کو بڑھانے اور اخراجات کو سمیٹنے میں کوشاں رہے۔ بہت سی جاگیریں اور معافیاں جو آصف الدولہ کی بلند ہمتی کی وجہ سے بعض غیر مستحقین کو مل گئی تھیں وہ واپس لے لی گئیں۔ حساب کی جانچ پڑتال پر خود توجہ کی۔ ملک کی حالت سے باخبر رہنے کے لئے اخبار نویسی کے محکمے کو خاص اہمیت دی جس کے ذریعے سے ہر قصبے اور شہر کے ہر محلے کے روزانہ واقعات کی تفصیل براہِ راست نواب تک پہنچتی تھی۔ منڈی کا انتظام اور غلے کی قیمتوں کا تعین کیا۔ اس شعبے کا کام گنج بہاری لال کے سپرد ہوا۔ شہر کی ناکہ بندی کی تاکہ کوئی شخص پروانۂ راہداری حاصل کئے بغیر اور اپنے سامان کا معائنہ کرائے بغیر لکھنؤ سے باہر نہ جا سکے۔ سررشتۂ عدالت کو تین شعبوں میں تقسیم کر کے فوجداری کے معاملات کوتوالی شہر سے متعلق کر دیئے۔ عدالتِ دیوانی کے کاروبار بعض مولویوں کو دے دیئے اور عدالتِ مرافعہ کا کام خود سنبھال لیا۔ مالگذاری کے تعین اور وصول یابی میں بھی خاصی باقاعدگی پیدا کر دی۔ اس طرح اپنے حسنِ انتظام سے شاہی خزانے کی مالی حیثیت بہت بڑھا دی۔ ان کی اس بیدار مغزی کی تفصیل رزیڈنٹ کے میر منشی سید غلام علی خاں نے عماد السعادت میں اس طرح بیان کی ہے :۔

"آپ کی حکومت مدتِ جلوس سے آج تک کہ ۱۲۲۳ھ / ۱۸۰۸ء ہے اسی طرح سے سادہ ہے۔ اب کہ آپ کی عمر باون سال ہے سوائے سیر و شکار کے اور وہ بھی کبھی کبھی کوئی اور شغل نہیں کیا۔ لکھنؤ کے خرد و کلاں ان کے سایہ میں آغوشِ مادر اور کنارِ دایہ کو فراموش کر چکے ہیں۔ ان کے عہد میں بھیڑ اور بکری ایک ہی برتن میں پانی پیتے ہیں اور شیر اور شغال ایک ہی جگہ رہتے ہیں۔ اگر کوئی شخص فقیر کو تیز نگاہ سے دیکھے تو نواب کو ایسی تکلیف ہوتی ہے گویا ان کے سینہ میں کسی نے برچھی گھونپ دی اور کسی قوی کا ضعیف پر ہاتھ اٹھانا ایسا ہے جیسے بادشاہ کا ہاتھ پتھر کے نیچے دب گیا۔ جہاں کہیں ظالم تھا اب

معلوم ہے۔ زمانۂ ماضی میں جو مظلوم ظالموں کے ہاتھ سے تڑپ رہے تھے اب اپنا حق پاکر خوش ہیں۔ حق اپنے مرکز پر قرار پکڑ گیا ہے۔ شہر میں سوائے چبوترۂ کوتوالی کے تین جگہ عدالت مقرر کردی گئی ہے۔ علمائے عدالت یا جاسوسوں کی اتنی ہمّت نہیں ہے کہ وہ کسی واقعہ کو بغیرِ تحقیق حضور کے سامنے پیش کرسکیں۔ ملازمانِ عدالت کی بھی مجال نہیں ہے کہ وہ کسی پر ظلم کرسکیں۔ شہر میں جس قدر بھی افسرانِ حکومت ہیں ہر ایک کے اوپر دو جاسوس مقرر ہیں۔ ان جاسوسوں کے اوپر متصدی اور متصدیوں کے اوپر پھر جاسوس متعین ہیں اور اس انتظام کے ساتھ خود حضور کی طبیعت بھی ہر آدمی کے دل کا حال اُس کی پیشانی سے معلوم کرلیتی ہے۔ امیروں پر ہی کیا موقوف ہے متوسط اور ادنیٰ درجے کے لوگ بھی کھانا کھانے کے بعد لیٹنا پسند کرتے ہیں لیکن نواب سعادت علی خاں فراغتِ چاشت کے بعد سوائے ملاحظۂ افرادِ حسابی کوئی اور شغل نہیں رکھتے۔ آپ کی طبیعت ایسی واقع ہوئی ہے کہ اوّلِ وقت سیر کے لئے سوار ہوتے ہیں اور بعض اوقات شام کو بھی جاتے ہیں لیکن اس آمد و رفت میں زیادہ وقت نہیں صرف ہوتا۔ باقی تمام وقت حساب کی دیکھ بھال میں گذرتا ہے۔ یہ تمام تکالیف اختیار کرنا اور راحت کو ترک کردینا محض خلق کی آسائش اور انتظامِ مملکت کے لئے ہے۔ [۱]

سعادت علی خاں کی خوبیٔ انتظام نے مُلک کو سرسبز اور رعایا کو خوش حال بنادیا تھا۔ تجارت اور بازاروں کی رونق بڑھ گئی تھی اور نواب اپنی کفایت شعاری کے باوجود درباری شان و شوکت میں کمی نہ کرتے تھے۔ اُنھوں نے فنون کی سرپرستی اور فن کاروں کی بڑی قدردانی کی۔ مولانا محمد حسین آزاد نے اُنھیں زاہدِ خشک اور کٹھ مُلا بتایا ہے لیکن معاصرین کی لکھی ہوئی تاریخیں اور سید انشاؔ کی لطائف السعادت شاہد ہے کہ وہ نہ کٹھ مُلا تھے اور نہ زاہدِ خشک، بلکہ بڑی حد تک اُنھیں رنگین مزاج کہا جاسکتا ہے۔ وہ آغازِ جلوس سے کئی سال بعد تک نشاط باغ کے عیش و عشرت کے جلسوں میں شرکت کرتے رہے۔ ۱۲۱۷ھ / ۱۸۰۲ء

تک اُنہیں بالعموم رنگ رلیوں میں مصروف دیکھا گیا۔ ہر سال ہولی کے موقعوں پر وہ زنانِ کسبی کو بھی ہزارہا روپیہ نقد اور بیش قیمت جواہرات عنایت فرماتے تھے۔ مختصر یہ کہ اہلِ شہر اُن کی نسبت لفظِ حُسن پرستی کا اطلاق کرتے تھے اور صرف یہی نہیں بلکہ وہ کسی حد تک آبِ آتش رنگ کا بھی شوق رکھتے تھے لیکن کھولت کے زمانہ میں تخت نشین ہوئے تھے اس لئے یہ شوق زیادہ عرصہ تک نہیں چل سکا۔ بالآخر اُنہوں نے ۱۲۱۸ھ/۱۸۰۴ء میں آستانۂ جناب عباسؑ پر جاکر توبہ کی اور اُس کے بعد کبھی زبان پر عیاشی کا ذکر نہیں آیا۔" [۱]

نواب سعادت علی خاں کو مشرقی انداز پر بہت اچھی تعلیم دی گئی تھی۔ علامہ تفضل حسین خاں اُن کے اتالیق تھے جن کے فیضِ صحبت سے اُنہوں نے بہت کچھ سیکھا تھا۔ وہ اربابِ کمال کے بھی بڑے قدردان تھے۔ مثلاً اُنہوں نے میر ابوالقاسم کا جو بنگالہ کے رئیس تھے سات سو روپے وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ میر امیر علی سوز خاں کو دو سو روپے ماہوار دیا جانے لگا تھا۔ پکاش نامی ایک رقاص الٰہ آباد سے آیا جو بتاشوں اور کوڑیوں پر بڑے کمال کے ساتھ رقص کرتا تھا، نواب نے اُس کی بیش قرار تنخواہ مقرر کر دی تھی [۲] سعادت علی خاں اپنے وقت کے بہت اچھے انشاپرداز اور دقیقہ سنج آدمی تھے۔ اُن کے علمی ذوق و شوق اور وسعتِ نظر پر سید انشا نے طرح طرح سے روشنی ڈالی ہے۔ مثلاً دریائے لطافت کی وجہِ تالیف یہ بیان کی ہے کہ (انجناب نے) "ایک دن اس بندۂ بے ریا سے فرمایا کہ جس طرح اگلے زباں دانوں نے عربی اور فارسی کے گراں قیمت جوہروں کو تحریر کے رشتے میں پرو دیا ہے تاکہ آنے والے اس سے فیض اُٹھائیں اسی طرح اکثر میرے جی میں آتا ہے کہ اُردو زبان کے قواعد جو بمصداق کلِّ جدیدٍ لذیذٌ دوسری زبان سے زیادہ سُننے والوں کی جان کو تازگی بخشتے ہیں اور آج تک کسی کتاب میں نہیں لکھے گئے۔ اگر تمہاری کوشش سے جیسا کہ چاہئے اور جتنا کہ چاہئیں پوری تفصیل کے ساتھ لکھے جائیں گے تو یقیناً معاصرین اور اُن کے بعد وجود میں آنے والے طالبوں کی ضیافتِ طبع کے کام آئیں گے۔ اس لئے بہتر ہے کہ چند روز لکھنے کی محنت اُٹھا کر ایک ایسی کتاب کی تالیف میں

مشغول ہو جاؤ جس میں اس زبان کی تحقیقِ لُغت و محاورہ وصرف و نحو و منطق و عروض و قافیہ و بیان و بدیع شامل ہو۔ [۱] انشا اپنے دلی نعمت کے متعلق ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ "خدا کی قسم حضور کی اُردو میں تقریر مقاماتِ حریری یاد دلاتی ہے۔ نہ کوئی ایسا فصیح اور شیوا بیان ہوا اور نہ ہو۔ کسی وقت آپ کی بات لطیفے سے خالی نہیں ہوتی۔ کبھی تجنیس ہے تو کبھی ایہام، کبھی طباق ہے تو کبھی ترشیح اور مُحتمل ضدین۔ راقم دُعا گو کا ارادہ ہے کہ حضور کے لطائف جمع کر کے ایک مستقل کتاب میں مرتب کرے [۲] انشا کا یہ ارادہ پُورا ہوا اور اُنہوں نے "لطائف السعادت" میں وزیر الممالک کے ایسے پچاپن لطیفے محفوظ کر دیئے جن سے سعادت علی خان کی فراست، قیافہ شناسی، دقیقہ آفرینی، حاضر جوابی اور مُسکت فقرہ بازی پر بہت اچھی روشنی پڑتی ہے۔ اُن کی شگفتہ مزاجی کے اندازے کے لئے بعض لطیفے دیکھئے:۔

لطیفہ نمبر ۷:۔ ایک کالے کلوٹے ہٹے کٹے، توندیلے سیّد جو صاف باطنی کا دم بھرتے تھے حضور میں حاضر تھے۔ عرض کیا کہ ہم فقیر ہیں دُعا ہمارا شعار ہے۔ ارشاد ہوا آپ فقیر ہیں یا فخیر یا نکیر۔ یہ تینوں صیغے صفتِ مُشبّہ کے ہیں۔ سیّدِ مذکور حیران اور مجبور ہو گئے۔ ارشاد ہوا فقیر محتاج کے معنی میں وہی ہے جس کے حق میں سرورِ کائنات علیہ وآلہ الصلوٰۃ نے فرمایا "الفقر سواد الوجہ فی الدارین" اور فخیر اپنے باپ دادا پر فخر کرنے والے کے معنی میں ہے جو خود کچھ نہ ہو اور اُس کے حق میں ہے مُختالاً فخوراً اور نکیر فکر کرنے والے کے معنی میں ہے جو ذکر اور فکر اور مشاہدے اور مراقبے سے واقف ہو اور اُس کے بارے میں ہے" ویتفکرون فی خلق السمٰوٰتِ والارض؛

نواب سعادت علی خاں کے بعض تیز فقرے اس انداز کے بھی ہوتے تھے کہ جن سے کچھ غیر ثقہ معنوی پہلو اُبھرتے تھے۔ اس طرح کے فی البدیہہ فقرے آج بھی بعض ذہین لوگ کُسر کرتے رہتے ہیں لیکن سعادت علی خاں کی فقرہ بازی تو ایسی کارگر تھی کہ اُن کے حضور میں انشا جیسے تیز طرار شخص بھی طفلِ مکتب نظر آتے تھے۔ اُن کے چٹ پٹے لطیفوں میں کچھ حسبِ ذیل

ہیں جنہیں سید انشا نے اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے:۔

لطیفہ نمبر ۲۰:۔ ایک دن حضور میں میں نے ایک مذکور نکالا۔ بعض حاضرین نے نکتہ چینی کی اور میرے کلام کو رد کیا۔ تنگ آ کے کہا "سخت درگیرم" ارشاد ہوا پھر کہئے۔ میں اس کی تجنیس کو سمجھ کر شرمندہ ہوا اور اپنا منہ پلٹیا!

لطیفہ نمبر ۲۱:۔ ایک دن ایک شخص سے کہا کہ یہ جراب اپنے پاؤں میں پہنو۔ کھینچتے وقت آواز نکلی۔ میں نے کہا کہ ٹانکا ٹوٹا ہوگا۔ ارشاد ہوا "وہاں سیون بھی اُدھڑ گئی ہوگی"۔

لطیفہ نمبر ۲۸:۔ ایک دن حاضرین نے عرض کیا کہ آج پیر جلیل کے میلے میں ساری خلائق جمع تھی۔ ایک مہاوت کو ہم نے دیکھا کہ اپنی سواری پر تین آدمیوں کو بٹھا رکھا ہے۔ میں نے کہا کہ تنگ جگہ میں تین آدمیوں کی گنجائش کس طرح ہوئی ہوگی؟ اردو زبان میں ارشاد ہوا "اوپر تلے بیٹھ لئے ہوں گے"۔

لطیفہ نمبر ۴۱:۔ ایک روز میاں ہوشمند کو اردو زبان میں ارشاد ہوا کہ ہر وقت منہ کیوں تم ہلایا کرتے ہو۔ انہوں نے عرض کیا منہ میں سپاری ہے۔ غلام نے عرض کیا کہ رات کی پڑی رہ گئی ہوگی۔ ارشاد ہوا "نہ صاحب اب تلک وہ کہاں"۔ [۱]

غرض سعادت علی خاں بہت شگفتہ اور رنگین مزاج آدمی تھے۔ انشا لکھتے ہیں کہ پیر و مرشد کے عہد میں نئے اور نفیس فیشن کی تعمیروں، الفاظ کی تحقیق، فصاحت کی جانچ، بلاغت کا لحاظ، لطیفہ گوئی، بذلہ سنجی، تقریر کی شستگی اور نئی چیزوں کے ایجاد کے چرچے بہت زیادہ ہیں اور قابل اور فصیح و بلیغ شخصوں کے سوا کسی کی صحبت حضور والا کو پسند نہیں۔ ہر بات اور لطیفے کے مغز کو پہنچتے ہیں [۲] ان حقائق سے پتہ چلتا ہے کہ لکھنؤ کے ادبی مزاج کی ترتیب و تہذیب میں ناسخ کے ساتھ خود سعادت علی خان کے مذاقِ علمی کا بھی خاصا حصہ تھا۔

غازی الدین حیدر

سعادت علی خاں کی وفات کے وقت حکومت کے دو دعویدار موجود تھے ایک طرف تو نواب مرحوم کے پسر اکبر، غازی الدین حیدر تھے

جو فلسفہ، لسانیات اور ادب کا بہت اچھا ذوق رکھتے تھے لیکن وہ عالمِ شہزادگی ہی سے لہو ولعب میں مبتلا تھے۔ جرأتِ خداداد کے ساتھ ساتھ اُن کے مزاج میں تھوڑی سی آشفتہ سری بھی تھی۔ اُن کے حریف نواب کے دوسرے بیٹے شمس الدولہ تھے جو دانشمند اور پابندِ صوم وصلوٰۃ ہونے کے علاوہ اپنے باپ کے زیرِ سایہ تمام امورِ سلطنت بطورِ ولیعہد سیکھ چکے تھے۔ وہ اپنے باپ کے بھی چہیتے تھے۔ رزیڈینٹ کو خطرہ لاحق تھا کہ اگر وہ سریر آرا ہو گئے تو انگریزوں سے سعادت علی خاں کے عہد کی چپقلش برقرار رہے گی۔ اسی سبب سے رزیڈینٹ ان کا حامی نہ تھا۔ چنانچہ غازی الدین حیدر مسند نشینِ وزارت کئے گئے۔ لیکن چار ماہ بھی نہیں گذرے تھے کہ رزیڈینٹ کی مداخلتِ بےجا سے وہ اُکتا گئے۔ یہی زمانہ تھا کہ گورنر جنرل نے ایک بڑے مقصد کے لئے لکھنؤ کا دورہ کیا اور تقریبًا دو ہفتے وہ یہاں آکر مقیم ہوا۔ اس دورے کا مقصد یہ تھا کہ نواب سعادت علی خاں کے چھوڑے ہوئے خزانے میں سے ایک کروڑ روپیہ کمپنی کے لئے قرض مل جائے۔ اس لئے گورنر جنرل کا لہجہ نہایت درجہ دوستانہ نظر آتا تھا۔ یہ موقع مناسب دیکھ کر غازی الدین حیدر نے گورنر جنرل سے رزیڈینٹ کی بےجا مداخلت کی شکایت کی جس پر ہسٹنگز نے رزیڈینٹ کو ہدایت کر دی کہ وہ ایک آزاد دربار میں خود کو برطانیہ کا محض سفیر سمجھے اور دربار کے تمام رسوم اور نواب کی شخصیت کا پورا احترام کرے [۱]

اس رعایت کے صلے میں گورنر جنرل نے نواب وزیر سے ایک کروڑ روپیہ اس صورت سے طلب کیا کہ بظاہر نواب کی طرف سے عطیہ معلوم ہو لیکن کمپنی اُس کے لئے چھ روپے سیکڑا سود ادا کرے۔ نواب نے یہ تجویز قبول کر لی۔ کمپنی کی یہ امداد عین وقت پر ہوئی تھی کیوں کہ برما کی جنگ نے کمپنی کو مفلس کر دیا تھا اور بازار میں اُسے کسی طرف سے بھی قرضہ ملنے کی اُمید نہیں تھی۔ بہرحال اس قرضے کے چند ماہ بعد کمپنی کو پھر مالی امداد کی ضرورت محسوس ہوئی اور اب جنگِ نیپال کے لئے گورنر جنرل نے دوبارہ ایک کروڑ روپیہ نواب اودھ سے مذکورہ شرائط پر ادا کرنے کی استدعا کی۔ یہ درخواست بھی مان لی گئی۔ جب گورکھوں سے لڑائی ختم ہو گئی تو کمپنی نے

مفتوحہ علاقوں میں سے کھیری، گڑھ اور ترائی کا علاقہ جو نا قابلِ کاشت تھا نواب اودھ کو پہلے قرضہ کی پوری ادائگی میں دے دیا اور دوسرے قرضہ کی رقم وثیقہ داروں کے لئے انگریزی خزانے میں محفوظ رکھ لی گئی۔ اس تمام لین دین میں نواب کی ہمہ وقت آمادگی نے ہیسٹنگز کو یہاں تک متاثر کردیا تھا کہ وہ ہمیشہ کے لئے نواب کا ہمدرد بن گیا تھا۔ چنانچہ اُس نے رزیڈینٹ اور نواب کی کشمکش میں مؤخر الذکر ہی کی حمایت کی۔

گورنر جنرل کے پہلے دَورے کے وقت غازی الدین حیدر نے رزیڈینٹ کی اوّل زبانی شکایت کی تھی اور پھر اپنے ذاتی انگریز ملازموں یعنی میکلوڈ (McLeod) اور کلارک (Clarke) کو تحریری شکایت نامہ دے کر پیروی کے لئے گورنر جنرل کے پاس بھیجا تھا۔ نواب کی اس شکایت میں کہا گیا تھا کہ میرے محل کے دروازے پر جو شاہی نوبت بجتی تھی وہ بھی رزیڈینٹ نے بند کرادی ہے اور میرے نجی ڈاکٹر مسٹر لا (Law) کو میری مرضی کے خلاف برطرف کرکے ایک نیا ڈاکٹر مسٹر ولسن (Wilson) میرے سر منڈھ دیا ہے۔ جب رزیڈنٹ بیلی کو اس شکایت کا علم ہوا تو اُس نے اپنے رزیڈنسی کے ملازم علی نقی کے ذریعہ ریشہ دوانیاں کراکے ریاست کے مدارالمہام آغا میر کو ہموار کرلیا۔ آغا میر جو نواب کی شہزادگی کے وقت سے ہی اُن کے پیش خدمتوں میں تھے ریاست کے مدارالمہام تو ہو چکے تھے لیکن نائب السلطنت کے اختیارات اُنہیں ابھی نہیں ملے تھے۔ رزیڈینٹ نے نیابت دلانے کا لالچ دے کر انہیں اپنی طرف توڑ لیا اور اس طرح دربار میں سازشوں کا ایک جال پھیل گیا۔ آغا میر نے نواب کو ڈرایا کہ کہیں رزیڈینٹ کی مخالفت آپ کو تاج و تخت سے محروم نہ کرادے اور یہ ریاست شمس الدولہ کی طرف منتقل نہ ہو جائے۔ اس خطرے کے مقابلہ میں نواب کو استقامت کی تاب نہ تھی اس لئے آغا میر کے اشارے پر یہ تحریر بھی لکھ دی گئی کہ مجھے میرے نجی انگریز ملازموں یعنی میکلوڈ (McLeod) (Law) کلارک (Clarke) اور ڈی ایٹنگ (deL Etang) نے اشتعال دے کر رزیڈینٹ کی شکایت کرادی تھی۔ میں اب اُس

شکایت کو واپس لیتا ہوں۔ نواب کو اس بُزدلی کی سزا یہ ملی کہ آغا میر جیسا خود پرست وزیر اور دیا کرشن جیسا مطلبی دیوان ہمیشہ کے لئے اُس کے سر منڈھ دیا گیا۔ ان دونوں نے کروڑوں روپیہ غتر بود کیا اور حیدر مہدی جیسا دانشمند وزیر جسے بیلی ناپسند کرتا تھا۔ نواب کو نہ مل سکا۔ نواب کے چاروں انگریز ملازم برطرف کردیئے گئے اگرچہ بعد کی تحقیق سے ہیسٹنگز پر یہ بات ظاہر ہو گئی تھی کہ ان انگریز ملازموں کا کوئی قصور نہ تھا اور نواب نے محض رزیڈینٹ کی دھمکی سے ڈر کر اور آغا میر کی سازش سے اُن کے خلاف وہ تحریر دے دی تھی [۱]

اس صورتِ حال کے باوجود ہیسٹنگز برابر نواب کا ساتھ دیتا رہا اور اُس نے اپنی یہ رائے قائم رکھی کہ بیلی کا رویّہ نواب سعادت علی خاں اور غازی الدین حیدر دونوں کے ساتھ اتنا نامناسب تھا کہ لکھنؤ میں اُس کی موجودگی نے کسی فائدے کے بجائے برطانیہ کے مفاد کو نقصان ہی پہنچایا ہے [۲] اس کے جواب میں بیلی کہتا تھا کہ خود گورنر جنرل بھی نوابِ اودھ کے ساتھ مل کر سازش میں شریک ہیں [۳]

ہیسٹنگز نے نواب کی ہمدردی میں کچھ اور بھی کام سرانجام دیئے مثلاً اُس نے بہو بیگم کی متروکہ جائداد جو وثیقہ دار کے لئے کمپنی کے قبضہ میں چھوڑی گئی تھی اور جس کی قیمت کا اندازہ ایک کروڑ کے قریب تھا وہ چھپّن لاکھ اڑتالیس ہزار کے بجائے نواب کے تصرف میں دے دی گئی اُس نے اودھ کی درباری حیثیت بڑھانے کے لئے ایک اور اہم کام بھی کیا۔ اب تک یہ ہوتا آیا تھا کہ دلّی کے مغلیہ گھرانے کے جو شہزادے لکھنؤ آتے یا یہاں قیام کرتے تھے اگرچہ وہ نوابِ اودھ کے وظیفہ خوار ہوتے تھے لیکن نواب پر اُن کا ادب و احترام لازم تھا۔ یہ رسمی پابندی کچھ عجیب سی تھی اس لئے گورنر جنرل نے نواب کو باخبر کیا کہ برطانیہ نے دلّی دربار کے احترام کی تمام رسوم ترک کردی ہیں اس لئے اگر اب نواب بھی پسند کریں تو اپنی موجودہ حیثیت پر نظرِ ثانی کر سکتے ہیں۔ اِس اشارے نے نواب کو یہ سوچنے کا موقع دیا کہ وہ بھی دربارِ شاہی کے رسمی تکلّفات سے آزاد ہو کر اپنی نوابی کو بادشاہت میں تبدیل

کرلیں۔ نواب کی اس خواہش کو کلکتہ کونسل نے بھی قبول کرلیا اور اس شرط پر کہ اودھ اور برطانیہ کے تعلقات پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ اُنہیں اعلانِ بادشاہت کی اجازت مِل گئی۔ جشنِ جلوس کی تیاریاں بہت پہلے سے شروع ہو گئی تھیں۔ لوازمۂ شاہی کی فراہمی کے لئے دو کروڑ روپے منظور ہوئے تھے جن سے ایک بیش قیمت تاج، مرصّع تخت، شاہی چتر اور کارچوبی کا شامیانہ تیار ہوا تھا۔ ایک ہفتہ تک طرح طرح کے جشن منائے گئے۔ تقریبِ تخت نشینی میں شرکت کے لئے فرخ آباد، کانپور، الٰہ آباد، بنارس اور جونپور وغیرہ کے تمام انگریزی حکام مدعو کئے گئے اور ۱۸ ذی الحجہ ۱۲۳۵ھ مطابق ۹ اکتوبر ۱۸۲۰ء کو نواب غازی الدین حیدر نے بادشاہِ اودھ ہو جانے کا اعزاز پایا۔ اس موقع پر ولی عہد بہادر نصیر الدین حیدر کو سلیمان جاہ اور نواب معتمد الدولہ آغا میر کو وزیر اعظم کا خطاب عطا ہوا۔ سبحان علی خاں نے سکۂ شاہی پیش کر کے پانچ ہزار روپے انعام میں پائے۔ سکہ پر ایک طرف دو مچھلیوں اور دو شیروں کی تصویریں ایک دوسرے کے بالمقابل تھیں۔ اور دوسری طرف یہ شعر کندہ تھا:

سکہ زد بر سیم و زر از فضلِ ربِّ ذوالمنن　　غازی الدین حیدرِ عالی نسب شاہِ زمن

شیخ امام بخش ناسخ نے بادشاہ کے جلوس کی مندرجہ ذیل تاریخ فارسی میں نظم کی تھی:

بحمد اللہ کہ با اقبالِ دولت　　بہ تختِ زر جلوسِ شاہ گردید
زمین و آسماں یک بزمِ عیش ست　　زماہی خرمی تا ماہ گردید
مبارک باد اے آفاقِ عالم　　طلوعِ آفتابِ جاہ گردید
ندا آمد بگوشم زود یا رب　　کہ شاہ امروز شاہنشاہ گردید

پئے سالِ ہمایونِ جلوسش
بگو ناسخ کہ ظل اللہ گردید

اِس اعلانِ بادشاہت نے لکھنؤ اور دِلّی کی رقابت کا جذبہ قوی کر دیا۔ لکھنؤ نے اُجڑی ہوئی دِلّی کو اپنا بالمقابل سمجھ کر اُس پر تفوّق پانے کی کوشش تیز کر دی اور

تہذیب و معاشرت کی بہت سی شقوں میں تبدیلی راہ پا گئی۔

غازی الدین حیدر کی زوجۂ اوّل بادشاہ بیگم تھیں جو دِلّی کے ایک درباری مُبشّر خاں منجّم، تقویم ساز کی بیٹی تھیں۔ غازی الدین حیدر عالمِ شہزادگی سے اُن کے حسن و جمال کے پرستار تھے۔ ۱۲۰۹ھ/۱۷۹۴ء میں ان کا عقد ہوا تھا۔ بادشاہ بیگم کو مشرقی طرز پر بہت اچھی تعلیم دی گئی تھی۔ اُنہوں نے تخریج احکامِ نجوم بھی اپنے باپ سے سیکھے تھے۔ شادی کے بعد ابھی اُن سے کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی کہ نواب کو بیگم کی ایک خواص سے جس کا نام "صبحِ دولت" تھا عشق ہو گیا اور اُسی کے بطن سے نصیرالدین حیدر پیدا ہو گئے۔ بیگم نے ناراض ہو کر خواص کو مار ڈالا اور غالباً اسی گناہ کی ملامت نے اُن کی آئندہ زندگی کو بعض نفسیاتی امراض کا شکار بنا دیا جس میں بادشاہ کی جنسی بے تعلقی کے سبب سے وہ شدّت پیدا ہو گئی کہ بیگم ہر وقت احساسِ طہارت میں مبتلا رہنے لگیں۔ اب وہ احکامِ شرعیہ، فرائضِ عبادت، تلاوتِ قرآن اور ادعیہ ماثورہ کی پابندی کے علاوہ امورِ مذہبِ اثناعشری کی جدّت و اختراع میں بھی بہت غلو کرنے لگیں۔ ہفتہ میں ایک دن اُن پر آسیب بھی آنے لگا جو غالباً اختناق الرحم کی ایک صورت تھی۔ بیگم نے بعض اَئمہ کی رسمِ مولود ادا کرنے کے خیال سے کچھ پاک دامن سیدانیوں کو اچھوتی مقرر کر لیا تھا جو نصرانی راہبہ عورتوں کی طرح دُنیاوی تعلقات سے بلند رہتی تھیں۔ اِنہیں مخصوص عورتوں کے ہاتھوں وہ نذر و نیاز کی متبرک رسمیں ادا کراتی تھیں۔

کمال الدین حیدر کا خیال ہے کہ بادشاہ اپنے اخلاق و عادات کے اعتبار سے نہایت جوّاد، کریم النفس اور خُدا رسیدہ صاحبِ معرفت شخص تھے۔ جب تک اپنے ہوش و حواس میں رہے یہ صفاتِ ذاتی نواب آصف الدولہ مرحوم کی طرح اُن پر بھی ختم تھیں [۱] اُن کی رحمدلی اور منصف مزاجی کی تصدیق بشپ ہیبر (Bishop Heber) نے بھی کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ جیسی کی مانند بادشاہ غازی الدین حیدر بھی فطرۃً منصف مزاج اور رحمدل مشہور ہیں۔ یہ اُن لوگوں کے نزدیک بہت زیادہ ہردلعزیز ہیں جو اُن تک باریاب ہیں، کوئی

زیادتی یا ظلم کا عمل نہ اُن کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور نہ کوئی ایسی اطلاع اُن تک پہنچنے کی توقع کی جاتی ہے۔ اُن کی کمزوریاں بہت سے بہت یہ کہی جاسکتی ہیں کہ وہ اپنے اخراجات میں ضبط ونظم نہیں رکھتے۔ رعایا کی پہنچ اُن تک بڑی مشکل سے ہوسکتی ہے۔ بادشاہ کو اپنے مصاحب پر بڑا اعتماد ہے اور شاہی عادات و روایات کا وہ بڑا لحاظ رکھتے ہیں [۱]

بشپ ہیبر نے ایک دوسری جگہ بادشاہ کے عادات و خصائل کی اس طرح تعریف کی ہے کہ "اُن کی عادات و اطوار بہت شریفانہ اور پاکیزہ ہیں اگرچہ بعض یورپین خواتین جو اُن کے دربار میں حاضر ہوتی ہیں اُن کی بے التفاتی کی شاکی ہیں" [۲]

غازی الدین حیدر نے اپنی فرماں روائی کے ابتدائی ایام میں انتظامِ دربار اور ملاحظۂ کاغذات پر بہت توجہ دی اور کئی سال تک بڑی شان و شوکت کے ساتھ حکومت کی لیکن جب بادشاہ جگر کے ورم، استسقاء اور ضعفِ معدہ میں مبتلا ہو کر طبیبوں کے مشورے سے شراب پینے لگے تو وزیر اعظم آغا میر کا اثر و اقتدار بہت بڑھ گیا۔ خود بادشاہ بھی داد و دہش کے معاملے میں بڑے دریا دل واقع ہوئے تھے اور اُن کا وزیرِ اعظم بھی بڑا فیاض تھا جس کی وسعتِ قلب کے سلسلے میں صاحبِ سوانحاتِ سلاطینِ اودھ نے میر بندہ علی کا بیان نقل کیا ہے جنہیں محض مسخرگی کے صلے میں گیارہ سال کے اندر چودہ لاکھ روپیہ عنایت ہوا تھا۔ اسی طرح اُردو ادب کی تاریخ میں یہ بات بھی یادگار رہے گی کہ معتمد الدولہ نے ۱۸۳۱ء میں شیخ امام بخش ناسخ کو اُن کے ایک قصیدہ پر سوا لاکھ روپیہ انعام دیا تھا۔

غازی الدین حیدر کی تعلیم سراسر مشرقی طرز پر ہوئی تھی۔ اُن کے والد اگرچہ خود ہندوستانیوں کی طرح انگریزی بولتے تھے اور عموماً انگریزی لباس بھی پہنتے تھے لیکن اُنہوں نے اپنے صاحبزادے کو یورپین تعلیم اور تربیت سے الگ ہی رکھا تھا۔ پھر بھی غازی الدین حیدر نے انگریزی سیکھ لی تھی۔ وہ انگریزی لباس بھی پہنتے تھے اور اُن کی دو بیویاں بھی انگریز نسل سے تھیں۔ بشپ ہیبر نے لکھا ہے کہ اُنہیں مطالعہ کا بڑا شوق تھا۔ وہ مشین اور علمِ کیمیا سے دلچسپی رکھتے ہیں علاوہ ازیں

مشرقی علم لسانیات اور فلسفے کے وہ ایک فاضل ہیں [۱] بشپ ہیبر کی بادشاہ سے دوسری ملاقات مسٹر ریکیٹس رزیڈینٹ کی شادی کے موقع پر ہوئی تھی جس میں شرکت کے لئے بادشاہ نے خود ہی خواہش ظاہر کی تھی۔ اس دعوت پر وہ پہلے سے بہت زیادہ وضاحت کے ساتھ بات چیت کر رہے تھے۔ موضوعِ گفتگو ایک بھاپ کا انجن تھا۔ اسی سلسلے میں ایک ایسے جہاز کا بھی ذکر آیا جس کی سطح پر ایک کھینے والا پہیہ لگا ہوا تھا اور جسے اُن کے ولایتی انجینیر نے تیار کیا تھا۔ اُنہوں نے شیراز کے ایک زلزلے کے متعلق بھی جس کی اطلاع اُنہیں پہنچی تھی بہت سے اسباب بیان کئے۔ بشپ ہیبر لکھتا ہے کہ مجھ سے اُنہوں نے بعض ایسی انگریزی کتابوں کا بھی ذکر کیا جن سے اُن کی انگریزی دانی کا اظہار ہوتا تھا [۲] ولایتی انجینیر کے علاوہ اُن کے دربار میں کئی اور انگریز بھی مختلف خدمات پر مقرر تھے جن میں سے چار کا اخراج رزیڈینٹ بیلی نے کرا دیا تھا لیکن ایک لاجواب انگریزی مصور مسٹر ہوم آخر تک موجود رہے جنہیں بشپ ہیبر بادشاہِ اودھ کے لئے نعمتِ غیر مترقبہ سمجھتے ہیں۔ یہ مصور سعادت علی خاں کے زمانے میں مدراس سے بلائے گئے تھے۔

غازالدین حیدر کے زمانے میں بہت سے علمی کام ہوئے جن میں سے ایک مدرسۂ علوم مشرقی کا قیام تھا اور دوسرا چھاپے خانے کا رواج تھا۔ اس پریس سے بہت سی علمی کتابیں شائع ہوئیں جن میں سے بعض مثلاً محامدِ حیدریہ وغیرہ اب بھی ملتی ہیں۔ اسی عہد کی مطبوعہ کتابوں میں تاج اللغات بھی ہے۔ بادشاہ نے دو سال کی مسلسل محنت سے علم لغت پر ایک مبسوط کتاب ہفت قلزم ترتیب دی تھی جس کا دیباچہ مولوی قبول محمد نے لکھا تھا۔ دیباچہ نگار فرماتے ہیں کہ "روزے بتقریبے بادشاہ می فرمودند کہ درروز اکثر از امورِ مالی و ملکی فراغت گرفتہ و دادِ ستم رسیدگاں و مظلوماں دادہ وحاجتِ جمیع حاجتمنداں برآوردہ بہ تحریرِ مسودۂ ایں کتاب از سرِ شام نشستہ زمانے برخاستہ ایم کہ سپیدۂ صبح دمیدہ"۔ اس کتاب میں برہانِ قاطع کے برخلاف لغات کی ترتیب قوافی کی رعایت سے کی گئی ہے۔ یہ کتاب اپنے نقائص کے باوجود

نہایت ضخیم اور مفید ہے۔

علمی اور ادبی ذوق سے قطعِ نظر بادشاہ اپنی نفاست اور اختراعات کے لحاظ سے بھی ایک خاص مرتبہ رکھتے تھے۔ اُن کی بعض ایجادات کا تذکرہ بعض مورخوں نے بھی کیا ہے۔ نجم الغنی لکھتے ہیں کہ اُنہوں نے نقرئی وطلا کار کشتیاں ایسے انداز کی بنوائی تھیں کہ کوئی مچھلی کی صورت تھی کسی میں گھوڑے وغیرہ کی صورت بنی ہوئی تھی۔ بادشاہ کو سواریٔ بجرہ و سیرِ دریا سے بہت شوق تھا۔ خیمہ اس طرح کا ایجاد کیا کہ بغیر طنابوں اور میخوں کے پُل کی طرح کھڑا رہتا اور ہوا سے نہ گرتا۔ شکاری حوضے اس طرح کے بنوائے کہ شکاری جس طرف متوجہ ہو اُسی طرف حوضے کا رُخ پھر جائے۔ عمارات میں روشنی کے شیشہ وآلات نصب کئے اور کھانوں میں بھی طرح طرح کی ایجادیں کیں مثلاً نانِ آفتاب اور شب دیگ اور بڑی روٹی جس کا وزن دو من سے کم نہ ہوتا میدہ اور قند سے تیار کرائی اور کئی چیزوں کے نام بھی تبدیل کئے "ملائی" کا نام "بالائی" رکھا "دہی" کا نام "دیہی" مقرر کیا۔ "حُقّہ" کا نام "حسنِ محفل" قرار دیا۔ [۱]

مختصر یہ کہ بادشاہ غازی الدین حیدر اپنے دربار کی آراستگی، خوش سلیقگی، علم دوستی اور ایجاد پسندی کے سلسلے میں بڑا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ اپنی طینت کی پاکیزگی اور ذوق کی نفاست کے لحاظ سے بھی اُن کا مرتبہ بلند تھا۔ وہ تندرست، توانا اور حوصلہ مند شخص تھے لیکن شراب نوشی کی کثرت نے اُن کی صحت خراب کر دی تھی۔ آخر کار مضمحل اور ضعیف ہو کر اُنہوں نے ۱۸ اکتوبر ۱۸۲۷ء (۱۲۴۳ھ) کو انتقال کیا۔ کسی شاعر نے حسبِ ذیل اشعار قطعۂ تاریخ میں کہے تھے ؎

از وفاتِ جنابِ شاہِ زمن	گوئیا عالمے ہلاک شُدہ
دیدہ ہا شُد بہ ماتمش نمناک	سینہ از آہ دردناک شُدہ
رفت درمانِ ہوش از دستم	جیبِ صبر و شکیب چاک شُدہ

گشت تاریخ مصرعِ استاد

اے بسا آرزو کہ خاک شُدہ

۱۲۴۳ھ

نصیر الدین حیدر

اودھ کے بیرونی خطرات آصف الدولہ کی تخت نشینی کے وقت ہی بڑی حد تک ختم ہو چکے تھے۔ پھر کچھ آگے بڑھ کر سعادت علی خاں کے عہد میں ۱۸۰۱ء کے صلح نامے کی رُو سے اندرونی خطرات بھی جاتے رہے۔ اس لئے اب اودھ کے حکمرانوں کو اپنی تقدیر پر قانع رہ کر عیش و آرام کے ساتھ دن گذارنے کا موقع میسر تھا۔ چنانچہ غازی الدین حیدر نے عیش و عشرت کی جو روایات شروع کر دی تھیں اُن کی تکمیل اُن کے صاحبزادے نصیر الدین حیدر نے کر دی جو انگریزی لباس، انگریزی غذا، انگریزی ساز و سامان اور انگریز مصاحبین کا بھی نہایت وافر شوق رکھتے تھے۔ شراب، ناچ رنگ، جانوروں کی لڑائی کا تماشا، حسین عورتوں کی صحبت کا ذوق وغیرہ ایسے مشاغل تھے جن میں اس نوعمر بادشاہ کے اوقات بسر ہوتے تھے۔ نہ ریاست کے انتظام پر کوئی توجہ تھی اور نہ اپنے ذاتی اخراجات پر کوئی قابو تھا۔ ارباب نشاط کے کئی سَو طائفے جو سر آمدِ چکلہ تھے، اُن کے ملازم تھے [۱] جن کی تنخواہوں کے علاوہ انعام و اکرام کی داد و دہش پر بھی لاکھوں روپیہ صرف ہوتا تھا۔ ڈی ریسیٹ فرنچ حجام مقرب خاص تھا جس کی معرفت لاکھوں روپے کے اسباب کی خرید و فروخت ہوتی تھی۔ اُس نے چند سال کے عرصے میں لاکھوں روپے پیدا کر لئے تھے۔ وزیر السلطنت کی تنخواہ پچیس ہزار روپے ماہوار یعنی تین لاکھ سالانہ تھی لیکن دوسری مراعات مثلاً مالگذاری پر پانچ فیصد کمیشن وغیرہ شامل کر کے تقریباً نو لاکھ سالانہ اُنہیں ملتا تھا [۲]

رجب علی بیگ سرورؔ نے اپنے خاص انداز میں دربار اور بادشاہ کے مشاغل کی تفصیل "فسانۂ عبرت" میں اس طرح بیان کی ہے:

"ہزار ہا پری پیکر حور وش سیم تن ... صبح و شام در زمرۂ خدام دست بستہ حاضر رہیں۔ گلاب کیوڑہ کیا چیز ہے۔ عطر کی نہریں بہیں۔ مکان اور باغ ہر ایک بہشت کا نمونہ، تیاری میں گلشنِ شداد سے دُونا۔ اشرفی اور روپے کے گنج بے رنج خالی کر دیئے۔ محتاجوں کے گھر بھر دیئے۔ پھولوں کا یہ صرف تھا کہ دیکھا نہ سُنا ... جلسے والیانِ نادرِ زمانہ، شہرۂ آفاق

گائیں پری چہرہ، موسیقی میں یکتا، دلبری میں طاق۔ ان کے علاوہ ہزاروں مہ سیما رشک مہر، کم سِن، اُن کے پیچھے، لاد بالیاں، اُمنگ کے دن۔ کہاریاں، پریوں کی صورت کی ..... چشمۂ فیض رات دن جاری تھا، لینے والا عاری تھا .... ایک روز ملکۂ زمانی کے محل میں حضرت تشریف فرما ہوئے۔ ایک رقعہ ہاتھ میں تھا اُنہوں نے پوچھا مرزا ہاتھ میں یہ کیا ہے۔ فرمایا پچاسی لاکھ روپیہ فیض آباد سے آیا ہے۔ اُنہوں نے کہا مجھے دو۔ یہ سُنتے ہی رقعہ ہاتھ سے پھینک دیا، گویا بڑا بوجھ تھا۔ قدسیہ محل نے کہا اشرفیوں کا ڈھیر نہیں دیکھا۔ فوراً محل میں انبار ہوگیا۔ ارشاد کیا لطف اگر دیکھا چاہو تو مُنّا دو، کسی نے راگ مالے کی کتاب نذر دی۔ فرمایا اِس کا جلسہ ہو۔ جو راگنی جس صورت و پوشاک سے دیکھی وہی صحبت ٹھہری۔ ایک بھیرویں کے جلسے میں پانسو عورت دلہن کا لباس پہنے، ہاتھوں پاؤں میں مہندی لگی، چوڑی شہابی سر سے پاؤں تک جواہر کا زیور۔ ایک راگنی کی صحبت تین تین دن ہوتی تھی۔ اِندر کی سبھا کی آبرو کھوتی تھی [۱]

الغرض یہی مصارف تھے جن کی بدولت دس کروڑ روپیہ جو غازی الدین حیدر نے اپنی وفات پر چھوڑا تھا چند ہی سال میں ٹھکانے لگ گیا اور آخری ایام سلطنت میں ہر طرف روپے کی کمی محسوس ہونے لگی۔ سلیمین نے جو خزانۂ شاہی کے اعداد و شمار دیئے ہیں اُن سے پتہ چلتا ہے کہ نصیر الدین حیدر کی وفات کے وقت صرف ستّر لاکھ روپیہ موجود رہ گیا تھا [۲] گویا دس سال کی مدّت میں سالانہ آمدنی کے علاوہ ۹ نو کروڑ تیس لاکھ روپیہ جو خزانے میں پہلے سے موجود تھا وہ نذرِ صرف ہوگیا۔

بادشاہ کی عیش پسندی کے ساتھ ساتھ اُن کا شدید مذہبی جذبہ کسی حد تک تعجب خیز ہے۔

" وہ اپنے مذہبی رسوم کے ادا کرنے میں بڑے شغف و انہماک سے کام لیتے تھے۔ محرم کے زمانے میں اپنے اعزہ اور اقارب ہی کے مجمع میں رہتے تھے۔ شراب پینا، دعوتیں دینا اور عیش و عشرت کی محفلوں میں شریک رہنا موقوف ہوجاتا اور انگریزی مذاق کی جتنی باتیں انہیں پسند تھیں

وہ بھی چھوڑ دیتے تھے۔"[۱] انگریز مصاحبین کو بھی ان ایام میں حضوریِ بادشاہ کا موقع نہ مل سکتا تھا۔ اس زمانے میں دربار بھی ناغہ رہتا تھا اور تمام ملکی و مالی کاروبار اکیس[۲] صفر تک ملتوی رہتے تھے۔ رجب علی بیگ سرور "فسانۂ عبرت" میں لکھتے ہیں کہ "اس عیش پسندی پر عشرۂ محرم میں یہ حال تھا کہ راہ چلتوں کو مُسکرانا محال تھا۔ روز و شب غمِ اہلبیتؑ میں رونا، اربعین تک زمین پر سونا، لباس آبی یا سیاہ، ہر دم لب پر نالہ و آہ۔ ہزارہا روپیہ اور جہان کی نعمت مرثیہ خوان و سیّد، محتاج آب و نان پاتے تھے۔ تحصیلِ حسنات و ثواب فرماتے تھے۔ دوازدہ امام کی درگاہ، صاحب الامر کا غار بنوایا، لاکھوں روپے کا اسباب چڑھایا[۲]

نصیر الدین حیدر کے زمانے میں جب حکیم مہدی علی خان کو اودھ کی وزارت مل گئی تو اُن کی فہم و فراست کی وجہ سے ملکی انتظام خاصا درُست ہو گیا تھا جس کی وجہ سے بعض مفید کام سرانجام پا گئے تھے جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ دارالشفاء قائم ہوا جس کا انگریزی شعبہ ڈاکٹر اسٹیونسن (Dr. Stevenson) کے ماتحت اور یونانی شعبہ مرزا علی اکبر کے زیرِ نگرانی تھا۔ اس کے اخراجات کے لئے چھ لاکھ روپیہ انگریزی خزانے میں داخل کر دیا گیا تھا جس کے منافع سے یہ بعد تک چلتا رہا اور آج بھی برقرار ہے۔

۲۔ شاہی چھاپہ خانہ (لیتھو گرافک) کا انتظام آرچر صاحب کے سپرد کیا اور اُن کی تنخواہ پانچسو روپے ماہوار مقرر ہوئی۔

۳۔ دریائے گومتی کا آہنی پُل غازی الدین حیدر کے زمانہ میں یورپ سے منگایا گیا تھا جو نصب نہ ہونے کی وجہ سے رَمنہ میں پڑا پڑا زنگ آلود ہو رہا تھا۔ زیرِ تذکرہ زمانے میں ایک انجینئر سنکلیر کے اہتمام سے اُس کی تعمیر ہوئی۔

۴۔ ۱۸۳۱ء میں مُلک کے اپاہجوں کے واسطے ایک محتاج خانہ بنوایا گیا جس میں ناکارہ مرد و زن رکھے گئے اور اُن کے اخراجات کے لئے ریاست سے ایک ہزار روپے ماہوار کا انتظام

رزیڈنیٹ کی ضمانت میں کر دیا گیا۔ یہ خیرات خانہ آج بھی نخاس کی سڑک پر خالق بازار میں واقع ہے۔

۵۔ رمنۂ موتی محل میں رصد خانۂ سلطانی قائم ہوا جس کے مہتمم کپتان ہربرٹ اور سرگروہِ طلبار مولوی اسمٰعیل تھے۔

۶۔ رزیڈنیٹ کے اہتمام و انتظام میں ایک انگریزی اسکول کی بنیاد ڈالی گئی۔

۷۔ گنگا سے ایک نہر نکلوانے کا بندوبست کیا لیکن لکھنؤ کی زمین سطح دریا سے تین فیٹ بلند تھی اس لئے ایک ماہر انجینیئر کی ضرورت تھی جو نہ مِل سکا اور یہ کام ناتمام رہا۔ [۱]

محمد علی شاہ

نصیر الدین حیدر نے دس سال حکومت کر کے عین عالم شباب میں ماہ ربیع الثانی ۱۲۵۲ھ / ۱۸۳۷ء میں انتقال کیا تو سلطنت کے دو دعویدار پیدا ہو گئے۔ ایک طرف فریدوں بخت مُنّاجان کو بادشاہ بیگم کی حمایت حاصل تھی اور دوسری طرف نصیر الدولہ محمد علی تھے جو سابق شاہِ اودھ کے حقیقی چچا تھے۔ اُن کو رزیڈنیٹ کی طرفداری حاصل تھی۔ بادشاہ بیگم نے رزیڈنیٹ کی مرضی کے بغیر منّاجان کو تخت پر بٹھا دیا تھا لیکن انگریزی قوّت و سیاست سے پیش نہ جا سکی بالآخر مُنّاجان اور بادشاہ بیگم دونوں گرفتار کر کے چنار گڑھ کے قلعہ میں بھیج دیئے گئے اور محمد علی کو عنانِ حکومت دے دی گئی لیکن سعادت علی خان کی طرح چونکہ اس مرتبہ بھی حکومت غیر مستحق کو دی گئی تھی اس لئے پھر کوئی ایسا معاہدہ متوقع تھا جس میں سرکار انگریزی کا بھلا ہوتا چنانچہ ۱۲۵۳ھ / ۱۸۳۷ء میں سات دفعات کا ایک نیا عہدنامہ تیار ہُوا جس کی رُو سے انگریزی عمل دخل میں اور اضافہ ہو گیا۔ اس عہدنامے کی سب سے اہم شرط جو ضبطیٔ اودھ کا پیش خیمہ کہی جا سکتی ہے یہ تھی کہ برطانوی حکومت جب مُلکِ اودھ میں بدانتظامی دیکھے گی تو تمام ریاست یا اُس کے جس حصّہ کو چاہے گی اپنے بندوبست میں لے سکے گی۔

محمد علی شاہ کی عمر تختِ نشینی کے وقت ترسیٹھ ۶۳ سال تھی اور بعض امراض کی وجہ سے اُن کے دست و پا بھی قابو میں نہیں رہے تھے۔ لیکن اس ضعف و نقاہت کے باوجود انہوں نے ایسی بیدار مغزی اور معدلت گستری کے ساتھ سلطنت کی کہ اُن کا زمانۂ حکومت نصیر الدین حیدر

کی بے اعتدالیوں کا ردِ عمل پیش کر سکا۔ وہ صبح آٹھ سے نو بجے تک اجلاس کرتے اور پھر دوپہر تک کا غذات کی دیکھ بھال، استغاثوں کی سماعت اور دوسرے سرکاری کاروبار میں مشغول رہتے تھے۔ اِس شعورِ فرماں روائی کا نتیجہ تھا کہ ان کے پانچ سالہ عہدِ حکومت میں سلطنتِ اودھ کی بہت سی خرابیاں دُور ہو گئیں اور تمام ملک میں کوئی اندرونی انتشار پیدا نہ ہو سکا۔ انگریز بھی اس سلامت رَوی سے بہت مطمئن تھے [۱]

محمد علی شاہ کی پیرانہ سالی اور اُن کا مذہبی خلوص متقضی تھا کہ وہ اعمالِ حسنہ اور امورِ خیر و مبرات کی طرف خاص توجہ دیں چنانچہ اُنہوں نے کئی لاکھ روپیہ آغا محمد اصفہانی سوداگر کی معرفت کربلائے معلیٰ روانہ کیا تاکہ ترمیم روضۂ جنابِ عباس اور درستئ نہرِ روضۂ حضرتِ حُر کرادی جائے۔ علاوہ ازیں ایک ہزار روپیہ ماہوار اُن زائرین کے لئے مقرر کیا جو لکھنؤ کے باشندے تھے لیکن عتباتِ عالیات میں مقیم تھے۔ یہ رقم فی کس پانچ روپے کے حساب سے اُن لوگوں میں تقسیم کی جاتی تھی [۲] بیرونِ ملک میں اِن مصارفِ خیر کے علاوہ اُنہوں نے خاص لکھنؤ میں بھی مذہبی نوعیت کے بعض کام سرانجام دیئے۔ مثلاً عاشور خانۂ حسین آباد تعمیر کرایا اور اپنے درِ دولت سے امام باڑے تک دریا کے کنارے کنارے ایک کشادہ سڑک بنوائی۔ ان چیزوں کی تعمیر میں بیس۲۰ لاکھ روپے صرف ہوئے۔ امام باڑے سے قریب ہی جامع مسجد کی بنیاد رکھی جس کی تعمیر کے لئے دس لاکھ روپیہ نواب ملکۂ جہاں کے پاس امانت رکھ دیا تھا۔ یہ مسجد زمانۂ امجد علی شاہ میں مکمل ہوئی۔ اپنے عزاخانے اور مسجد کے لئے تینتیس ۳۳ لاکھ پچاس ہزار روپیہ جس کا منافع چودہ ہزار ہوتا تھا انگریزی خزانے میں جمع کرا دیا تاکہ ان دونوں عمارتوں کے خرچ اور ان کے ملازمین کی تنخواہوں کا مناسب بندوبست ہوتا رہے۔ اُنہوں نے اپنی صاحباتِ محل، شاہزادگان اور متوسلین کے لئے بھی سترہ لاکھ روپیہ جمع کیا تھا جس کے منافع سے اُن سب کو نسلاً بعدِ نسلٍ وثیقہ جاری ہوا [۳]

مؤرخین نے اس مختصر عہدِ حکومت کی تعریف کی ہے چنانچہ صاحبِ بوستانِ اودھ

رقم طراز ہیں :

"ہر امرے کہ ازیں بادشاہ بظہور رسید صد ہزار تحسین است۔ در عہد دولتش ہمہ مردم فارغ البال و آسودہ حال بودند۔ ہیچ کس آزارے بردل نداشت۔ ابواب معدلت بر روئے خلائق بازو دستِ تظلّم و تعدی کوتاہ بود۔ باوجود ضعفِ پیری از کارہائے سلطنتِ خود را معذور نمی داشتند و بر امورِ کُلّی وجزوی می رسیدند" نظم۔

عجیب عہدے ہمہ در کامرانی　　بہر خانہ نشاط و شادمانی
نہ کس وادے کمندِ کینہ را تاب　　نہ کس دیدے خیالِ فتنہ در خواب

جب اُن کی عمر تقریباً پچھتر سال تھی تو ۵ ربیع الثانی ۱۲۵۸ھ مطابق ۱۲ مئی ۱۸۴۲ء کو انتقال کیا اور شاہی خزانے میں اٹھتر لاکھ، چوراسی ہزار روپیہ جمع چھوڑا۔

امجد علی شاہ

اب عنانِ سلطنت امجد علی شاہ کے ہاتھ میں آئی۔ اُن کو علماء اور فضلا کی صحبت سے فیض پہنچا تھا اور تعلیم بھی مشرقی طرز پر بہت اچھی مِلی تھی اس لئے مذہبی احکام کی شدت کے ساتھ پابندی اُن کے معمولات میں داخل تھی۔ مقدماتِ معدلت رسانی بھی بمقتضائے حُسنِ عقیدت مجتہدین ہی کو سپرد تھے۔ چنانچہ سلطان العلماء کے پسرِ اکبر سیّد باقر صاحب کو مہتمم عدالتِ دیوانی و فوجداری مقرر کیا تھا، اور ہر ناظمِ ضلع کے پاس ایک اثنا عشری مفتی متعین تھا تاکہ احکاماتِ شرعی کی طرف راہبری کر سکے۔ خزانۂ عامرہ سے زکوٰۃ باقاعدگی کے ساتھ نکلتی تھی جس کی تقسیم مجتہد العصر کے سپرد تھی۔ بادشاہ اپنے مذہبی احساسات میں اس قدر محتاط تھے کہ جب کبھی رزیڈینٹ کے یہاں دعوت میں شریک ہوتے تھے تو اپنا رکابدار ساتھ لے جاتے اور سوائے چائے کے کبھی کوئی اور چیز استعمال نہیں کرتے تھے۔ جب رقص و سرود کا وقت آتا تھا تو وہ اُٹھ کھڑے ہوتے تھے [۱] وہ نہ تو شکار کے خطرات اور اُس کی خستگی کے شائق تھے اور نہ فوجی زندگی کی تنہائی اُنھیں پسند تھی [۲] البتہ امورِ سلطنت میں بڑا انہماک رکھتے تھے۔ اُن کا معمول تھا کہ صبح سویرے ہوا خوری کے لئے سوار ہو جائیں اور نو بجے کے قریب

واپس آکر دوپہر تک ملکی ومالی کاروبار میں مصروف رہیں۔ بارہ بجے کے قریب وہ محل سرا میں داخل ہوتے تھے۔ پھر سہ پہر کے قریب مُدبّر الدولہ حاضر ہو کر اُن سے امورِ مجوزہ میں مشورہ کرتے تھے۔ شام کے وقت بادشاہ پھر ہوا خوری کو نکل جاتے تھے [۱] اس ضبطِ اوقات کی تصدیق کرنل سلیمن نے بھی کی ہے جو لکھتا ہے کہ:۔ " موجودہ بادشاہ (واجد علی شاہ) کے والد اور دادا یعنی امجد علی اور محمد علی جب تختِ سلطنت پر متمکن رہے اُس وقت تک شاہزادگان اور معززینِ شہر کو دربار میں روزانہ یا ہفتہ میں تین چار مرتبہ شرفِ ملاقات حاصل ہوتا تھا۔ تمام درخواستیں اور رپورٹیں اُن بادشاہوں کے حضور میں پڑھ کر سُنائی جاتی تھیں اور وہ خود ہی احکامات صادر کرتے تھے۔ کام ختم ہونے کے بعد مُہرِ شاہی مُقفّل کر کے ایک معتمد ملازم کے پاس رکھ دی جاتی تھی اور اُس کی کُنجی دُوسرے ملازم کے سپرد ہوتی تھی۔ اس صورت سے کاغذات صبح و شام یعنی دن میں دو مرتبہ ملاحظہ ہوتے تھے اور اُن پر احکامات صادر کئے جاتے تھے۔ اس موقع پر تمام شعبوں کے افسران حاضر رہتے تھے۔ [۲]

امجد علی شاہ اپنی ثقاہت کی سکون آفرینی کے باوجود تمدنی ارتقاء کی طرف سے بے خبر نہ تھے۔ اُنہیں شوق تھا کہ تمام رعایا کے مکانات یا تو رنگین کر دیئے جائیں یا اُن پر نقش و نگار بنا دیئے جائیں۔ اپنے متعلق اُن کو گمان تھا کہ وہ عمارت سازی کا بڑا اچھا ذوق رکھتے ہیں [۳] اُن کے عہد میں امین آباد اور حضرت گنج تعمیر ہوئے جو آج بھی لکھنؤ کے خوبصورت ترین حصے سمجھے جاتے ہیں۔ لکھنؤ اور کانپور کی درمیانی پختہ سڑک جو پچاس میل لمبی تھی اُسی زمانہ میں تیار ہو کر وزیر السلطنت امین الدولہ کے نام سے موسوم ہوئی تھی۔

عمارات کے علاوہ دو بہت نمایاں علمی خدمات بھی اُس زمانے میں سرانجام پائی تھیں۔ ایک یہ کہ مدرسۂ سلطانی قائم ہوا تھا جس میں ہزار ہا طالب علم داخل ہوئے تھے۔ اُن میں سے ہر طالب علم کو پانچ روپے ماہوار وظیفہ ملتا تھا اور ہر بیس طلباء پر ایک معلم متعین تھا۔ مولوی محمد کاظم نے اپنی سوانح عمری میں لکھا ہے کہ وہ خود بھی اس مدرسے میں معلم مقرر ہوئے تھے۔

دوسرا اہم کام اس عہد میں رصد خانۂ سلطانی کی تکمیل کا تھا جس کا آغاز اگرچہ نصیر الدین حیدر کے عہد میں ہوا تھا لیکن اُس زمانے میں دس سال کی محنت کے بعد کرنل ولکاکس (Col. Wilcox) نے مشاہداتِ کواکب کے متعلق اپنی کتابیں مکمل کی تھیں۔ ان کتابوں کی اشاعت کے لئے مطبع الٰہ آباد تجویز ہوا تھا اور اس کام کے لئے حکومتِ اودھ نے سات ہزار روپیہ بھی منظور کر دیا تھا لیکن عین وقت پر کرنل وِلکاکس (Col. Wilcox) کا انتقال ہو گیا جس کی وجہ سے یہ کتابیں شائع نہ ہو سکیں [۱]

اودھ کے بعض فرماں روایانِ سابق کی طرح امجد علی شاہ نے بھی اپنے محلات اور متوسلین کے وثیقے کے لئے "تین" لاکھ روپے کے نوٹ بطریقِ قرضۂ موبد خرید کئے تھے جن کا منافع اُن کے ورثا میں تقسیم ہوتا رہا [۲]

واجد علی شاہ

امجد علی شاہ نے تقریباً پانچ سال حکومت کرکے ۱۲۶۳ھ / ۱۸۴۷ء میں انتقال کیا اور اُن کے بجائے سلطانِ عالم مرزا واجد علی شاہ وارثِ سلطنت ہوئے۔ اُن کی حکومت کا آغاز، جوانی کی اُٹھان اور شباب کے دلولوں کے ساتھ ہوا تھا لیکن پھر بھی نوعمر بادشاہ نے بڑے نظم و ضبط سے کام شروع کیا اور زمانۂ ولیعہدی کے بہت سے غیر ذمہ دارانہ مشاغل کو عموماً ترک کر دیا مثلاً پری خانہ کی جن پریوں سے خصوصی روابط تھے اُنہیں بیگمات بنا کر محل میں داخل کر لیا۔ وہ خود تاریخ پری خانہ میں لکھتے ہیں کہ "ولیعہدی کے زمانہ میں سب بیگموں، پریوں، معشوقوں کی عادت، خصلت، رنگِ طبیعت اور باعثِ بے وفائی مجھ پر ظاہر ہو چکا تھا اس لئے سلطنت کے زمانے میں اُن سب کا باہر رکھنا محض بے محل تھا۔ اسی بناء پر خیال کیا کہ ان سب کو روپیہ کی طمع دے کر پردے میں بٹھایا جائے لیکن ان میں سے چند عورتیں جو وفادار نہ تھیں اس سے بھاگنے لگیں مگر کچھ کارگر نہ ہوا۔ میں نے ایک روز سب پریوں کو پردے میں بٹھا کر خطابوں سے سرفراز فرمایا [۳]

نوجوان بادشاہ نے ابتدائے حکومت میں اپنی منصف مزاجی کے تقاضے پر مشغلۂ سلطانی

کے نام سے یہ دستور بھی مقرر کیا تھا کہ بادشاہ کی سواری کے ہمراہ دو ترک سوار آگے آگے دو نقرئی صندوق لے کر چلیں جن کی کنجیاں خود بادشاہ سلامت کے پاس ہوں۔ راستے میں جو مستغیث یا فریادی چاہیں اُن میں درخواست ڈال دیں۔ محل میں پہنچ کر خود جہاں پناہ اپنے ہاتھ سے اُن صندوقوں کو کھول کر استغاثے نکالتے اور خود ہی حکم تحریر فرماتے تھے۔ بادشاہ نے تاریخ پریخانہ میں لکھا ہے کہ: میں نے دادخواہی کے واسطے چاندی کے صندوقچے لکڑیوں پر نصب کرواکر اردلی کے سواروں کو دے دیئے تھے کہ جو شخص عرضداشت اس میں چھوڑے، وہ جمع ہوکر میرے ملاحظے میں گذارنی جائیں [۱] بادشاہ کے اس احساسِ بیداری نے مجتہد العصر کو بھی متاثر کیا تھا۔ چنانچہ اُنہوں نے ایک معروضے کے ذریعہ اس مشغلے کی ستائش کی تھی مجتہد العصر کا یہ خط نجم الغنی نے تاریخِ اودھ میں نقل کیا ہے [۲]

انصاف پسندی کے اس رُجحان کے ساتھ بادشاہ نے فوج کی درستی کی طرف بھی خاص توجہ دی اور مضبوط سپاہیوں کے چند رسالے بھرتی کرکے اُن کو نئے انداز پر تعلیم دینی شروع کی۔ بادشاہ کی بلطافتِ ذوق نے ان پلٹنوں کے نام بانکا، ترچھا، گھنگھور، اختری اور نادری وغیرہ رکھے اور قواعد کے لئے بھی فارسی اصطلاحیں وضع کیں۔ اکثر بادشاہ خود میدان میں جاکر سپاہیوں کی مشق ملاحظہ فرماتے اور کئی کئی گھنٹے دھوپ میں کھڑے رہتے اور کبھی کبھی خوش ہوکر بعض سپاہیوں کو انعام بھی دیتے تھے۔ بادشاہ کا یہ احساسِ بیداری کمپنی کے خیال میں مفید نہ تھا اس لئے بقولِ صاحبِ تاریخ نادر العصر ایک دن نواب علی نقی خاں نے عرض کیا کہ یہ امر رزیڈینٹ کے خلافِ مزاج ہے۔ بالآخر بادشاہ نے بددل ہوکر اپنی تمام تر توجہ اس طرف سے ہٹائی۔ قریب قریب اسی زمانے میں بادشاہ نے اپنے نظامِ حکومت میں بعض اصلاحیں تجویز کی تھیں جن کو ۱۸۴۸ء میں کرنل رچمنڈ رزیڈینٹ نے مسٹر تھومسن گورنر صوبہ جاتِ شمالی و مغربی کی سفارش کے ساتھ گورنر جنرل کے پاس بھیج دیا تھا لیکن وہاں سے اس کا جواب بڑا مایوس کن آیا تھا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ملکِ اودھ پر پہلے ہی سے لارڈ ڈلہوزی

کا دانت تھا۔ چنانچہ حسب ارشادات گورنر جنرل یکم دسمبر ۱۸۴۹ء کو کرنل سلیمین (رزیڈینٹ) ملک اودھ کے خصوصی دورے پر روانہ ہوا تاکہ اودھ کی ضبطی کے لئے کچھ تاویلیں فراہم کرسکے۔ رزیڈینٹ کا یہ دورہ اُس کے اختیارات کی حدود سے سراسر متجاوز تھا چنانچہ سرارسکن پیری Sir Erskin Perry اپنی کتاب برڈس آئی ویو اون انڈیا (Bird's Eye View on India) میں اس دورے کی حیثیت پر ان الفاظ میں روشنی ڈالتے ہیں،

"کرنل سلیمین رزیڈینٹ نے گورنر جنرل کو مجبور کیا کہ اُنہیں تمام صوبے کے دورے کی اجازت دی جائے۔ چنانچہ وہ گذشتہ تین ماہ سے اس کام میں معروف ہیں۔ اس دوران میں وہ تمام حلقوں کو اشتعال دے کر اُن سے درخواستیں اور اپیلیں حاصل کررہے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ دیسی حکومت کے ساتھ یہ بڑی غیر معمولی مداخلت ہے جو کسی بھی عہد نامے کی رُو سے جائز نہیں بلکہ میثاق اور عہد کے قطعی خلاف ہے۔" [۱]

بادشاہ نے خود بھی اودھ بلو بُک (Blue Book) کے جواب میں لکھا تھا کہ یہ دورہ رزیڈینٹ کے اختیارات سے باہر ایک نئی چیز تھا مگر ہم نے اس کی اجازت دے دی اور کثیر رقم اس پر خرچ کی تاہم نتیجہ وہی نکلا جس کی توقع تھی یعنی سلیمین صاحب نے لارڈ ڈلہوزی کے حسب منشاء نتائج اخذ کئے۔ شکائتی درخواستوں کے متعلق واجد علی شاہ لکھتے ہیں کہ تین مہینے کے سفر میں صرف پچیس عرضیاں گزریں اگر ہمارا بھی کوئی حاکم دورہ کرتا ہے تو اس سے زیادہ ہی درخواستیں گذرتی ہیں [۲]

رزیڈینٹ کا عمل دخل دربار اودھ میں یہاں تک بڑھ گیا تھا کہ بادشاہ اُس کی مرضی کے بغیر خفیف سے خفیف کام بھی نہیں کر سکتے تھے اس کی ایک مثال صاحب سیر المحتشم نے یہ دی ہے کہ دربار لکھنؤ کا شاہی تخت جسے غازی الدین حیدر نے کئی کروڑ روپے میں تیار کرایا تھا واجد علی شاہ نے چاہا کہ اُسے کوٹھی فرح بخش سے "قیصر باغ" میں منتقل کرلیا جائے لیکن رزیڈینٹ کی اجازت حاصل نہ ہوسکنے کی وجہ سے اتنا معمولی سا کام بھی بادشاہ سے

ممکن نہ ہو سکا [۱] رزیڈینٹ کے اسی اثر کی وجہ سے بہت سے کام ایسے بھی ہوئے کہ جو بادشاہ کی مرضی کے سراسر خلاف تھے مثلاً مرزا وصی علی خاں شہر بدر ہوئے اور بادشاہ کے بعض مصاحبین کو برطرف بھی کر دیا گیا۔ یہی وہ اسباب تھے جن کی وجہ سے نوعمر بادشاہ بہت جلد اپنی بیدار مغزی سے دست بردار ہو گئے، اسی اُلجھن میں اُن پر صفر ۱۲۶۵ھ/۱۸۴۸ء میں خفقان کا شدید دورہ پڑا۔ اس زمانہ میں تمام پری خانہ برباد ہو گیا۔ گویئے، بھڑیئے ملازمت سے برطرف کر دیئے گئے۔ سب سلیمانی سازو سامان تلف ہو گیا [۲]

بادشاہ کو شاعری، موسیقی، جلسہ جلوس، عمارات سازی اور تیاریِ باغ کا بڑا شوق تھا۔ اُنہوں نے شعر و نغمہ کے بہت سے ماہرین کی سرپرستی بھی کی اور موسیقی کے جلسے اور رہس بھی منعقد کئے، اور کئی باغ اور خوبصورت عمارتیں بنوائیں۔ اُن کا تعمیر کردہ "قیصر باغ" اگرچہ آصف الدولہ کی عمارات کے مقابلہ میں ناپائیدار اور کمتر تھا لیکن اپنی خوبصورتی، رعنائی اور احساسِ ضرورت کے لحاظ سے یہ یقیناً بہتر تھا۔ اس کا نقشہ اب بگڑ چکا ہے کچھ حصے برباد ہو چکے ہیں لیکن اس کے کھنڈر ابھی تک اودھ کی عظمت و شکوہ کی داستان دُہرا رہے ہیں اور آنکھیں اُن مناظر کو ڈھونڈھتی ہیں جو روایتی طور پر ان عمارات سے منسُوب ہیں۔ "قیصر باغ" کا میلہ بھی اُن یادگار مناظر میں سے ایک تھا۔ اس میلے کا سببِ انعقاد یہ بتایا جاتا ہے کہ واجد علی شاہ کی والدہ نے اُن کی چھٹی کے موقع پر اُنہیں "جوگیا لباس" پہنایا تھا جس کی سالگرہ منّت کے طور پر اسی لباس میں ہوتی تھی۔ بادشاہ نے "قیصر باغ" کی تکمیل پر اس تقریبِ سالگرہ کو جشنِ عامّہ کی صورت دے دی تھی اور یہ طے پا گیا تھا کہ اس میلے میں جو لوگ شریک ہوں وہ تمام جوگیا لباس ہی میں آئیں۔ چنانچہ خلقت کو شگرفی لباس پہن کر میلے کے بہانے سے اپنے بادشاہ کے محل کی شان و شوکت، آراستگی اور اندازِ زندگی کے دیکھنے کا موقع مل جاتا تھا۔ یہ سلسلہ تین دن تک برابر قائم رہتا تھا اور بہت سی دلچسپیوں، تماشوں اور تفریح کے مشغلوں کے علاوہ بادشاہ کی طرف سے عام لوگوں کی دعوت بھی ہوتی تھی۔ کسی شاعر نے اس میلے کی تاریخ اس طرح نظم کی تھی

بقصر باغ چوں سُلطانِ عالم — نمودہ میلۂ رنگین و نادر
پئے تاریخ ایں فرخندہ جلسہ — ندا آمد نشاط افزائے خاطر
۱۲۶۹ھ

لکھنؤ کی زندگی اس نہج پر چل رہی تھی جب کرنل سلیمین نے لارڈ ڈلہوزی کے حسبِ منشاء بعض جھوٹے الزامات کی ایک فرد مُرتّب کی اور پھر اُن کے جانشین جنرل آؤٹرم نے اپنی مُہرِ تصدیق ثبت کرکے اودھ کی تقدیر کا فیصلہ کورٹ آف ڈائرکٹرز کے ہاتھوں میں دے دیا۔ اس کا نتیجہ وہی نکلا جس کا نقشہ کمپنی نے ۱۸۳۷ء کے صلح نامے کی صورت میں تیار کیا تھا اور اپنی حکمتِ عملی سے بادشاہ محمد علی شاہ سے اُس پر دستخط کرائے تھے یعنی اودھ کی سلطنت بحقِ سرکارِ برطانیہ ضبط کرلی گئی۔

سرجان کے (Sir John Kaye) کے الفاظ ہیں کہ ہم لوگوں میں یہ رسم ہے کہ پہلے کسی دیسی حکمران کی حکومت پر قبضہ کرتے ہیں اور پھر معزول فرماں روا یا اُس کے جانشین کو جی کھول کر بدنام کرتے ہیں۔ اس انگریزی دستور کی زد میں یوں تو ستارا، جھانسی، سنبھل پور، تنجور، کرناٹک وغیرہ بہت سی ریاستیں آئیں مگر حقیقت یہ ہے کہ انگریزی پروپیگنڈے کی تمام بارود اُودھ پر ختم ہوئی کیوں کہ انگریز کے خلاف غدر کی علمبرداری پوربی سپاہیوں نے کی تھی اور چونکہ انتزاعِ سلطنت واجد علی شاہ کے عہد میں ہوا تھا اس لئے خصوصیت کے ساتھ وہی اس کا نشانہ بھی بنے اور تمام الزامات کے ذمہ دار بھی ٹھہرائے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کا کردار عوام کی نگاہ میں کچھ ایسا عجوبہ بن گیا کہ جس کی نظیر تمام دنیا کی تاریخ میں نظر نہیں آتی۔

اس میں شک نہیں کہ وہ قدرت کی طرف سے بڑا قوی جمالیاتی احساس لے کر آئے تھے اور حسین عورتوں کی پسندیدگی کا ایک رچا ہوا ذوق اُن کی فطرت میں شامل تھا۔ نئی نئی جوانی تھی اس لئے ولیعہدی کے زمانے میں ہر حسین عورت اُن کی نشاطِ زندگی میں ایک حصّہ رکھتی تھی۔ اُن کا پری خانہ، عورتوں کی فوج، رہس کے طائفے اور مصاحبات کے حلقے وغیرہ سب چیزوں سے اُن کی طبیعت کے لوچ اور حُسن سے گہری دلچسپی کا پتہ چلتا ہے لیکن لوگ یہ ظلم کرتے ہیں

کہ اُن کے زمانۂ شہزادگی کے مشاغل کو اُن کے دَورِ بادشاہت سے منسوب کر دیتے ہیں، اور یہ نہیں محسوس کرتے کہ خود بادشاہ نے تاریخ پریخانہ میں چھبیس سال کی عمر میں اپنا یہ تجربہ عوام تک پہنچایا ہے کہ "اُمیدوار ہوں یہ بے وفائی نامہ جو کوئی ملاحظہ فرمائے عورتوں کی محبت سے باز رہے اور اپنا روپیہ ان میں تلف کرے کیونکہ اس کا جو انجام ہوتا ہے ظاہر ہے۔ یہ لوگ اگر حضرت یوسفؑ کو بھی پائیں تو اپنی بے وفائی سے ہاتھ نہ اُٹھائیں۔ لہٰذا ان لوگوں سے کنارہ کرنا بہت اچھا ہے۔ مجھ جیسے بادشاہ خوبصورت وخوب سیرت کے ساتھ جس کی صفت وثنا میں کتابیں بھری ہوئی ہیں باوجودِ اطاعت نہ ڈریں تو دوسروں کو ان سے کیا اُمید ہو سکتی ہے۔" [1] یہ رائے طوائفوں اور دوسرے درجے کی عورتوں سے متعلق ہے لیکن یہ واقعہ ہے کہ اُنہیں اپنی محبوب بیگمات سے ہمیشہ ایک گہری دلچسپی رہی جس کا ثبوت "مثنوی حُزنِ اختر" سے بھی مِل جاتا ہے۔ بادشاہ فورٹ ولیم میں قید ہیں۔ دُنیا کے انقلاب کا جان کاہ منظر اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ جو فرماں روا تھا، آج قید خانے کی تاریکیوں میں مصائب برداشت کر رہا ہے لیکن جہاں پناہ کی حُسن پرست طبیعت کو اگر یہاں بھی کوئی غم ہے تو بیگمات سے چھُوٹنے کا۔ قید میں بھی یادگارِ محبّت کے طور پر کبھی دلدار محل سے اُن کی مِسّی مانگتے ہیں، کبھی اختر محل سے اُن کی زُلفوں کے بال منگواتے ہیں اور کبھی جعفری بیگم سے اُن کی دُلائی اور دوپٹہ طلب کرتے ہیں اور ان سب چیزوں سے ایسا لطف لیتے ہیں جیسے واقعی کوئی دیوانۂ عشق، محبوب کی چیزوں سے لُطف لیتا ہے۔ مولانا شرر اپنے آغازِ شعور میں مٹیا برج میں معزول بادشاہ کے سایۂ عاطفت میں رہے تھے۔ وہ بھی ان کی پاکیزگیٔ نفس کے متعلق عینی شہادت دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ واجد علی شاہ کی ذات میں اگلی اسلامی معاشرت کی اصلی تصویر نظر آتی تھی جو انگریزیت کے غارت کرنے والے اثر سے معرا تھی۔ اُن کی وضع و لباس، اطوار، معاشرت اور مذاقِ سخن کو خدا نے موجودہ عالمِ کون و فساد کی خرابیوں سے بالکل محفوظ و مصئون رکھا تھا۔ تہذیب تھی، دینداری تھی، قدردانی تھی اور انتہا درجے

کی قناعت و خود فراموشی۔ لوگوں میں شہرت ہے کہ عیش پرستی نے اُن کو زناکاری میں مُبتلا کردیا تھا مگر عہدِ شاہی کے واجد علی شاہ کو میں نہیں جانتا۔ مٹیا برج کے واجد علی شاہ جن کو میں نے آنکھوں سے دیکھا وہ تو اِتقّا و پرہیزگاری، خدا ترسی اور خدا پرستی کی مجسّم تصویر تھے [۱]

شرر لکھتے ہیں کہ واجد علی شاہ کا علمی مذاق نہایت ہی پاکیزہ اور اعلیٰ درجے کا تھا اور دراصل اُن میں دُو ہی ذوق تھے، ایک ادب و شاعری کا اور دوسرا موسیقی کا۔ اس کے سوا اور کسی چیز کا شوق اُن میں نظر نہیں آتا۔ اُن کی علمی استعداد بہت بڑھی ہوئی تھی۔ عربی کے تو عالم نہ تھے مگر فارسی میں اُن کا درجہ شاید ابوالفضل سے کچھ ہی کم ہوگا۔ میز پر بیٹھنے کی عادت نہ تھی اور نہ لکھنے کی قدیم نشست کی قید کو برداشت کر سکتے تھے۔ لیٹ جاتے اور لکھنا شروع کر دیتے تو دم بھر میں دُو دُو چار چار بند کی نثریں لکھ ڈالتے جو مشہور و نامور نثارانِ فارسی کے کمال کو یاد دلا دیتیں۔ رفعت الدولہ اور لائق الدولہ کے ایسے صاحبِ کمال نثر نگار وابستۂ دامانِ دولت تھے۔ ممکن تھا کہ وہ لوگ جدّوجہد اور تکلیف کے بعد اُن سے اچھی نثر لکھ لیں مگر جس خوبی کے ساتھ قلم برداشتہ واجد علی شاہ لکھ دیتے، میرے خیال میں کسی سے ممکن نہ تھا۔ یہی حالت نظم کی تھی۔ طبیعت اس قدر موزوں پائی تھی کہ شاید ایسا موزوں طبع نہ دیکھا ہوگا۔ میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا کہ اپنے دائرۂ دولت، سُلطان خانے سے بوچے پر سوار ہو کر امام باڑہ سبطین آباد کی مجلس میں شریک ہونے کے لئے روانہ ہوئے اور جو مرثیہ و سلام وہاں پڑھیں گے اُنہیں راستہ میں تصنیف کر رہے ہیں۔ دُو کاتب ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ ایک کو مرثیہ کے بند تصنیف کر کے لکھواتے ہیں اور دوسرے کو سلام کے اشعار۔ مرثیہ لکھنے والا جب تک مرثیے کا بتایا ہوا بند لکھے سلام لکھنے والے کو سلام کا شعر بتاتے ہیں اور دونوں کو اس قدر جلد جلد بتاتے جاتے ہیں کہ ایک کا بھی قلم نہیں رُکنے پاتا۔ امام باڑہ دُو فرلانگ بھی نہ ہوگا مگر وہاں تک پہنچتے پہنچتے پورا سلام اور مرثیہ کے چھ بند لکھوا دیئے۔ دُو

---

(۱) زنل سلسلہ میں عبدالحلیم شرر صاحب کی دوسری کتاب گذشتہ لکھنؤ صفحہ ۷۵ شائع کردہ نفیس اکیڈمی کراچی

مختلف بحروں میں ایک ساتھ طبع آزمائی کرنا جس قدر دشوار امر ہے اُس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو شعر کہنے کی مشکلوں سے واقف ہیں۔ حضرت جانِ عالم نے سیکڑوں مرثیے اور سلام کہہ ڈالے اور اتنی کتابیں نظم اور نثر میں تصنیف کر دیں کہ اُن کا شمار بھی شاید آج کسی کو نہ معلوم ہوگا۔ اور سب کی تصنیف میں یہی شانِ برجستگی اور قلم برداشتگی تھی۔ سوچنا اور گھنٹوں فکر کرنا اس سے اُن کا دماغ آشنا ہی نہ تھا [۱] واجد علی شاہ نے اپنی کتاب "بنی" میں اپنی محض اُن تصانیف کی تعداد چھیالیس بتائی ہے جو تزلزلِ سلطنت اور غارتِ بدمعاشاں میں تاراج ہونے سے بچ گئی تھیں۔

زوالِ اودھ کے اسباب

جب کوئی قوم بیدار ہوتی ہے تو اُس میں جلالی عنصر جمالیات سے قوی تر ہوتا ہے لیکن جب وہ مٹنے لگتی ہے تو اپنے شجاعانہ مشاغل چھوڑ کر درباداری اور عیش پرستی کی طرف جھک جاتی ہے۔ گویا زندگی کے مختلف شعبوں کی اہمیت کا توازن بگڑ جاتا ہے اور وہ کسی ایک پہلو پر زیادہ زور دینے لگتی ہے جس کی وجہ سے قوم کی زندگی انحطاط کی طرف بڑھ جاتی ہے۔ جب تک یہ توازن دوبارہ حاصل نہ ہو تب تک قوم کا سنبھلنا ناممکن ہوتا ہے۔ سلطنتِ اودھ بھی حیات کے اسی اصول کی زد میں آکر فنا ہو گئی۔ عیش و عشرت کا بڑھا ہوا رجحان یوں تو شجاع الدولہ ہی کے عہد سے ملتا ہے لیکن وہ بڑے حوصلہ مند اور تجربہ کار سپاہی تھے۔ اُنہوں نے جنگِ بکسر کے بعد اپنے آپ کو بہت کچھ سنبھال لیا تھا جس کی وجہ سے وہ توازن اُنہیں پھر ہاتھ آگیا تھا جو بقائے قوت کے لئے ضروری تھا۔ لیکن آصف الدولہ کے زمانے سے زندگی کا صرف ایک ہی پہلو یعنی جمالیاتی ذوق، نگاہ کے سامنے رہ گیا تھا۔ یہ سلسلہ تھوڑے بہت فرق کے ساتھ واجد علی شاہ تک چلتا ہی رہا۔ اس تمام زمانے میں لکھنؤ کی زندگی اپنے عہد کے سیاسی اور تمدنی تقاضوں سے بے خبر رہی۔ شہزادوں اور نوابوں کی تعلیم، قدیم مشرقی اسلوب پر ہی ہوتی رہی اس لئے انہیں علم ہی نہ ہو سکا کہ مادی تغیرات نے اشیاء کی اقدار کا قدیم تصور بدل دیا ہے۔ اگر وہ اِس نکتے سے آشنا ہو کر زمانے سے مصالحت کر لیتے تو اُن کا زوال

اتنا جلدی نہ ہوتا۔ حرفتی تمدن کا اُٹھان جو کمپنی کی حمایت میں فروغ پاتا جارہا تھا اپنے حریف یعنی جاگیر داری نظام کو برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ وہ دوسری بات ہے کہ خود انگریز ہی کو کچھ زمانے بعد بہ مصلحت اپنے استحکام کے لئے اپنے تمدن کی رفتار دھیمی کرکے جاگیر دارانہ قدروں کی ہمت افزائی کرنی پڑی تھی۔ لیکن جوں جوں انگریز کے قدم مضبوط ہوتے گئے وہ اَوَدھ پر اپنی دست درازی قوی سے قوی تر کرتا گیا۔ وہ رفتہ رفتہ پچھلے عہد نامے منسوخ کرکے نئی مراعات حاصل کرتا رہا۔ شجاع الدولہ کے زمانے میں جب انگریز کی سیاسی حیثیت غیر محفوظ تھی، اُس نے شکست خوردہ نواب کو اپنے ہاتھ سے مُلک دے دیا تھا لیکن آصف الدولہ کے زمانے میں جب اُس کا خطرہ کم ہوگیا تو اُس نے اپنے اختیارات پھر بڑھا لئے تھے اسی طرح سعادت علی خان کے زمانے میں جب اُسے کوئی خدشہ باقی نہ رہا تو اُس نے نصف مُلک کا مطالبہ کردیا۔ غازی الدین حیدر کے زمانے میں جنگِ برما اور جنگِ نیپال کے لئے اُسے مالی امداد کی سخت ضرورت تھی۔ نوابِ اَوَدھ نے دُو کروڑ روپیہ قرض دے دیا تو اُس نے نواب وزیر کو شاہِ زمن تسلیم کرلیا۔ اور جب یہ ضرورت پوری ہوگئی اور احسان کا بوجھ لوگوں کی نگاہوں سے محو ہوگیا تو پھر محمد علی شاہ کے عہد میں پورے مُلک کو ضبط کرلینے کا منصوبہ بنالیا۔ ایسی ہی زمانہ سازیوں اور بد عہدیوں کی وجہ سے اَوَدھ میں کمپنی کا اثر بڑھتا اور نواب کے اختیارات گھٹتے رہے۔ کمپنی کی ان دست درازیوں کے مقابلہ میں فریقِ ثانی کا رویہ ایسا وفادارانہ رہا کہ کبھی کبھی تو حق گو انگریزوں کو بھی اُن پر رحم آگیا چنانچہ میجر لو لکھتے ہیں:

> "گزشتہ تیس سال میں اَوَدھ کی مبہمہ بدانتظامی کے متعلق اخبارات میں بہت کچھ شائع ہوچکا ہے لیکن دوسری سمت سے کوئی لکھنے والا یا اس غلط بیانی کی وضاحت کرنے والا نہیں ہے۔ مزید برآں میرے ہم وطنوں میں جو دیسی ریاستوں میں کبھی نہیں گھومے یہ عام عادت ہے کہ اُن ریاستوں کے استبداد کا تمام الزام اُن کے حکمرانوں پر رکھتے ہیں۔ یہ بات اکثر میرے ذاتی علم میں آئی ہے کہ شاہانِ اَوَدھ، انگریزی سوسائٹی میں رعایا کے

بے درد حاکم کی حیثیت سے منسوب کئے جاتے ہیں، جن کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ وہ
برطانوی حکومت کی حفاظت و حمایت کے جواب میں شکر گزاری کے جذبات نہیں
رکھتے۔ اس قسم کے کلمات حقیقت میں نادرست ہیں۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ انہوں نے
اپنے ذاتی کاروبار کو بہت بے انتظامی سے رکھا لیکن ہماری طرف اُن کا عام رویہ ایک
سمت تو ہماری گورنمنٹ کے مفید مطلب حلیف کی حیثیت سے اور دوسری طرف ایک
ایسے بادشاہ کی حیثیت سے جس نے ہمارے سرکاری عہدہ جات کے ساتھ تعلق کو عام
انداز پر دلچسپی، ملائمت اور دوستانہ طریقہ سے قائم رکھا غیر معمولی طور پر قابلِ ستائش ہے۔"[1]

لکھنؤ میں رزیڈنٹ کی موجودگی بھی ملکی انتظام کی خرابی اور اودھ کے زوال کا باعث
ہوئی۔ دیسی ریاستوں کے لئے طریقِ معاونت (Subsidiary Policy) کا سب سے کامیاب
حربہ رزیڈنٹ کا قیام تھا۔ اول اول وہ ریاست اور کمپنی کے درمیان خوشگوار تعلقات قائم
کرانے کا ذریعہ محسوس ہوتا تھا لیکن رفتہ رفتہ انگریز پالیسی اس کا اثر و اقتدار بڑھاتی
رہی اور ایک دن خود بادشاہ ہی اس کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن گئے۔ ایسی حالت میں اگر
ملک کے اندر کوئی بدنظمی ہوتی تو اس کا ذمہ دار محض بادشاہ ہی نہیں رزیڈنٹ بھی ٹھہرتا
لیکن بدقسمتی سے سارا الزام مجبور نوابین پر تھوپ دیا جاتا تھا۔ سر ہنری لارنس کا خیال ہے
کہ اودھ کے حکمران اُن فرمانرواؤں سے کسی صورت میں بُرے نہ تھے جو عام طور پر ایسے
حالات میں ہوا کرتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ وہ توقع سے کہیں زیادہ بہتر تھے۔۔۔۔
اودھ کے وزرائے سلطنت میں بھی ایسے قابل لوگ موجود تھے جیسے عموماً مشرق میں پائے
جاتے ہیں اور رزیڈنٹ صاحبان میں بھی اچھے اور عمدہ لوگوں کی کمی نہ تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ
سارا قصور رائج الوقت نظام کا تھا، نہ کہ آلہائے کار کا۔"[2]

اودھ کے حکمرانوں کی بے بسی اور رزیڈینٹ کی مداخلتِ بے جا کی متعدد مثالیں سیاسی

مراسلات میں محفوظ ہیں جن میں سے ایک دو کا تذکرہ یہاں بے محل نہ ہوگا۔ نواب سالار جنگ کے ایک بیٹے نواب قاسم علی خاں تھے جو سعادت علی خان کے عہد میں سید انشاء کی چھیڑ چھاڑ سے ناراض ہوکر دربار سے چلے گئے تھے۔ اُنہوں نے پھر کبھی اُدھر کا رُخ نہ کیا۔ وہ انگریزوں کے دوست اور رزیڈینٹ کے متوسلین میں سے تھے اس لئے رزیڈنسی میں باقاعدگی سے حاضر ہوا کرتے تھے۔ ایک دن اُن کے ملازم میرن نے ایک شخص کو قتل کردیا اور خود جان بچانے کے لئے اپنے ولیِ نعمت کے مکان میں جا چھپا۔ سرکاری سپاہی جب اُس کی گرفتاری کے لئے نواب قاسم علی خاں کے مکاں پر گئے تو رزیڈینٹ نے مداخلت کی اور مرزا جعفر کو بھیج کر سعادت علی خاں کو تنبیہہ کرائی اور ایک توپ دے کر ایک کمپنی قاسم علی خان کے مکان کی حفاظت کے لئے بھیج دی۔ اِسی طرح کا ایک واقعہ یہ ہے کہ تحسین علی خاں ایک نومسلم خواجہ سرا کمپنی کا بڑا خیر خواہ تھا۔ وہ لاولد مرگیا تھا۔ اودھ کے قانون کے مطابق لاوارث شخص کی جائداد نزولِ سرکار ہوجاتی تھی اس لئے نواب وزیر نے ضبطیِ املاک کا حکم دے دیا۔ رزیڈینٹ نے یہاں بھی مداخلت کی [۱] غرض اس طرح سے اپنی ریاست کی حدود میں نواب کی سُبکی ہوتی رہتی تھی۔ ایم ایس مہتا نے اپنے تحقیقی مقالے میں رزیڈنٹ بیلی کے اُس خط کا بھی کچھ حصّہ نقل کیا ہے جس میں اُس نے نواب سعادت علی خاں سے مطالبہ کیا تھا کہ آپ نے ایک ضلع ٹھیکے پر دے دیا ہے، ایک نئی عدالت قائم کرلی ہے، پولیس کے ایک شعبے میں کچھ اصلاح اور ترمیم کی ہے۔ یہ سب امور ایسے ہیں جن کے لئے پہلے سے جاری گورنمنٹ کی منظوری لینی ضروری تھی۔ مہتا لکھتے ہیں کہ نواب کے خانگی مسائل سرپرستی اور درباریوں اور عہدہ داروں کی پنشن یا جاگیر کے عطیات تک میں دونوں حکومتوں کے مابین تلخ اور طویل اختلافات چلتے رہتے تھے اور ان پر عُذرداری عموماً فراست اور دانشوری کے خلاف ایسے انداز میں کی جاتی تھی کہ اُس سے نواب کے وقار کو اُس کی حدودِ ریاست ہی میں صدمہ پہنچتا تھا [۲] آنریبل فریڈرک جان شور "نوٹس آن انڈین افیرز" میں لکھتے ہیں کہ ہماری سول سروس کے اُن ممبر صاحب کا قصّہ کسے یاد نہ ہوگا جو اپنی بدعنوانیوں کی وجہ سے کمپنی کی ملازمت سے برخاست ہوگئے تھے اور جن کے

متعلق آئندہ ملازمت نہ دیئے جانے کا قطعی فیصلہ ہو چکا تھا۔ وہ گورنر جنرل کا سفارشی خط لے کر لکھنؤ پہنچ گئے۔ بادشاہ نے اس خط کو ایک حکم نامہ سمجھا اور یہ بات کسے یاد نہ ہوگی کہ ایک انگریز مغنی اور اُس کی بیوی کو ملازمت یا دوسرے الفاظ میں وظیفہ دلانے کے لئے لکھنؤ کے بدقسمت نواب پر اسی نوعیت کا اثر ڈالا گیا تھا۔ میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے کہ رزیڈینٹ نے ایک فرانسیسی کھلونا گراں قیمت پر خریدنے کے لئے بادشاہ کو مجبور کیا.... ایسا ہی اختیار اُس وقت استعمال کیا گیا کہ جب بادشاہ کو ایک انگریز کوچوان، انگریز باغبان، انگریز گویا اور ایسے ہی بعض دوسرے آدمی ملازم رکھنے کے لئے مجبور کیا گیا حالانکہ بادشاہ اُنہیں رکھنا نہیں چاہتے تھے[۱]

یہی صاحب ایک دوسرے موقع پر لکھتے ہیں کہ حقیقت میں ایسی باتوں کے لئے انگریزی حکومت ہی قابلِ الزام ہے۔ دیسی ریاستوں کے حکمرانوں کو شاگردوں کی طرح رکھا جاتا ہے اور قطعی اسکول کے بچوں کی طرح اُن سے برتاؤ ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں وہ اپنی عزتِ نفس اور عام آزادی جذبات کیسے قائم رکھ سکتے ہیں۔ گذشتہ چالیس سال سے اودھ کے ساتھ یہی معاملہ پیش آرہا ہے۔ اگر برطانیہ حکومت دیسی حکمرانوں کی تعلیم پر زور دیتی اور اُن کی برتری کو بہتر نصب العین کی طرف لگاکر عمدہ طریقہ حکومت کے شایان بنادیتی تو اُس کا یہ اقدام بہت کچھ توصیف و ستائش کا مستحق ہوتا لیکن اس کے برخلاف ہم دیکھتے ہیں کہ رزیڈینٹ کی مداخلت ہمیشہ برائیوں پر زور دینے کے لئے ہوتی ہے۔ لکھنؤ زیادہ سے زیادہ تین چار سال اور آزاد حکومت کی حیثیت سے رہ سکے گا۔ اُس وقت تک اگر بادشاہ کی عمر نے وفا کی تو وہ اپنا تمام پسماندہ خزانہ خالی کر چکیں گے اور چونکہ اُن کو اپنا طور طریق سنبھالنے کا ہوش نہ ہوگا اس لئے ہر طرف سے روپیے کی مانگ ہوگی جس کے نتیجے کے طور پر ہنگامہ بازیاں شروع ہو جائیں گی اور برطانیہ ملک پر اپنا قبضہ جماکر فیصلہ کردے گی [۲]

غرض لکھنؤ میں یہی دو عملی چل رہی تھی جیسی رزیڈنٹ کو حاکمِ اعلیٰ کا درجہ اور بادشاہ کو ماتحت کی حیثیت حاصل تھی بالآخر برطانیہ نے اودھ کو اپنی قلمرو میں شامل کرنے کا ارادہ کیا،

اس سلسلے میں پہلا قدم یہ تھا کہ ماہ اکتوبر ۱۸۴۷ء میں بادشاہ کو متنبّہ کیا گیا کہ اگر دو سال کے اندر اَوَدھ کا انتظام نمایاں طور پر بہتر نہ کر لیا گیا تو کمپنی اس سلطنت کو اپنی نگرانی میں لے لے گی۔ اس تنبیہ کے کچھ زمانے بعد یعنی ۱۶ ستمبر ۱۸۴۸ء کو ڈلہوزی نے کرنل سلیمین کو اُس کی تقرری کے متعلق جو خط لکھا تھا اُس سے بھی سلطنتِ اَوَدھ کو ضبط کر لینے کا منشاء صاف ظاہر ہوتا تھا گویا نئے رزیڈنٹ کا تقررِ ضبطیِ اَوَدھ کا پیش خیمہ تھا۔ اُس خط سے اس اَمر کا اندازہ ہوتا تھا کہ آئندہ چند سال میں اَوَدھ پر کمپنی کا قبضہ ہو جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور ۱۸۵۶ء میں بدنظمی اور بدانتظامیِ مُلک کا بہانہ بنا کر واجد علی شاہ کو معزول کر دیا گیا (۲۹) اور اُن کے مُلک کو انگریزی قلمرو میں شامل کر لیا گیا۔ اب رہا یہ سوال کہ کیا واقعی مُلکِ اَوَدھ کا انتظام اس حد کو پہنچ گیا تھا کہ اُس کا الحاق کر لیا جاتا تو اس کے جواب میں شاہِ اَوَدھ کے سفیر مولوی مسیح الدین نے پوری کتاب (Oudh — Its Princes and Its Government) لکھی ہے جس میں اُن تمام الزامات کی تردید کی ہے جو سلطنتِ اَوَدھ پر بطورِ حیلۂ ضبطیِ مُلک عائد کئے گئے تھے۔ علاوہ ازیں بادشاہ نے خود بھی اَوَدھ "بلو بُک" (Blue Book) کا جواب دیا ہے۔ اُن کے جواب کی بُنیاد خصوصیت کے ساتھ دو باتوں پر ہے یعنی اوّل یہ کہ ۱۸۰۱ء کے صلح نامے کی رُو سے اَوَدھ کا الحاق خلافِ معاہدہ ہے۔ دوسرے یہ کہ مُلک کی بدنظمی کا الزام بالکل بے بنیاد ہے۔ واجد علی شاہ لکھتے ہیں:

"اظہارِ بربادی اور بدانتظامی ہمارے مُلک کی محض غلط ہے۔ شہر، قصبات اور دیہات سب آباد ہیں، بلکہ روز مرّہ آبادی میں ایزاد ہیں اور آمدنی اُسی طرح سے ہے جیسا کہ پچپن برس سے تھی۔ خدانخواستہ اگر مُلک برباد ہوتا بعد دو چار برس کے آمدنی میں نقص و فساد ہوتا۔ ایک دلیل کافی ہے واسطے ثبوت اس بات کے کہ ہمارے ایّام سلطنت میں رعایا راضی اور مُلک آباد و سرسبز رہا۔ ہم دعوےٰ کرتے ہیں کہ اگر اضلاع قریبہ یعنی کانپور، شاہجہان پور، فرخ آباد وغیرہ کو جو کہ عملداریِ سرکار کمپنی میں ہیں ساتھ ہمارے مُلک کے مقابل کیا جاوے بے شک رونق و سرسبزی ہمارے مُلک کی سب بات

(۲۹) اس سلسلے میں ملاحظہ ہو مضمون "واجد علی شاہ اختر" از مرزا علی اظہر

میں اُن اضلاع سے زیادہ ہوگی۔[۱]

ہم معزول بادشاہ کے بیان کی تائید میں سلیمین کے سفر نامہ ہی سے چند ایسے حصے منتخب کر کے پیش کرتے ہیں جن سے دونوں حصّوں کی سرسبزی اور خوشحالی کا فرق ظاہر ہو جائے گا۔

سلیمین لکھتا ہے:

۱۔ دریائے گنگا کے دوسری جانب ہمارے (برطانیہ کے) اضلاع میں فصل ایسی کمزور ہوتی ہے کہ اودھ کا مقابلہ نہیں کر سکتی (سفر نامۂ سلیمین جلد دوم صفحہ ۴۴)

۲۔ ہماری رعایا کی نگاہ میں ہماری (برطانیہ کی) عدالتیں سب سے کمزور ہیں۔

(سفر نامۂ سلیمین جلد دوم، صفحہ ۶۹)

۳۔ اودھ کے فوجی سپاہیوں کو پانچ روپے ماہوار تنخواہ ملتی ہے جب کہ ہمارے سپاہی سات روپے ماہوار پاتے ہیں لیکن یہ لوگ اودھ کی فوج ہی میں رہنا پسند کرتے ہیں حالانکہ وہاں پنشن اور بھتّے کا کوئی دستور نہیں ہے۔ (سفر نامۂ سلیمین، جلد دوم، صفحہ ۱۲۴)

۴۔ اودھ کے مسلمان شرفا رکسی مُلک میں بھی ملازم ہوں اپنے خاندان کو اودھ ہی میں رکھنا پسند کرتے ہیں اور خود بھی واپسی پر جو کما کر لائیں وہیں رہ کر خرچ کرنا چاہتے ہیں کیونکہ ہمارے مُلک کے مقابلہ میں اُن لوگوں کو یہاں ایک بہتر اور اپنے مزاج کے مطابق سوسائٹی مِل جاتی ہے اور اُن کے بچّوں کی تعلیم کے لئے بھی بہترین ذرائع موجود ہیں۔ علاوہ ازیں شاندار جلوس، مذہبی تقریبات اور دوسرے جاذبِ نظر نظارے بھی جن سے وہ اور اُن کے اعزّہ بلاصرفہ لطف اندوز ہو سکتے ہیں یہاں مِل جاتے ہیں کاکوری ایک معمولی سا قصبہ ہے جو لکھنؤ سے دس بارہ میل کے فاصلے پر ہوگا۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اُس کے تعلیم یافتہ لوگ ہمارے سِول محکمہ جات میں ہندوستان کے ہر شہر سے زیادہ ہیں اور شاندار عہدوں پر متعین ہیں۔

(سفر نامۂ سلیمین، جلد دوم، صفحہ ۱۰)

اب اودھ کے مقابلے میں بنگال کی حالت دیکھئے جہاں کمپنی بہادر ایک مُدّت سے

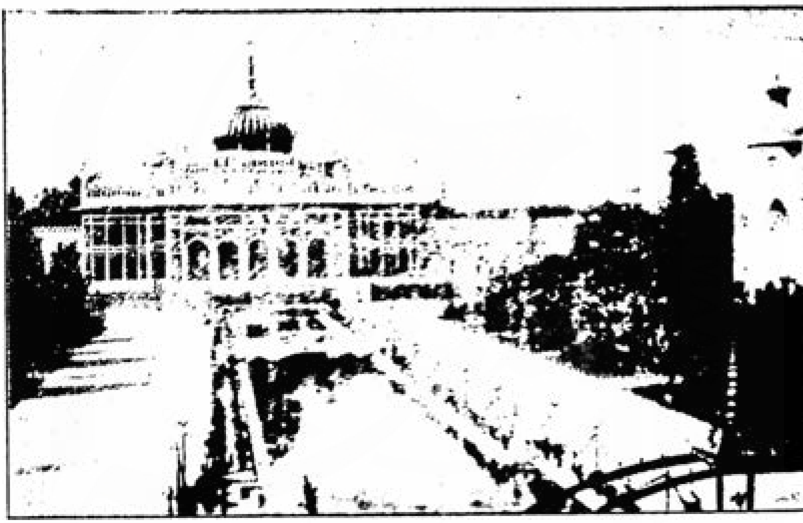
حکمرانی کرتی چلی آ رہی تھی۔

• بنگال جو سلطنتِ مغلیہ کا سب سے زرخیز اور خوش حال صوبہ تھا اور جسے سلطنتِ ہند کی پیداوار کا ذخیرہ کہا جاتا تھا، اُس کا اب یہ حال ہو گیا تھا کہ چند ہی دنوں میں غیر آباد ہو کر رہ گیا۔ کاشتکار زمینیں چھوڑ چھوڑ کر بھاگ گئے۔ زمینداروں کو کاشت کے لیے کاشتکاروں کی خوشامد کرنی پڑتی تھی۔ جدید نظامِ مالگذاری جس کی رُو سے نہایت سخت لگان عائد کیا گیا تھا اور اس پر عمل بھی نہایت سختی سے ہونے لگا تھا اکثر زمینداروں کی تباہی کا باعث ہوا [۱]

مقبوضاتِ برطانیہ کے لوگوں کی ہُنر مندی اور صنعت و حرفت اور اقتصادی حالت کی تباہی کا تذکرہ " بولٹ " نے اِن الفاظ میں کیا ہے۔ " ملک کے کاریگر اور دستکار فوق الادراک ظلم وستم کا شکار ہیں۔ درحقیقت کمپنی نے انہیں اپنا زرخرید غلام سمجھ رکھا ہے .... غریب جولاہوں پر طرح طرح کے بے شمار طریقوں سے ظلم کیا جاتا ہے۔ اور اس ظالم کا آلۂ کار کمپنی کے نمائندے اور گماشتے ہیں۔ ان بیکسوں پر جُرمانے کیے جاتے ہیں۔ انہیں قید کی سزائیں دی جاتی ہیں انہیں کوڑے لگوائے جاتے ہیں اور صرف اسی پر اکتفا نہیں کی جاتی بلکہ ان سے جبراً تمسک بھی لکھوائے جاتے ہیں۔ الغرض ایسے ہی ظلموں سے مُلک میں جولاہوں کی تعداد میں سخت کمی واقع ہو گئی ہے اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا ہے کہ پارچہ کی تجارت میں مال کی کمی، گرانی اور ابتری واقع ہو گئی ہے۔ مزید براں یہی بات مالگذاری میں ایک زبردست کمی کا باعث ہو گئی ہے [۲]

مختصر یہ کہ اودھ کی ضبطی کو وہاں کے فرماں رواؤں کی بدانتظامی یا مُلک کی تباہی یا رعایا کی بہبودی کا نتیجہ نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ یہ برطانیہ کی ہوسِ اقتدار کے منصوبے کی تکمیل تھی۔ اسے بھی ہندوستانی ریاستوں کے الحاق کے طویل سلسلے کی ایک کڑی سے تعبیر کرنا چاہیے۔ کیونکہ بعض ایسی ریاستیں بھی کسی نہ کسی بہانے سے ضرور ضبط کی گئیں جن پر بدانتظامی کا کوئی الزام نہ تھا۔ برطانیہ نے خود اپنے اعمالِ بد کی پردہ پوشی

کے لئے اودھ کے تمدن کی خرابیوں اور نوابوں کی زندگی کے قصوں کو ایسی رنگ آمیزی سے پیش کیا ہے کہ جس سے اودھ کے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں۔



حسین آباد۔ لکھنؤ

باب سوم

اَودھ کا تمدّن ۔ تہذیب اور ثقافت

امن واماں کے زمانے میں جب کوئی انسانی جماعت اپنے فرائض کا احساس کرتے ہوئے ترقی کی راہ پر گامزن ہوتی ہے تو اُسے باہمی میل جول سے بعض ایسی آسائشیں میسّر آجاتی ہیں جو انسان کی اجتماعی کوششوں کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ ان آسائشوں، مسرّتوں، اور ترقیوں کا مجموعہ تمدّن کہلاتا ہے۔ گویا تمدّن عبارت ہے اُس اجتماعی زندگی سے جس میں انسان مِل جُل کر رہتے ہیں اور اپنے اجتماعی فوائد کے پیشِ نظر بعض انفرادی حقوق سے دستبردار ہوجاتے ہیں۔ جب یہ اجتماعی آسائشیں ضروریاتِ زندگی کی حدود سے آگے بڑھتی ہیں تو ملکاتِ ذہنی کے استعمال کی وجہ سے معاشرت کے آداب قائم ہوتے ہیں اور ادبی، فلسفیانہ اور دوسرے تخیّلی مسائل پر بھی انسان کے خیالات دوڑنے لگتے ہیں۔ یہاں سے تمدّن، تہذیب کی صُورت اختیار کر لیتا ہے۔ اِس طور پر تمدّن، تہذیب اور ثقافت بڑی حد تک مترادف الفاظ ہیں اور بنی نوعِ انسان کی ترقی کی مختلف منزلوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ جب انسان نے خانہ بدوشی ترک کر کے عمرانی اور معاشی زندگی کی بنیاد رکھی تو اوّل زراعت، تجارت، آلاتِ حرب، مکانات اور ملبوسات وغیرہ کی ضرورت پیش آئی تھی۔ پھر رفتہ رفتہ انسان کا تخیّل آگے بڑھا اور ذہن کی پرداخت ہونے لگی تو آدابِ معاشرت، فلسفہ، مذہب اور فنونِ لطیفہ وجود میں آگئے۔ اس طرح تمدّن کی ارتقائی صورت، تہذیب و ثقافت بن گئی۔ گویا انسانی معاشرے کی ترقی یافتہ

صورت کو تمدن کہتے ہیں اور انسان کے اطوار، مذاق اور دماغ کی تربیت کا نام تہذیب ہے۔
نٹ کا خیال ہے کہ ہر انسان کے اندر ایک باطنی حاسۂ اخلاق موجود ہوتا ہے جو اُس کو بُرے
اور بھلے میں تمیز کرنا سکھاتا ہے۔ جب نیک و بد کا امتیاز قانون کی حدود میں ہوتا ہے تو تمدن
اُس سے نبٹ لیتا ہے۔ لیکن جہاں سے نیک و بد کے متعلق قانون کے بجائے حاسۂ اخلاق
فیصلہ صادر کرتا ہے وہاں سے تہذیب کی منزل شروع ہو جاتی ہے۔ اس لئے تمدن اور
تہذیب لازم و ملزوم نہیں ہیں کیونکہ بعض اوقات مادّی ترقی ذہنی ترقی کا ساتھ نہیں دیتی۔
اس لئے یہ ممکن ہے کہ کوئی متمدن قوم زیادہ مہذب نہ ہو یا کوئی زیادہ مہذب قوم زیادہ متمدن
نہ ہو۔ اِس نکتے کو اے۔ اے فیضی نے اپنی کتاب اسلامک کلچر میں فرانس اور امریکہ کی مثال
دے کر اس طرح واضح کیا ہے کہ فرانس ایک عظیم الشان اور نفیس تہذیب رکھتا ہے اُس کے
مقابلے میں امریکہ کے پاس تہذیب اُس معیار کی نہیں لیکن اُس کا تمدن فرانس سے کہیں زیادہ
عظیم اور ترقی یافتہ ہے۔ اسی طرح میتھو آرنلڈ نے لکھا ہے کہ اگرچہ موجودہ انگلستان کا تمدن بہت
ترقی پر ہے لیکن اس کے باوجود ایلزبتھ عہد کا انگلستان آج سے زیادہ مہذب تھا۔

بعض مغربی مفکّرین نے تہذیب کے ارتقاء کو بھی چند منزلوں میں تقسیم کیا ہے۔ اُن کا
خیال ہے کہ پہلی منزل میں کلچر مترادف تھا جانوروں کے پالنے، کاشتکاری کرنے اور صنعت و
تجارت کی ایسی چیزیں بنانے سے جو اِن کاموں میں مدد ثابت ہوتی تھیں۔ پھر دُوسری منزل
اُس وقت شروع ہوئی جب انسان نے تعلیم حاصل کر کے اپنے جسم اور ذہن کے ملکات اور
صفات کی پرداخت کی۔ یہاں کلچر اُس مقام پر پہنچ گیا جہاں اُس نے انسانی ذہن کی آسودگی کے
لئے فنونِ لطیفہ ایجاد کئے۔ اس کے بعد آخری منزل جسے حقیقت میں ثقافت کہنا چاہیئے اُس
وقت شروع ہوئی جب فنونِ لطیفہ وجود میں آ چکے تھے لیکن ذہنی تربیت کے ثمرات یعنی
ذوقِ سلیم، توازنِ ذہنی اور جمالیاتی اقدار پر حکم لگانے اور فیصلہ صادر کرنے کی ضرورت درپیش تھی۔
گویا ثقافت اُن ثمرات کا نام ہے جو تہذیب کی دُونوں منزلوں کے طے ہو جانے پر ہاتھ آتے ہیں۔

کلچر (تہذیب) کا لفظ موجودہ مفہوم میں سب سے پہلے گوئٹے نے استعمال کیا تھا۔ انسان دوست گوئٹے وسیع المشرب تھا اس لئے اُس نے تہذیب کی بُنیادی قدریں ایسی رکھی تھیں جو تمام بنی نوعِ انسان کی ہمدرد اور معاون ثابت ہوں۔ اُس کے یہاں رنگ و نسل کی حد بندیاں نہ تھیں۔ وہ عالمگیر انسانیت کی روشنی میں تہذیب کا تصوّر رکھتا تھا۔ اُس کے بعد جب میتھو آرنلڈ نے تہذیب کو تکمیل کی جستجو کا مترادف ٹھہرایا (Culture is the pursuit of perfection) تو اُس کا مفہوم بھی یہی تھا کہ انسان اپنے وراثتی تصورات اور رسومات سے بلند ہو کر دُنیا کا مطالعہ کرے اور جس جگہ جو بہترین چیز نظر آئے وہ اخذ کرلے۔ اسلامی تہذیب گوئٹے کے تصورات سے اس معنی میں ہم آہنگ ہے کہ یہ بھی ایک عالمگیر تصورِ حیات کی بنیاد پر تعمیر ہوئی ہے۔ مسلمانوں نے جو اچھی چیز جہاں دیکھی ہے اُسے اپنانے میں گریز نہیں کیا البتہ ہر جگہ اُسے اپنے مخصوص رنگ میں رنگ لیا ہے۔ مدعا یہ کہ اُنہوں نے اِس اخذ و تقلید میں اپنے معتقدات کا بھی لحاظ رکھا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اُن کی تہذیب میں مذہب کا رنگ گہرا ہے۔ یقیناً کسی اخلاقی نظام کے بغیر تہذیب کا وجود ممکن نہ ہوتا۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے بھی یہی خیال ظاہر کیا ہے کہ تہذیب اور مذہب ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں اور کوئی تہذیب مذہب سے تعلق رکھے بغیر نہ ظاہر ہو سکتی ہے اور نہ ارتقا پا سکتی ہے۔ میتھو آرنلڈ نے بھی اسی طور پر مذہب کو تہذیب کا لازمی جزو ٹھہرایا ہے یعنی مذہب، تہذیب کی اخلاقی تربیت کا کام سر انجام دیتا ہے اور اسے جذباتی رنگ بخشتا ہے۔ مختصر یہ کہ مسلمانوں کی زندگی میں چونکہ مذہب کو قدرِ اوّل حاصل رہی ہے اس لئے اُن کی تہذیب کے خدوخال میں مذہب کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو اخلاقی اصول مہد سے لحد تک ایک طریقۂ زندگی سکھاتے ہیں اُن کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اسلام کا ظہور جزیرہ نمائے عرب میں ہوا تھا جو سامی تہذیب روایات کا گہوارہ تھا۔ اس جزیرہ نما کی روشنی نے بابلی، اشوری، فنیقی اور عبری تہذیبوں کے چراغ روشن کرائے تھے اور

اسی میں یہودیت اور نصرانیت کے اخلاقی اور روحانی پیغام کے عناصر شامل ہو گئے تھے۔ اس طرح اسلام کو جو تہذیبی روایات ورثے میں مِلی تھیں وہ دُنیا کی پچھلی تہذیبوں کا نچوڑ تھیں پھر جب فتوحات کے بعد کرۂ ارض کی گرم پٹی میں اُس کا عمل دخل چین کی سرحد سے بحرِ اوقیانوس تک اور ہندوستان سے مراکش تک ہو گیا تو اسلام اُس قدیم تہذیب کا بھی وارث ہو گیا جو دجلہ وفرات کے کناروں، بحرِ ابیض کے مشرقی ساحلوں اور وادیِ نیل میں پایا جاتا تھا۔ اپنے عروج کے زمانے میں اسلامیوں نے ایران اور یونان کے تہذیبی سرمائے سے بھی فائدہ حاصل کیا۔ اس طرح اسلامی تہذیب خالص اسلامی نہ رہی بلکہ اُس میں زردشتی، نصرانی، یہودی اور ہندو اثرات بھی شامل ہو گئے۔ بارتھولڈ (Barthold) کا خیال ہے کہ اسلام کو دُنیا کے تجارتی راستوں پر قابض ہو جانے کی وجہ سے یہ موقع مِل گیا تھا کہ وہ دُنیا کی مختلف قوموں کے خیالات اور نقطہ ہائے نظر سے آشنا ہو جائے [۱] گویا اسی سہولت کی وجہ سے مُسلمان دُنیا کے بڑے حصّے پر حکومت کرتے رہے اور عرب، ایران، اسپین، مصر، تُرکی اور ہندوستان وغیرہ اُن کے زیرِ نگیں رہے۔ اِس طرح ان تمام ملکوں کی تہذیبی کاوشوں کا جوہر اُن تک پہنچ سکا۔ اُن کے درباروں میں بہت سے یہودی، نصرانی، زردشتی، اور ہندو بھی موجود تھے جو دُنیا بھر کے علمی ذخائر سے اُنہیں رُوشناس کرانے میں معاونت کرتے تھے چُنانچہ ان تمام مُلکوں کے علمی خزانوں سے فائدہ حاصل کر کے مسلمانوں میں ابونصر فارابی، بوعلی سینا، ابنِ رُشد اور ابُوریحان البیرونی وغیرہ مُفکّرین پیدا ہوئے۔

اسلامی تہذیب ایک وسیع موضوع ہے جس کی تفصیلات میں جانے کا یہاں موقع نہیں، لیکن مجموعی حیثیت سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلام نے قدیم تہذیبی روایات سے فائدہ بھی حاصل کیا اور فرسودہ سماجی تنظیم کو تبدیل بھی کیا۔ اُس نے مروّجہ سوسائٹی کے نقائص دُور کئے اور انسان دشمن تصورات کو مٹا دیا۔ اسلام نے دُنیا میں اخوت اور مساوات کی طرح ڈالی اور ایک ایسا نظامِ حکومت پیش کیا جو اس سے پہلے کے مذاہب کو معلوم نہ تھا۔ بقول پروفیسر حبیب شہنشاہیت

کے بجائے ایک کاروباری جماعت کی جمہوریہ (Working Class Republic) کا تصور اسلام ہی نے دُنیا کو دیا جس کا نمونہ مدینے کی ابتدائی حکومت کی صورت میں دُنیا کے سامنے آیا۔ یہ حکومت افرادِ ملت کے آپس کے غور و فکر اور عام اظہارِ خیال ہی سے چلائی جاتی تھی [۱] اب اسے آپ ہماری بدقسمتی کہہ لیجئے کہ آگے چل کر کامرانیوں کے نتیجے میں ہمارے اسلاف سے بنیادی اصولوں کی تعمیل میں ڈھیل ہونے لگی جس کی وجہ سے ایک حکمران جماعت یہاں بھی پیدا ہو گئی جس نے مذہب کو اپنے مقاصد کے مطابق استعمال کرنا شروع کر دیا۔ اس حکمران جماعت نے مذہب کی ایسی ایسی تاویلیں کیں کہ جن سے شہنشاہیت پھر سے زندہ ہو گئی۔ تاہم اس خود غرضی کے باوجود اسلام کے بنیادی اصُولوں کو نظر انداز کرنا اس شہنشاہیت سے بھی ممکن نہ ہو سکا چنانچہ جب مسلمان ہندوستان میں داخل ہوئے تو ہر چند کہ وہ شہنشاہیت کے علمبردار تھے لیکن خدا پر ایمان اور مساواتِ انسانی پھر بھی اُن کے نمایاں اصول رہے۔ اسی لئے محمود و ایاز میں اُن کے یہاں بہت کم فرق پایا جاتا تھا۔ چنانچہ ہندوستان میں اُن کا پہلا شاہی گھرانا غلام خاندان کے نام سے موسوم ہے۔ مسلمانوں سے قبل ہندوستان کی قدیم سوسائٹی اپنے نقائص کی وجہ سے گھن لگی ہوئی لکڑی کی طرح تھی۔ اُس کی ذاتوں میں تفریق تھی۔ ایک اونچی جماعت تہذیب کی ورثہ دار تھی۔ اسلام جو بندہ و آقا میں تفریق کا قائل نہ تھا جب ہندوستان میں داخل ہوا تو اُس نے مزدور اور پسماندہ طبقوں کو قانونی اور سماجی آزادی دے دی۔ اسی کشادہ دلی اور انسان دوستی میں اُس کی مقبولیت کا راز پنہاں تھا۔ اسی مساوات کی وجہ سے ہندوستان میں صرف ایک دو نہیں بلکہ خاندان کے خاندان اور نسلیں کی نسلیں مسلمان ہو گئیں۔ لیکن خود مسلمانوں پر بھی یہاں کی تہذیب کا ردِ عمل ہوا۔ ہندوستان میں کم و بیش چھ سات صدی تک اُن کا اقتدار برقرار رہا۔ جن میں سے کامل دو صدیاں مغلِ اعظم کی سرپرستی میں گذریں۔ اس مستحکم و مسلسل حکومت کے سائے میں اسلامی اور ہندو تہذیبی روایات ایک دوسرے میں جذب ہوتی رہیں جس کے نتیجے میں مسلمانوں کے تہذیبی اور تمدنی سرمائے میں ایک نیا سایہ اور ایک نئی چمک شامل ہو گئی۔ اس میں شک نہیں کہ اس میل جول کے باوجود اسلامی تہذیب کے

بنیادی عناصر تبدیل نہیں ہوئے اور نسلی مساوات، شہنشاہی مرکزی حکومت، انتظامی یکسانیت، طرزِ سپہ گری، وحدانیت کا عقیدہ اور معاد وحشر کے تصورات سب ویسے کے ویسے ہی رہے جن شعبوں میں ہندو اثرات قبول کئے گئے وہ فنِ تعمیر، صنعت گری اور فنونِ لطیفہ وغیرہ تھے۔ شادی بیاہ کے رسم و رواج، لباس و طعام اور گفتگو کے انداز میں بھی بعض تبدیلیاں واقع ہوئیں اور باہمی میل جول سے ایک نئی اور عام زبان جسے ہندی، ہندوی، ہندوستانی، ریختہ یا اُردو کہا جاتا ہے وجود میں آگئی۔

ہندوستان میں ہند اسلامی تہذیب کی یہ روایات اُس وقت تک پوری طرح کارگر رہیں۔ جب تک سلطنتِ دہلی کی سیاسی وحدت برقرار رہی۔ اُس زمانے میں ایران اور ترکستان سے بھی ہمارے مضبوط رشتے قائم تھے اس لئے وسطِ ایشیا سے علوم و فنون کے نئے نظریات اور نئی تخلیقات مُلک میں داخل ہوتی رہیں جن سے یہاں کے تہذیبی اداروں کی تجدید ہوتی رہی لیکن اورنگ زیب کی وفات سے پندرہ سال کے اندر ہی اندر جب متعدد کمزور بادشاہ قطار بنائے ہوئے تختِ سلطنت سے گذر گئے، مُلک کی سیاسی وحدت منتشر ہو گئی، مالی فراغت کی کمر ٹوٹ گئی، زوالِ سلطنت تہذیب کی تباہی کا پیش خیمہ بن گیا تو تہذیب و تمدن کا وہ مخصوص رنگ جو دربار کے ذریعے سے تمام مُلک کو ایک وحدت میں ڈھالتا جا رہا تھا۔ خود بخود ماند پڑ گیا اب تک عام طور پر گفتگو، لباس، خلعت، غذا، خطابات، آدابِ نشست و برخاست اور برتاؤ کے طریقوں میں دربار کے ذوق کو ملحوظ رکھا جاتا تھا لیکن اب درشت مزاج پٹھانوں، نیم مہذب مرہٹوں، کم علم سکھوں اور غیر متمدن جاٹوں کے رسم و رواج نے تہذیبی روایات میں اپنے عمل دخل سے کوئی معیار باقی نہ چھوڑا۔ ان حاکمانہ روایات کے تحفظ کے لئے ایک پُر امن علاقے کی ضرورت تھی وہ یا تو جنوب بعید میں دکن تھا یا مشرقِ قریب میں اَودھ تھا۔ اَودھ نے انگریزوں سے صلح کر کے کم از کم یہ اعتماد ضرور حاصل کر لیا تھا کہ روپیہ خواہ کتنا ہی صرف ہو لیکن مُلک بیرونی حملوں اور اندرونی خانہ جنگیوں سے محفوظ رہے گا۔ اس لئے اب فیض آباد اور لکھنؤ میں مسلمانوں

کے تباہ حال گھرانوں ہی کے لئے نہیں بلکہ دِلّی کے مجلسی آداب اور تہذیبی اطوار کے لئے بھی ایک جائے پناہ قائم ہو گئی تھی۔ گویا اسلامی جاگیر دارانہ روایات کو یہاں ایک گوشۂ امن میسر آ گیا تھا۔ دِلّی کے اثرات کی یہاں جو تجدید ہوئی وہ اُودھ کے مادّی وسائل کے عین مطابق تھی۔ لکھنؤ اپنے انصرامِ سلطنت، اختیارات، عہدوں، عہدہ داروں، اور درباری شان و شوکت کے لحاظ سے قدیم اور پُر شوکت دِلّی کا محض ایک مختصر نمونہ تھا کیونکہ یہ ہندوستان کی چودہ[۱۴] صوبوں کی عظیم سلطنت کے مقابلے میں صرف ایک ہی صوبے کا مرکز تھا۔ ایسی صورت میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اودھ نے اپنے محدود وسائل کے پیشِ نظر قدرے چھوٹے پیمانے پر نئی سجاوٹ کے ساتھ مشرقی تمدّن کا آخری نمونہ پیش کیا۔ اس تہذیبی احیاء میں تین بڑے عناصر ایسے تھے جنہوں نے لکھنؤ کی تہذیب کو ایک امتیازی حیثیت دے دی تھی۔ ان میں سب سے اہم عنصر یہاں کی خوشحالی تھا۔ اِس کے بعد مذہب کا ایک خاص انداز اور تیسرے نمبر پر اَوَدھ کی مقامی خصوصیات آتی تھیں۔ اِن عناصر کے اثرات کا جائزہ ہم آگے چل کر لیں گے۔ یہاں علیحدہ علیحدہ عنوانات کے ذیل میں اودھ کے تمدّن اور تہذیب کی کچھ تفصیلات بیان کرنا ہمارے پیشِ نظر ہے۔

جغرافیائی محلِ وقوع

ہندوستان کا قدیم مذہبی شہر اجودھیا جس کی دیرینہ تاریخ رامائن کے صفحات میں محفوظ ہے اکثر اَوَدھ بھی کہلاتا تھا۔ سنسکرت زبان کا یہ لفظ "وعدے یا پیمان" کا مفہوم ادا کرتا ہے جو حقیقت میں رامچندر جی کے ایفائے عہد کی طرف اشارہ ہے۔ اُن کے بن باس کے بعد اجودھیا کو عام طور پر اَوَدھ کہا جانے لگا تھا۔ رفتہ رفتہ وہ صُوبہ ہی اَوَدھ کے نام سے موسوم ہو گیا جس کا مرکز ریاست اجودھیا تھا۔ اسلامی عہد سے اَوَدھ اُس صوبے کا نام چلا آ رہا ہے جو دریائے گنگا کے سرسبز و زرخیز میدان کا ایک وسطی حصّہ ہے جس کا رقبہ تقریباً تئیس ہزار نو سو تیس (۲۳۹۳۰) مربع میل ہے۔

اَوَدھ کی آب و ہوا نہ بنگال کی طرح انتہائی مرطوب ہے اور نہ پنجاب کی طرح سردی اور گرمی کا انتہائی تضاد رکھتی ہے۔ یہاں دوپہر عموماً ملائم اور روشن ہوتا ہے اور رات اور صبح

میں کس قدر خُشکی ہوتی ہے۔ بارش کا سالانہ اَوسط چالیس۴۰ انچ ہے۔ اس علاقے میں اکتوبر سے مارچ تک چھ مہینے اپنی لطافت کے اعتبار سے سارے سال کی جان ہوتے ہیں۔ اس صُوبے کی زمین بھی اپنی زرخیزی کے لحاظ سے ہندوستان کی اچھی زمینوں میں شمار ہوتی ہے۔ تھوڑے سے اُوسَر علاقے کو چھوڑتے ہوئے جو تقریباً چھ فی صدی ہوگا باقی تمام زمین میں بہترین درخت اور عُمدہ فصلیں پیدا ہوتی ہیں۔ سلیمن کا خیال تھا کہ اَودھ کی تمام زمین جہاں تک سطح اور اشجار کا تعلق ہے ایک شریف آدمی کے خوبصورت پارک کی مانند ہے [۱] یہاں آب پاشی کے لئے دریائے گنگا، گومتی، گھاگرا، اور راپتی ہیں جن کے پانی کا نکاس بیس ہزار مکعب فٹ فی سکینڈ ہوتا ہے یہ دریا زمین کو زیادہ گہرا نہیں کاٹتے اس لئے پانی ہمیشہ سطحِ ساحل کے نزدیک رہتا ہے۔ اور زراعت کے لئے جتنی مقدار اور جس موسم میں ضرورت ہوتی ہے مِل سکتا ہے۔ دریاؤں کے علاوہ بہت سے تالاب اور جھیلوں سے بھی آبپاشی ہوتی ہے اور چونکہ سطحِ زمین سے پانی کی گہرائی زیادہ نہیں ہے اس لئے آب پاشی کے لئے عمدہ کنویں آسانی سے بن جاتے ہیں اور آب وہوا کے اعتدال کی وجہ سے یہاں سال میں تین فصلیں تیار ہوجاتی ہیں۔ اَودھ میں زراعتی علاقے کے علاوہ چوبیس جنگلات بھی تھے جو بہترین آب وہوا رکھتے تھے۔ ان کا رقبہ آٹھ سو چھیاسی ۸۸۶ مربع میل تھا۔ یہ جنگلات شکار کھیلنے، مچھلیاں پکڑنے، گھوڑوں اور جانوروں کے لئے چراگاہ کا کام دینے اور گھاس اور لکڑی مہیا کرنے کے لئے بہت مفید تھے [۲]

آبادی

مردم شماری کی متعدد رپورٹوں کا مقابلہ کرکے ڈاکٹر سرلیاستو نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ شجاع الدولہ کی وفات کے وقت اَوَدھ کی آبادی ایک کروڑ سے کچھ زیادہ تھی۔ ڈبلیو۔ سی۔ بنیٹ نے بھی اَودھ گزیٹیر کے دیباچے میں جو انتزاعِ سلطنت کے بعد تیار ہوا تھا اس حصّے کی آبادی قریب قریب یہی تجویز کی ہے اور یہاں کی اوسط آبادی کو بلجیم اور انگلستان کی اوسط آبادی فی مربع میل سے کہیں زیادہ بتایا ہے [۳] اس آبادی کا بیشتر حصّہ یعنی تقریباً بانوے فی صدی دیہات کے متعلق تھا اور شہروں اور بڑے قصبات کی تعداد نسبتاً کم تھی۔ ڈیڑھ

دو میل کے فاصلے سے چھوٹے دیہات آباد تھے اور پانچ پانچ چھ چھ میل کے فاصلے پر چھوٹے چھوٹے قصبات پائے جاتے تھے جنہیں بڑے گاؤں کی حیثیت حاصل تھی۔ یہ عموماً سڑکوں کے کنارے آباد تھے۔ ان میں بھی دیہات کی طرح بیشتر مکانات کچے ہی ہوتے تھے لیکن خوش حال کاشتکاروں، بڑے زمینداروں اور چند مہاجنوں کے مکان عموماً پختہ اور دو منزلہ تھے۔ یہ قصبات مضافات کے تجارتی مرکز تھے جن میں غلہ، کپڑا، مٹھائیاں، کھانے پینے کی دوسری چیزیں اور کچھ تانبے اور پیتل کے برتن وغیرہ فروخت ہوتے تھے۔ قصبات کے ہفتہ وار بازاروں میں آس پاس کے کچھ بساطی، حلوائی، کنجڑے، مرچی اور تمباکو فروش وغیرہ جمع ہو جاتے تھے جن سے رونق اور چہل پہل میں اضافہ ہو جاتا تھا۔

اودھ کی آبادی کا تین چوتھائی حصہ نیچی ذات کے ہندوؤں پر مشتمل تھا۔ باقی ایک چوتھائی میں مسلمان، برہمن اور راجپوت شامل تھے۔ مسلمانوں میں کچھ کاشتکار تھے جو تمام صوبے میں پھیلے ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ کچھ لوگ کپڑا بُننے کا کام کرتے تھے اور ایک اچھی تعداد سپہ گری یا سرکاری عہدہ داری کا پیشہ کرتی تھی۔ ان میں نمایاں حیثیت شیخ، پٹھان اور مغلوں کو حاصل تھی۔ شیخ زیادہ تر لکھنؤ، خیر آباد، کاکوری، فیض آباد، بلگرام اور گوپا مئو میں رہتے تھے۔ پٹھانوں کی آبادیاں خصوصیت کے ساتھ ملیح آباد، الٰہ آباد، فرخ آباد، روہیل کھنڈ اور جونپور وغیرہ میں تھیں۔ مغل یا ترک عموماً فوجی یا تجارتی کاروبار کرتے اور لکھنؤ یا فیض آباد میں رہتے تھے۔ برہمنوں میں کچھ فقیر فقرا، کچھ نجومی، کچھ مذہبی علوم کے جاننے والے اور دان پوجا پر گزارا کرنے والے تھے۔ بعض جاگیرداری یا سپہ گری کا پیشہ کرتے تھے۔ راجپوت اودھ کی سب سے نمایاں قوم تھی جو متعدد نسلوں سے تعلق رکھتی تھی۔ یہ لوگ تمام علاقے میں پھیلے ہوئے تھے۔ ان میں سے کچھ سپاہی، کچھ کاشتکار اور زیادہ بااثر لوگ جاگیردار یا زمیندار تھے۔ راجپوتوں کی پوری قوم رات دن آپس میں لڑتی جھگڑتی رہتی تھی اور کبھی کبھی حکومت کے افسروں تک سے نافرمانی کرتی تھی۔ کھتریوں کی تعداد کم تھی مگر یہ لوگ محکمہ مال کے افسر ہوتے تھے اور فارسی زبان کے ماہر سمجھے جاتے تھے۔ درمیانی قوموں میں ویش

جو عموماً اگروال تھے مہاجنی یا دکانداری کا کام کرتے تھے۔ کائستھ اپنے پیشے کے لحاظ سے منشی تھے جو فارسی اور حساب کے ماہر سمجھے جاتے تھے۔ ان کی تعداد اگرچہ کم تھی مگر عام طور پر تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے بہت نمایاں تھے۔ اہیر اور کرمی ذاتیں خصوصیت کے ساتھ زراعت پیشہ تھیں۔ پاسی قوم کے افراد یا تو سپہ گری کرتے تھے یا چوکیداری۔ لیکن سلیمن کا خیال ہے کہ یہ قوم جرائم پیشہ تھی اور ان کا آبائی کاروبار چوری یا ڈاکا ڈالنا تھا [۱] آج بھی صوبۂ متحدہ اور روہیل کھنڈ کے دیہات میں پاسی قوم کے لوگوں کو جرائم پیشہ خیال کیا جاتا ہے۔

جسمانی اعتبار سے اودھ کے آدمی ہلکے اور پھرتیلے ہوتے ہیں۔ ان کے اعضا متناسب اور قد درمیانہ ہوتا ہے۔ رنگت نہ کشمیریوں کی طرح سرخ و سفید ہوتی ہے اور نہ بنگالیوں کی طرح کالی۔ یہ لوگ اپنے جسم کی ساخت کے لحاظ سے ہر محنت برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اسی لئے ان کی کثیر تعداد سپہ گری کا پیشہ کرتی رہی ہے اور اودھ میں ملک کے بہت اچھے سپاہی پیدا ہوئے ہیں۔ اودھ کے باشندوں کے فوجی مذاق کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب غازی الدین حیدر کے عہد میں تحقیق کرائی گئی تھی تو ضلع بیسواڑہ کے سولہ ہزار اور ہنودہ کے پندرہ ہزار سپاہی صرف انگریزی فوج میں ملازم نکلے تھے [۲] مقامی تعلقہ داروں اور شاہی پلٹنوں کی جمعیت اس شمار میں شامل نہیں تھی۔ ان ذکر مذکورہ اضلاع کے علاوہ بہرائچ، شاہ آباد، سندیلہ، خیرآباد، ردولی، زیدپور، جائس، بلگرام اور سانڈی وغیرہ بھی اودھ کے جنگ آزما پیدا کرنے والے مراکز تھے جہاں سے ہزارہا باہمت سپاہی پیدا ہوئے۔

صنعت، تجارت اور اقتصادی حالت

زمین کی زرخیزی، سطح کی ہمواری، آب و ہوا کا اعتدال، بارش کی کثرت، دریاؤں کی سہولت اور ہر موسم میں پانی کی فراوانی کا نتیجہ تھا کہ اودھ کا تمام ملک زراعتی کاروبار کے لئے نہایت موزوں بن گیا تھا۔ یہاں تقریباً اسی فیصدی یا اس سے بھی کچھ زائد آبادی ایسی ہو گی جس کی گزر اوقات بالواسطہ یا بلاواسطہ زراعت ہی پر تھی۔ پیداوار میں گیہوں، چنا، جو، مٹر، گنا اور دالوں کے علاوہ

چاول بھی شامل تھا جو یہاں کثرت سے پیدا ہوتا تھا۔ عمدہ باغات کی وجہ سے خاص خاص پھلوں کی بھی یہاں افراط تھی، چنانچہ ملیح آباد کے آم، لکھنؤ کے خربوزے، اور الہ آباد کے امرود دُور دُور تک مشہور تھے۔ غازی پور اور جلیسر میں خوشبودار پھولوں کی کاشت ہوتی تھی جن سے گلاب کا عرق بکثرت نکالا جاتا تھا۔ جونپور، لکھنؤ اور قنوج بھی اپنے عطریات کی وجہ سے بہت مشہور تھے۔ اودھ بالخصوص غازی پور میں افیون اس کثرت سے پیدا ہوتی تھی کہ اس کا بھاؤ مختلف اقسام کے لحاظ سے تین روپے سے لے کر آٹھ روپے سیر تک تھا جب کہ انگریزی علاقے میں یہ چودہ[14] روپے سیر سے کسی صورت میں کم نہ تھی [۱] کچھ غریب لوگ گنّا اور مہوے کے پھولوں سے شراب بھی نکالتے تھے۔

اودھ کی خوشحالی کا دارومدار تمام تر زرخیزی زمین، بارش اور معتدل آب وہوا پر تھا۔ یہاں نہ قیمتی دھاتیں پیدا ہوتی تھیں، نہ کوئلہ اور لوہا پایا جاتا تھا جو موجودہ صنعت گری کے لوازم میں سے ہے۔ اس فقدان کے باعث یہاں صنعت کاروں کی ویسی ہمت افزائی نہیں ہو سکتی تھی جو اور صنعتی علاقوں میں ممکن تھی اس لئے یہاں لے دے کے پارچہ بافی کی صنعت ہی کو فروغ ہو سکا اور زراعت کے بعد صرف یہی پیشہ یہاں نمایاں ہوا۔ یوں تو بہت سے دیہات میں مسلمان جولاہے سوت اور ریشم کا کام کرتے تھے لیکن دریاباد، خیر آباد، بنارس، اکبر پور، شاہ آباد، ٹانڈہ، نیا گاؤں اور جلال آباد کا تیار شدہ سُوتی اور ریشمی کپڑا، بیرونی ممالک مثلاً ایران، ترکی، مصر، انگلستان، فرانس اور یورپ کے بعض دوسرے ملکوں تک میں بھیجا جاتا تھا۔ [۲]

بنارس کی ململ، ریشم، اور کمخواب، لکھنؤ کی زردوزی و کشیدہ کاری کے نمونے، خیر آباد، دریاباد اور شہباز پور (ضلع الہ آباد) کی چھینٹ، گزی اور خیموں کا کپڑا، اور ان کے علاوہ بہت سے دیگر قصبات اور شہروں کی بعض ایسی ہی مصنوعات غیر ممالک میں بھیجی جاتی تھیں جہاں وہ پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں۔ اس حرفت کی مقبولیت اور کثرت نے دیہات اور قصبات میں عام طور پر سُوت اور ریشم کا عمدہ کام کرنے والے ماہرین پیدا کر دیئے تھے۔

چھپائی، رنگائی اور کشیدہ کاری کا کام بھی ہر طرف بہت اچھا ہونے لگا تھا۔ چنانچہ بریلی، فرخ آباد اور نواحِ بجنور میں بہت سے لوگوں نے یہی کاروبار شروع کر دیا تھا۔ خود لکھنؤ میں بھی کپڑے سے متعلق بہت سی نفیس اور نازک صنعت کاریاں شروع ہو گئی تھیں۔ یہ لوگ ریشم کی چھپائی، سنہرا اور روپہرا لیس، مخمل پر کامدانی اور ریشم کے تاروں سے زردوزی وغیرہ کا کام بہت اچھا کرنے لگے تھے۔

اودھ کی ان مصنوعات کی تجارت بیرونی ممالک کی منڈیوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہ سامان خشکی اور تری دونوں راستوں سے کبھی دہلی، لاہور، کابل اور وسطِ ایشیا کی طرف اور کبھی مصر، ہالینڈ، فرانس اور برطانیہ بھیجا جاتا تھا۔ جارج فورسٹر ایک انگریز سیاح ۱۷۸۳ء میں جب لال ڈانگ (Laldang) میں تھا تو ایک ایسے ہی تجارتی کاروان کے متعلق اُس نے لکھا تھا کہ "مجھے علم ہوا کہ تقریباً ایک ہزار خچر، کچا ریشم اور معمولی سوتی کپڑا لادے ہوئے جموّں کے ارادے سے شہر کے اطراف تک پہنچ چکے ہیں۔ اس سامان کے مالک بنارس، لکھنؤ اور فرخ آباد کے باشندے تھے جنہوں نے قافلے کے ساتھ اپنے گماشتوں کو بھیج دیا تھا۔ ایسے ہی متعدد تجارتی قافلے اودھ اور کشمیر کے مابین ہر سال عام طور پر گزرتے رہتے تھے [۱] کپڑے کے علاوہ جونپور اور قنوج کی خوشبویات، غازی پور کا گلاب اور افیون، لکھنؤ کے خوبصورت ظروف، اسلحہ اور کھلونے، بریاب گڑھ اور صفدر گنج کی مٹھائیاں بہت مشہور تجارتی اشیاء تھیں۔ مرزاپور ایک ایسا مرکز تھا جہاں بنگال، کماؤں، تبت اور کشمیر، ہر طرف کا اونی اور ریشمی سامان بھی آکر فروخت ہوتا تھا۔ یہاں پھل اور سبزی کی بھی بہت بڑی منڈی تھی۔ ہزاروں تاجر صرف درآمد اور برآمد کے کام میں مصروف رہتے تھے۔ گورکھپور، چاول، گھی، کانچ کے سامان اور پرندوں کی تجارت کا مرکز تھا۔ بہرائچ، بنیپال کے سامان کی منڈی تھا جہاں سونا، شیشے کا سامان، شہد، موم، مشک، انگور، مرچیں، ادرک، شکاری پرندے مثل باز اور شاہین وغیرہ بہت سی مختلف اشیاء ملتی تھیں [۲] پیلی بھیت میں کشتی سازی کا بہت اچھا کاروبار ہوتا تھا

یہ کشتیاں دریائے گومتی کے ذریعہ کانپور بھیجی جاتی تھیں۔ کشتیوں کے علاوہ ترائی کے جنگلات کی لکڑیاں، چاول اور بعض دوسری اشیاء بھی اسی دریا کے ذریعہ کانپور یا دوسرے شہروں میں جو گنگا کے کنارے آباد تھے فروخت کے لئے لائی جاتی تھیں [۱]

اودھ میں تمام فوجی اسلحہ مثلاً تلوار اور ڈھال، تیر اور کمان، نیزے اور بھالے، چھری اور کٹاریاں وغیرہ بنائے جاتے۔ صرف اعلیٰ قسم کی کچھ توپیں اور بندوقیں البتہ باہر سے منگائی جاتی تھیں [۲] شورہ (Saltpetre) اور ابرک (Mica) حکومت کی ملکیت تھے لیکن ان کی فراہمی کا بعض لوگوں کو ٹھیکا دے دیا جاتا تھا اور اس کام سے ہزاروں مزدوروں کے پیٹ پلتے تھے۔

اودھ کی یہ صنعتی اور تجارتی سرسبزی اُس وقت تک قائم رہی جب تک انگریزی کمپنی کے قدم یہاں اچھی طرح نہیں جمے تھے۔ بڑھتے ہوئے انگریزی اثرات کے ساتھ ساتھ اودھ کی صنعتیں، تجارتی کاروبار کی چہل پہل اور خوش حالی روز بروز گھٹتی چلی گئی۔ سب سے پہلے آصف الدولہ نے اپنی تخت نشینی کے وقت انگریزوں کو اودھ کے ساتھ آزاد تجارت کی اجازت دی تھی، پھر سعادت علی خاں کے زمانے میں نصف ملک ہاتھ سے نکل جانے کی وجہ سے اودھ انگریزی قلمرو سے گھر گیا تھا اس لئے اودھ کی اشیائے برآمد انگریزی ملک سے گزرنے پر مجبور تھیں اور وہاں اُن پر محصولِ عبور زیادہ ہی لگا دیا جاتا تھا۔ اس کے برخلاف انگریزی عملداری کا جو سامان اودھ میں داخل ہوتا تھا اُس پر کوئی محصول عائد نہیں ہوتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اودھ کے دستکار سامان کی ارزانی میں یورپ کی مشینی مصنوعات کا مقابلہ نہ کر سکے چنانچہ یہاں کی صنعت وحرفت کا زوال شروع ہو گیا۔ رفتہ رفتہ درآمد کی تعداد برآمد سے بڑھنے لگی اور ملک اقتصادی خسارے کا شکار رہنے لگا۔ لیکن سعادت علی خاں نے اپنے عہدِ حکومت میں گنج اور منڈیوں کے انتظامات درست کئے۔ اُس وقت لکھنؤ میں باون گنج موجود تھے۔ ان سب کا انتظام درست کرکے گنج بہاری لال کو اس محکمے کا انصرام سپرد ہوا۔

شہر کی ناکہ بندی کر دی گئی تھی اور مال و اسباب بغیر دیکھ بھال اور پروانۂ راہداری کے گزر نہیں سکتا تھا۔ غلّے کی قیمتیں مقرر کر دی گئی تھیں۔ چنانچہ جب بشپ ہیبر، غازی الدین حیدر کے عہد میں لکھنؤ آیا تھا تو اُس نے بھی بازاروں کو بھرا بھرا محسوس کیا تھا [۱] اور سر جان شور نے بھی اسی نوعیت کی بات لکھی تھی یعنی ایک شخص نے کلکتے سے کانپور تک ایک خاص مخمل تلاش کی لیکن وہ اُسے کہیں نہ مل سکی بالآخر وہ لکھنؤ سے اپنے حسبِ منشا چیز حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا [۲]

اُس وقت سارے ہندوستان میں نچلے طبقے کا معیارِ زندگی بہت پست تھا۔ کلکتے تک میں جہاں اودھ کی بہ نسبت زیادہ گرانی تھی، کمپنی کے گماشتے اپنے مزدوروں اور قُلیوں کو صرف دو روپے بارہ آنے ماہانہ تنخواہ دیتے تھے [۳] اودھ میں بھی اِس قسم کے لوگوں کی آمدنی کا یہی اوسط تھا جو انتزاعِ سلطنت کے بعد انگریزی عہد میں بھی ایک طویل مدّت تک قائم رہا۔ لیکن اودھ کے شاہی عہد میں روپے کی قیمتِ معروفہ (Face value) آج سے بہت زیادہ تھی اور اشیائے خوردنی و پوشیدنی اس قدر سستی تھیں کہ ایک شخص ڈیڑھ دو روپے میں اپنی ضروریاتِ زندگی بہت آسانی سے فراہم کر سکتا تھا۔ چنانچہ معمولی کپڑا بُننے والے اور سپاہی جن کی آمدنی پانچ روپے سے دس بارہ روپے ماہوار تک تھی بہت آسائش سے رہتے تھے۔ مُلک کا درمیانی طبقہ جو اچھے کاشتکاروں، چھوٹے زمینداروں، کچھ شاہی عہدہ داروں اور کم حیثیت کے تجارت پیشہ لوگوں پر مشتمل تھا خاصا مطمئن تھا۔ خصوصاً تاجر جو عموماً ہندو تھے بڑے خوش حال تھے لیکن اُن کی زندگی نہایت سادہ تھی اور اُنہیں روپیہ جمع کرنے کا شوق تھا۔

اودھ کا اعلےٰ طبقہ جو بڑے تاجروں، زمینداروں، جاگیرداروں اور سرکاری افسروں پر مشتمل تھا۔ نہایت فارغ البال اور خوش حال تھا۔ اِن لوگوں کی فراخدلی کی وجہ سے لوازمِ عیش پرستی ہر طرف عام تھے۔ داد و دہش کی فراوانی، فضول خرچی کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ اس اونچے طبقے کی فراغت اور سیر چشمی کا اندازہ کرنے کے لئے مرتضیٰ حسین بلگرامی کی حدیقۃ الاقالیم

سے ایک ضیافت کی تفصیل یہاں پیش کی جاتی ہے۔ یہ دعوت ایک درمیانی درجے کے فوجی افسر کو راجہ چتر دھاری سنگھ تعلقہ دار پرتاب گڑھ کی زوجہ نے دی تھی۔ اِس دعوت میں مصنفِ کتابِ مذکور خود بھی شامل تھے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:۔

"جب ہم سواری سے اُتر کر اندر داخل ہوئے تو ایک وسیع احاطہ نظر آیا جس کے تین طرف ایک دو منزلہ محل تھا جس کی دیواریں بڑے پتھروں کی بنی ہوئی تھیں۔ محل کے بڑے کمروں کے اندر اور صحن میں قالین بچھے ہوئے تھے جن پر چاندنی کا فرش تھا۔ رانی صاحبہ محل کی چھت پر جو قندیلوں سے روشن تھا ایک پتھر کی جالی سے ہمیں دیکھ رہی تھیں۔ صحن کے چاروں طرف درختوں کی شاخوں سے تیس چالیس فانوس بندھے ہوئے تھے اور فرش کے دونوں طرف بھی لیمپوں کی قطاریں تھیں۔ میں صحن تک بڑھا اور مسند پر بیٹھ گیا۔ میرے پانچسو ساتھی قطاریں باندھ کر دری پر بیٹھ گئے۔ رام مست سنگھ اور راجہ کے دوسرے معتمد یعنی ہندو مسلم ملازمین نے کھانا لگانے کا اہتمام شروع کر دیا۔ اُنہوں نے پہلے ہمارے سامنے ایک سفید دستر خوان بچھا دیا اور پھر کچھ چھوٹے ملازمین چار آفتابے اور سلیچیوں کے جوڑے لئے ہوئے آئے جن میں سے ایک چاندی کا جوڑا خاص ہمارے ہاتھ دھونے کے لئے مخصوص تھا۔ اس کے بعد کچھ منقش رکابیاں لائی گئیں جن میں سے بعض چاندی کی تھیں۔ ان میں مختلف قسم کے طعام مثلاً کباب، قورمہ، مُزعفر، پلاؤ، مختلف قسم کی مٹھائیاں اور ترکاریاں، شیرمال، باقرخانی اور بعض ہندوانی کھانے مثلاً پوری، کچوری (جن میں سے ہر پوری کا وزن ایک سیر پختہ تھا) دہی بڑے، مُربّہ اور اچار وغیرہ لاکر ہمارے سامنے رکھ دیئے گئے۔ میرے ساتھیوں نے دریافت کیا کہ یہ گوشت کس قسم کا ہے۔ خدمتگار نے جواب دیا کہ راجہ صاحب کے چار باورچی اور اتنے ہی باورچی خانے مسلمان مہمانوں کے لئے مخصوص ہیں اور یہ احتیاط کی جاتی ہے کہ اُن کے لئے حلال کیا ہوا گوشت لایا جائے۔ بالآخر کھانے کے بعد۔۔۔ ہم ایک صاف ستھرے بڑے کمرے میں لے جائے گئے اور ہمارے ملازمین

کھانے پر بٹھا دیئے گئے۔ اس نئی جگہ پر ہمارے لئے پان اور تمباکو وغیرہ کی کشتیاں لائی گئیں جن میں چھالیہ، الائچی اور لونگ وغیرہ بھی تھیں۔ جب ہمارے ملازمین کھانا کھا چکے تو ہم نے اپنی قیام گاہ پر واپس جانے کی اجازت چاہی۔ اب پھر پانوں کا ایک سینی خاصدان اور ایک عطردان جس میں چار شیشیاں مختلف عطر کی تھیں لایا گیا یہ سب سامان مجھے دے دیا گیا اور اس کے علاوہ چاندی کا آفتابہ، سلفچی اور وہ برتن جن میں مجھے کھانا کھلایا گیا تھا ایک ہزار نقد روپیہ، ایک توڑا جس میں ایک سو ایک اشرفیاں تھیں، اور دو گھوڑے جن میں سے ایک ترکی النسل ابلق اور دوسرا تازی تھا، مجھے پیش کئے گئے۔ ان گھوڑوں میں سے ہر ایک پانسو، چھ سو روپے قیمت کا ہوگا۔ مجھ سے یہ بھی کہا گیا کہ اپنے ملازموں کو تاکید کردوں کہ وہ قالین، چاندنی اور مسند وغیرہ جن پر مجھے بٹھایا گیا تھا اپنے ساتھ لیتے جائیں [۲]

یہ تفصیل ایک تو اعلیٰ طبقے کی خوشحالی اور صرفِ بیجا کو ظاہر کرتی ہے اور دوسرے ہندو گھروں میں اسلامی تہذیب کے اثرات کا سُراغ دیتی ہے۔ اسے پڑھ کر ہم اندازہ کرسکتے ہیں کہ اعلیٰ طبقہ کے ہندو اور مسلمان گھروں میں تھوڑے بہت فرق کے ساتھ ایک ہی تہذیب کے امتزاجی عناصر موجود تھے۔

انتظامِ سلطنت

بادشاہ

اودھ کے حکمران، غازی الدین حیدر سے قبل اگرچہ صوبے دار یا نواب وزیر کے نام سے موسوم تھے لیکن حقیقت میں اُنھیں خود مختار بادشاہوں کی سی حیثیت حاصل تھی۔ اُن کا نام اگرچہ نہ خطبوں میں پڑھا جاتا تھا اور نہ سکّوں پر کندہ ہوتا تھا لیکن تمام زیرِ نگیں علاقوں کی پالیسی اُنھیں کے ہاتھ میں ہوتی تھی اور وہ اپنے عملے کے تعین و تقرر اور برخاستگی کے کُلی اختیارات رکھتے تھے۔ وہ اپنے اندرونی انتظامات میں تو خود مختار بادشاہوں کی طرح

آزاد ہی تھے لیکن بیرونی تعلقات میں بھی کم ازکم شجاع الدولہ کے زمانے تک خود مختار حیثیت سے رہے۔ غازی الدین حیدر کے عہد میں ان حکمرانوں کو مطلق العنانی کا برائے نام خطاب نصیب ہوگیا تھا لیکن کمپنی کے اختیارات کی وسعت نے اِس اعزاز کو کبھی عملی جامہ نہ پہننے دیا اور سلطنتِ اَودھ کی مکمل خارجی پالیسی انگریزوں ہی کے ہاتھ میں رہی۔ اندرونی معاملات میں بھی رزیڈینٹ کے اثرات رفتہ رفتہ یہاں تک بڑھ گئے تھے کہ بادشاہ سلامت کے حدود و اختیارات بھی اُسی کی مرضی کے تابع معلوم ہوتے تھے۔ رزیڈینٹ کو جن معاملات میں مداخلت کا اختیار حاصل نہ تھا وہ اُن میں بھی دخل دیتا رہا تھا۔ اسی صورتِ حال کے پیشِ نظر ایک انگریز سیاح لکھتا ہے کہ اگر شاہِ اَودھ کسی عورت سے شادی بھی کرنا چاہتے تو وہ رزیڈینٹ کی مرضی کے بغیر نہیں کرسکتے تھے [۱] اودھ کے اندرونی معاملات میں برطانیہ کی مداخلتِ بیجا کی مذمت کرتے ہوئے سر ہنری لارنس لکھتے ہیں کہ :۔

"اَودھ کے معاملات میں ہر اہلِ قلم نے جو حقائق فراہم کئے ہیں وہ سب اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ اَودھ کے ساتھ انگریزی مداخلت، اُس کے دربار اور رعایا کے لئے جس قدر مضرت رساں ثابت ہوئی اُسی قدر وہ برطانیہ کے نام کے لئے شرمناک بھی تھی۔" [۲]

رزیڈینٹ

مولفِ "تاجدارِ اودھ" لکھتے ہیں کہ دیسی ریاستوں کے خلاف طریقِ معاونت Subsidiary System کا سب سے کاری حربہ رزیڈینٹ تھا جو ان حکمرانوں کے سر پر ان کی طاقت توڑنے اور ریاست میں انگریزی عمل دخل بڑھانے کے لئے متعین رہتا تھا۔ اَودھ کو شجاع الدولہ ہی کے عہدِ حکومت میں اِس عہدے سے روشناسی حاصل ہوگئی تھی چنانچہ سب سے پہلے "ہارپر" اور اس کے بعد "جان لمسڈن" رزیڈینٹ بناکر فیض آباد بھیج دیئے گئے تھے لیکن اُس وقت تک اَودھ کی سیاسی قوت بندھی ہوئی تھی اس لئے رزیڈینٹ کا کام محض یہ تھا کہ مُلکِ اَودھ میں کمپنی کے مفاد کا تحفظ کرے اور دونوں حکومتوں

کے درمیان خوشگوار تعلقات قائم کرائے۔ لیکن موقع کی مناسبت کے لحاظ سے رزیڈینٹ کی پالیسی اور اس کے ریاست سے تعلقات مختلف وقتوں میں مختلف شکلیں اختیار کرتے رہے۔ چنانچہ آصف الدولہ کے عہد سے بڑھتے ہوئے انگریزی اختیارات کے ساتھ ساتھ رزیڈینٹ کی پالیسی بھی بدلتی رہی جس سے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ رزیڈینٹ نوابِ اودھ کی طاقت اور آزادی کو نامعلوم طریقے سے رفتہ رفتہ سلب کرنے کا ایک آلہ ہے۔ چنانچہ اُسی کے وجود نے ملک کے الحاق کے لئے راستہ صاف کیا۔ رزیڈینٹ نے رفتہ رفتہ اپنے اختیارات کچھ اس درجہ بڑھا لئے تھے کہ بہت تھوڑی مُدت میں اودھ میں شاہی دربار کے متوازی ایک دوسرا دربار قائم ہو گیا تھا جس میں وہ تمام لوگ حاضر ہو کر دربار داری کرنے لگے تھے جنہیں بادشاہ سے جائز یا ناجائز طور پر کچھ شکایات پیدا ہو جاتی تھیں [۱] گویا ایک ہی عملداری میں ایک دوسری مطلق العنان طاقت پیدا ہو گئی تھی جو شاہی دربار کے مخالفوں کو اشتعال دینے، اُن کی ہر جائز و ناجائز امداد کرنے، شاہِ اودھ کے مُلکی انتظام میں ابتری پھیلانے اور بادشاہ کے حدود و اختیار کو محدود کرنے کے لئے ہر وقت مضطرب رہتی تھی۔ شاہِ اودھ اور گورنر جنرل کی باہمی خط و کتابت، رزیڈینٹ کی استبدادیت کی بہت سی مثالیں اپنے اندر رکھتی ہے لیکن ہم اُن سب کو نظر انداز کر کے اس ضمن میں خود گورنر جنرل سرجان شور کے چند الفاظ نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں جن سے رزیڈینسی کی غرض و غایت پر بہت اچھی طرح روشنی پڑ سکتی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ:۔

"دیسی درباروں میں رزیڈینٹ کے قیام کا خفیف سے خفیف فائدہ بھی تلاش کرنا حد درجہ مشکل ہے۔ اس لئے یہ یقینی ہوتا ہے کہ شاید اس کارروائی سے مختلف ریاستوں میں محض بدنظمی اور ابتری پھیلانا ہی مقصود ہے تاکہ ہم اُن پر قبضہ جمانے کے مواقع اور کچھ تاویلیں مہیا کر سکیں"۔ [۲]

بہر حال دوسری دیسی ریاستوں کی طرح دربارِ اودھ میں بھی رزیڈینٹ کی موجودگی کا مقصد یہی تھا کہ ریاست میں انتشار اور ابتری پھیلا کر مُلک کو ہضم کر لیا جائے۔ چنانچہ خود گورنر جنرل

تسلیم کرتا ہے کہ "اودھ میں رزیڈنیٹ کی مداخلت ہمیشہ برائیاں پیدا کرنے کے لئے کوشاں رہی ہے" [۱] رزیڈنیٹ نے اپنی خفیہ اور بعض اعلانیہ چالوں سے اپنے اثرات بتدریج یہاں تک بڑھا لئے تھے کہ سلطنت کے دعویداروں کے علاوہ خود ملازمین ریاست کی بھی یہی کوشش رہتی تھی کہ کہیں "بڑے صاحب" اس سے ناراض نہ ہو جائیں کیونکہ جہاں رزیڈنٹ کو تخت نشینی کے معاملات میں کُلی اختیارات حاصل تھے وہاں شاہی ملازمین کی تقرری اور برطرفی بھی اُسی کے اشارے پر عمل میں آتی تھی۔ رزیڈنیٹ کے ان وسیع اختیارات کی وجہ سے رزیڈنسی کے چھوٹے اور بڑے تمام ملازمین کی آؤ بھگت' شاہی عہدیداروں سے کہیں زیادہ ہوتی تھی۔ ولیعہد' سلطنت، اُمرائے شہر، اور حکامِ ریاست سب اُسے بڑی بڑی نذریں دیتے تھے اور اُس کی خوشنودی حاصل کرنے میں کوشاں رہتے تھے۔

نائب السلطنت یا وزیرِ اعظم

جب تک اودھ کے حکمران صوبے دار یا نواب وزیر کے نام سے موسوم رہے اُن کا وزیر نائب السلطنت کہلاتا رہا۔ اور جب نواب وزیر کو بادشاہ کی حیثیت حاصل ہو گئی تو اُن کے نائب السلطنت کو وزیرِ اعظم کا خطاب مل گیا۔ لیکن دونوں حالتوں میں اُس کے اختیارات قریب قریب ایک ہی رہے۔ اُس کی ذمہ داریاں زیادہ واضح تو نہیں ہیں لیکن وہ فوج اور نظامت کا نگران ہوتا تھا اس لئے ایک اعلیٰ سپاہی، منتظمِ حکومت اور حکمت عملی کا ماہر ہونا اس لئے ضروری تھا۔ عموماً قانون و بندوبست کے شعبے اُس کے سپرد ہوتے تھے لیکن بادشاہ کی بیماری یا غیر حاضری میں اگر اُسے اجازت حاصل ہوتی تو وہ شاہی قائم مقامی کے فرائض بھی انجام دے سکتا تھا۔ وزیرِ اعظم کی تنخواہ روشن الدولہ کے عہد میں ۲۵ ہزار روپے ماہوار یا تین لاکھ سالانہ تھی۔ علاوہ ازیں اُسے کُل مالگذاری پر پانچ فیصدی کمیشن بھی ملتا تھا جس کی تعداد تقریباً چھ لاکھ روپے سالانہ ہوتی تھی [۲] یہ عہدہ عموماً بادشاہ اپنی مرضی سے کسی خاص مُعتمد کو عطا فرماتے تھے۔ لیکن عملی طور پر چونکہ وہ خود رزیڈنیٹ کے تابع فرمان ہوتے تھے اس لئے اکثر ایسا بھی ہوا کہ رزیڈنیٹ نے بادشاہ پر زور دے کر جس وزیر کو چاہا برطرف

کرادیا اور جسے چاہا بحال کرادیا۔ اس دو عملی کی وجہ سے وزیر کی پوزیشن بڑی نازک ہوتی تھی۔ وہ بیک وقت دو متضاد و متخالف طبائع یعنی بادشاہ اور رزیڈینٹ کو خوش رکھنے کی کوشش کرتا اور اکثر ناکام رہتا کیونکہ بادشاہ کا خیر خواہ ہو کر حکومتِ برطانیہ کا ہمدرد رہنا ممکن ہی نہ تھا پھر بھی دربارِ اودھ کو کئی اعلیٰ وزرا میسر آئے مثلاً حکیم مہدی علی خاں کے متعلق ایک جرمن سیاح کیپٹن لیوپولڈ وان اوریچ لکھتا ہے کہ ان جیسا قابل مشیر سلطنتِ اودھ کو کبھی نصیب نہ ہوا [۱] اسی طرح تفضل حسین خاں کے متعلق مولانا محمد حسین آزاد لکھتے ہیں کہ بعد ابوالفضل اور سعد اللہ خاں شاہجہانی کے علامہ کا خطاب اگر ہوا تو اُن کے لئے تسلیم ہوا۔ وہ اپنے علم اور حسنِ تدبیر سے اِدھر معتمد سرکارِ انگریزی تھے اور رُکن سلطنتِ لکھنؤ کے اور مشیرِ تدبیر سعادت علی خاں کے [۲]

دیوانِ ریاست وزیرِ اعظم کے بعد دوسرا اہم عہدہ دیوانِ ریاست کا تھا جس کا عزل و نصب بادشاہ کے ہاتھ میں ہوتا تھا اور اُسی کے سامنے یہ اپنے معاملات کے لئے جواب دہ ٹھہرتا ہے۔ شاہانِ مغلیہ کے درباروں میں دیوان کا عہدہ وزیر کے برابر سمجھا جاتا تھا لیکن اودھ میں دیوان، وزیر کے ماتحت ہوتا تھا۔ یہاں دیوان شعبۂ مالگذاری و مالیات کا حاکم ہوتا تھا۔ مداخل و مخارج کے کُل حسابات اُسی کی تحویل میں رہتے تھے۔ مالگذاری کی تشخیص، وصول یابی، اور پرگنوں اور اضلاع کے کاغذات کی جانچ پڑتال بھی اُسی کے سپرد ہوتی تھی۔ وہ حکومت اور تعلقہ داروں کے درمیان ایک واسطہ تھا۔ اور ہر چکلے کے لئے مالگذاری کی رقم بھی وہی متعین کرتا تھا۔ نواب سعادت علی خاں کے عہد سے مالیات کا ایک حصّہ جس میں خفیہ طور پر زر و جواہرات جمع کئے گئے تھے دیوان سے الگ کر کے کپتان فتح علی خاں کے ماتحت کر دیا گیا تھا۔ اس خزانے کے حسابات عام شاہی خزانوں سے علیٰحدہ خود نواب کی تحویل میں رہتے تھے۔ اودھ کے مشہور دیوانِ ریاست آتما رام، رام نرائن اور ٹکیت رائے وغیرہ ہوئے ہیں۔

صُوبہ دار اور ناظم صفدر جنگ کے زمانے میں اودھ دو صُوبوں پر مشتمل تھا اور ہر ایک صوبے میں ایک علیٰحدہ نائب صوبہ دار رکھا جاتا تھا چنانچہ محمد قلی خاں

اوَدھ کا اور علی قلی خاں الہ آباد کا نائب صوبہ دار تھا۔ جب شجاع الدولہ نے روہیل کھنڈ فتح کیا تو سعادت علی خان کو بریلی کا صوبہ دار بنا دیا تھا۔ ہر صُوبے میں نائب صوبہ دار کے ساتھ ایک بخشی، ایک قاضی اور ایک صدر بھی ہوتا تھا۔ صدر، خیرات خانے اور بیوتات (مرنے والوں کی ضبطی املاک) کا مہتمم ہوتا تھا۔ ہر نظامت یا سرکار کا انتظام ایک ناظم کے سپرد تھا جو مالگذاری کی وصولیابی کے علاوہ حاکمِ فوج، افسرِ پولس، مجسٹریٹ اور جج کی حیثیت بھی رکھتا تھا۔ اُس کی ذمّہ داریاں بہت تھیں اور اُسی کی قابلیت پر مُلک کا اندرونی امن وسکُون ممکن ہوتا تھا۔ جن علاقوں میں ناظم اچھے ہوتے وہاں رعایا بڑے اطمینان اور سکون سے رہتی تھی۔ اوَدھ میں ایسے ہی ایک ناظم میاں الماس علی خاں تھے جن کے متعلق سلیمن لکھتا ہے:

"میاں الماس (خواجہ سرا) اُن زبردست لوگوں میں تھے جن کا نظیر اوَدھ نے پیدا نہیں کیا۔ اُنہوں نے تقریبًا چالیس۴۰ سال تک ان اضلاع (نظامت میاں گنج) کا انتظام کیا جن کی مالگذاری تقریبًا اسّی لاکھ روپے تھی۔ اُس زمانے میں اُنہوں نے رعایا کی جان ومال کی پوری حفاظت کی اور اُسے اتنا خوش رکھا جتنا کہ وہ ایسے معاشرے میں خوش رہ سکتی تھی۔ اُن کے عہدِ نظامت میں تمام مُلک ایک گُلستان بنا ہوا تھا۔ وہ یہاں (میاں گنج میں) بڑی شان وشوکت سے رہتے تھے۔ اُن سے ملاقات کے لئے عمومًا نواب وزیر خود بھی یہاں آجاتے تھے اور ایک آدھ مہینہ اُن کے پاس قیام کیا کرتے تھے۔" [۱]

بعض ناظموں کے ماتحت کئی اضلاع ہوتے تھے مثلًا غازی الدین حیدر کے عہد میں جب خیر آباد سرکار کے ناظم حکیم مہدی علی خاں تھے تو اُن کے ماتحت خیر آباد اور محمدی کی کلکٹریاں تھیں۔ علی نقی خاں، میر منشی بھی دو اضلاع کے نگراں تھے۔ ایسی ہی ایک کلکٹری کنور رتن سنگھ زخمی کے سپرد تھی۔

تقسیمِ ریاست

فیض بخش نے تاریخِ فرح بخش میں شاہجہاں کے عہد میں صوبوں کی جو تقسیم دی ہے اُس کی رُو سے صوبۂ اوَدھ یا اجودھیا پانچ سرکاروں

یعنی حویلی خاص، سرکار لکھنؤ، خیرآباد، بہرائچ اور گورکھپور پر مشتمل تھا۔ اِس صُوبے میں ایک سو انیس ۱۱۹ محال تھے۔ لیکن شجاع الدولہ کے عہد میں ریاست اَودھ صرف چار صُوبوں، یعنی اِلٰہ آباد، اَودھ، دوآبہ اور روہیل کھنڈ میں منقسم تھی۔ ان میں سے موخر الذکر دُو صوبے نوآبادیات کی حیثیت رکھتے تھے، جن میں اندازِ حکومت فوجی طریقے پر تھا اور سیدی محمد بشیر اور انوپ گیر گوشائیں اُن کے ناظم اور مرزا سعادت علی خاں صُوبہ دار تھے جن کا صدر مقام بریلی تھا۔ آصف الدولہ کے عہد میں صوبوں کی اس تقسیم میں تبدیلی ہوگئی تھی۔ چنانچہ اُس وقت یہ ریاست، بریلی، الٰہ آباد اور لکھنؤ یعنی صرف تین صوبوں میں منقسم رہ گئی تھی۔ ان صُوبوں کو مختلف نظامتوں میں بانٹ دیا تھا۔ ناظم کبھی امانت کے طور پر کام کرتے اور موجودہ عہد کے کلکٹر یا ڈپٹی کمشنر کی حیثیت رکھتے تھے جو سرکاری تنخواہ دار ہوتے تھے۔ اُن کا کام یہ تھا کہ جتنی مالگذاری وصول کریں وہ فوج اور عملے کی تنخواہ وضع کرکے سرکاری خزانے میں داخل کردیں۔ کبھی کبھی نظامت کا کام ایک معیّنہ سالانہ رقم کے بالعوض مستاجری کے طور پر دے دیا جاتا تھا۔ لیکن ان دونوں صورتوں میں ناظم کے اختیارات ایک ہی سے ہوتے تھے۔ ناظم کی امداد کے لئے جو نائب ناظم رکھتے کرتے تھے اُنہیں تقریباً ڈیڑھ سو روپے مشاہرہ ملتا تھا۔ انتظامی سہولتوں کے پیشِ نظر نظامتوں کو چکلوں میں بانٹ دیا گیا تھا جن کے منتظم چکلہ دار کہلاتے تھے۔ پھر ان چکلوں کو پرگنوں میں تقسیم کردیا تھا جن پر عامل متعیّن تھے۔ عاملوں کو وہی اختیارات حاصل تھے جو چکلوں میں چکلہ داروں کو اور نظامتوں میں ناظم کو ملے ہوئے تھے۔ انہیں پندرہ روپے سے تیس ۳۰ روپے ماہوار تک تنخواہ ملتی تھی۔ اَودھ کے سلسلۂ مالگذاری میں ایک مخصوص عہدہ جھوگدار کا بھی تھا جس کا کام یہ تھا کہ جب حضور تحصیل کے زمیندار مالگذاری ادا نہ کرسکیں تو کاشتکاروں سے براہِ راست لگان وصول کرلیا جائے۔ یہ وصولیابی جھوگ لگانا کہلاتی تھی۔ جھوگدار کی تنخواہ اُن زمینداروں سے وصول کی جاتی تھی جن کے ذمے مالگذاری بقایا ہوتی تھی۔ جھوگدار عموماً باثر لوگ ہوتے تھے کبھی کبھی یہ کام ضلعی فوج کے حاکموں سے بھی لے لیا جاتا تھا۔ ہر پرگنے میں قانون گو اور چودھری بھی ہوتے تھے جو عموماً صیغہ دار کہلاتے تھے

یہ لوگ پرگنے کی قابلِ کاشت زمینوں کی تفصیلات رکھتے، مالگذاری، معافی اور تشخیصِ لگان وغیرہ کے کاغذات مرتب کرتے اور کبھی کبھی مالگذاری کی وصولیابی میں بھی امداد دیتے تھے[۱]

مالگذاری و مالیات

اَودھ میں تشخیصِ مالگذاری کا کوئی معینہ معیار نہ تھا بلکہ زمینداری یا تعلقہ داری، جاگیرداری یا انعام، رعیت داری اور اجارہ ہر چیز کے لئے ایک مختلف طریقہ رائج تھا۔ مثلاً جاگیردار کو اُس کا علاقہ چونکہ انعام کے طور پر دیا جاتا تھا اس لئے اُس سے آمدنی کا بہت کم حصّہ وصول کیا جاتا تھا۔ تعلقہ دار عموماً موروثی ہوتے تھے جن سے پشت ہا پشت سے ایک معینہ رقم وصول ہوتی چلی آرہی تھی جو کُل آمدنی کے ایک تہائی سے زائد نہ تھی اور بعض بعض حالتوں میں تو اس سے بھی کم یعنی پانچواں یا دسواں حصّہ ہی رہ گئی تھی۔ مالگذاری کی طرح لگان کی وصول یابی کے بھی کئی مختلف طریقے رائج تھے جن میں سے مخصوص تین تھے یعنی نقدی یا جمعی، بٹائی یا غلہ بخشی اور کنکوت یا متقطعی۔ ان تینوں میں سے نقدی کا طریقہ سب سے اچھا اور کنکوت کا سب سے خراب تھا کیونکہ اس میں غیر صاف شدہ پیداوار کا بغیر ناپ تول کے اندازہ کر لیا جاتا تھا، اور اسی مناسبت سے لگان وصول ہوتا تھا۔ یہ طریقہ کبھی کاشتکار کے لئے نقصان دہ رہتا تھا اور کبھی زمیندار کے لئے۔

اَودھ میں ممالکِ محروسہ کی نوعیت کے لحاظ سے بھی مالگذاری چار شعبوں میں منقسم تھی اور چاروں کی وصولیابی کے ذرائع مختلف تھے۔ ان میں ایک تو وہ علاقے تھے جو خالصہ یعنی بادشاہ کی ذاتی ملکیت تھے۔ دوسرے حضور تحصیل کے رقبے جن میں کاشتکار بغیر کسی واسطے کے ریاست کو براہِ راست مالگذاری ادا کرتے تھے۔ تیسرے تعلقہ داروں اور زمینداروں کے اجارے جن کی مالگذاری کا ٹھیکا دے دیا جاتا تھا اور چوتھے وہ اضلاع جو امانی کے طور پر تنخواہ دار ناظم کے ماتحت رہتے تھے۔

خالصہ کی مالگذاری بادشاہ کی ذاتی ملکیت ہوتی تھی جو چکلے دار کی معرفت وصول کی جاتی تھی۔ یہ مالگذاری بغیر کسی دقت کے وصول ہوجاتی تھی کیونکہ لگان دہندگان کو یہ خوف

لگا رہتا تھا کہ اگر ہم نے سرکاری مطالبہ بآسانی ادا نہ کیا تو پھر یہ علاقہ کسی تعلقہ دار کو ٹھیکے پر دے دیا جائے گا اور اُس صورت میں ہمیں زیادہ زحمت اُٹھانی پڑے گی۔ حضور تحصیل کا نظام بھی اودھ میں کسی حد تک کامیاب ہی تھا۔ کیونکہ اُس کی مالگذاری کی وصولیابی دیوان بخشی کے سپرد ہوتی تھی اور چکلہ داروں کو ایسے علاقوں میں دخل دینے کا کوئی حق حاصل نہ تھا۔ چنانچہ وہ حضور تحصیل کی اُسامیوں سے بیگار بھی نہ لے سکتے تھے۔ تیسرا شعبہ اجارہ داری کا تھا جو تمام اُودھ میں عام تھا۔ یہ رعایا اور گورنمنٹ دونوں کے لئے غیر مفید اور بعض قباحتوں کا باعث ہوتا تھا کیونکہ ٹھیکے دار (تعلقہ دار) اپنے عمل دخل کے زمانے میں زیادہ سے زیادہ مطالبہ وصول کرنے کی کوشش کرتے تھے جب کہ وہ ریاست کو صرف ایک معینہ رقم ہی ادا کرتے تھے۔ مزید برآں یہ کہ اِس معینہ رقم کی ادائی میں بھی بڑی دقتیں پیش آتی تھیں۔ کیوں کہ تعلقہ دار اپنے علاقے کے اندر ایک راجہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ یہ کچی مٹی کے مضبوط قلعے یا گڑھیاں بنا کر رہتے، اور اپنے علاقے کے انتظام کے لئے خود ہی اپنے ذاتی افسرانِ مال، پولیس اور فوج وغیرہ متعین کرتے تھے۔ واجد علی شاہ کے عہد میں ایسے بڑے تعلقہ داروں کی مجموعی تعداد تقریباً ڈھائی سو تھی جن میں سے محض اُنھتر تعلقہ دار مسلمان تھے۔ ہر تعلقہ دار یا راجہ کے پاس عموماً پانچسو بندوقیں اور تقریباً چار سو مسلح سپاہی ہر وقت موجود رہتے تھے جن کے ذریعہ سے وہ قرب وجوار کے زمینداروں سے عموماً برسرِ پیکار رہتے تھے اور اکثر اُنہیں کے بل بوتے پر وہ مالگذاری کی ادائی میں سرکاری افسروں کی بھی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ انہیں تعلقہ داروں کی وجہ سے امن وامان خطرے میں اور گردوپیش کی فضا مکدر رہتی تھی۔ حکومت کو بھی ان کی سرکوبی کے لئے ایک باقاعدہ فوج ہر وقت تیار رکھنی پڑتی تھی۔ بہرحال اجارہ داری کے طریقے کی یہ سب خرابیاں محسوس کرتے ہوئے غازی الدین حیدر نے اس نظام کو امانی میں تبدیل کر دیا تھا اور اس کام کو سنبھالنے کے لئے تنخواہ دار ناظم بھی مقرر کئے تھے۔ لیکن اسے رائج ہوئے ابھی دو برس بھی نہیں ہوئے تھے کہ کرنل بیلی کے اشارے پر وہی پچھلا طریقہ پھر بحال کر دیا

پڑا تھا۔ بعد کو نصیر الدین حیدر اور محمد علی شاہ کے عہد میں پھر اسی قسم کی کوششیں عمل میں آئی تھیں، لیکن پورا نظام نہیں بدل سکا تھا۔ امانی کا طریقہ سب سے آسان اور رعایا اور حکومت دونوں کے لئے مفید تر تھا جو کسی ہنگامہ و فساد کا باعث نہیں ہوتا تھا [۱]

اودھ میں مالگذاری کی شرح، پیداوار کے نصف سے زیادہ نہ تھی لیکن بعض حالتوں میں ناظم کو اجازت ہوتی تھی کہ وہ مالگذاری کے ساتھ اتفاقیہ اخراجات کے نام سے معیّنہ مطالبے کے علاوہ دس فیصدی رقم زیادہ وصول کرسکتا تھا۔ باغات کے اوپر کوئی لگان یا محصول نہیں تھا [۲] مالگذاری کی آمدنی شجاع الدولہ کے عہد میں کچھ کم تین کروڑ روپے تھی [۳] لیکن سعادت علی خاں کے وقت میں نصف حصّۂ مُلک نکل جانے کی وجہ سے ایک کروڑ پینتیس لاکھ سے کچھ زیادہ رہ گئی تھی۔ مالگذاری کے علاوہ ریاست کے کچھ ذرائعِ آمدنی اور بھی تھے مثلاً اشیائے درآمد پر محصول اور ضبطی املاک کی آمدنی۔ موخر الذکر دستور دراصل مغلیہ طرزِ حکومت کی ایک روایت تھی جو دِلّی سے لکھنؤ کو وراثت میں ملی تھی۔ اس کی صورت یہ تھی کہ جب کوئی درباری وفات پاجاتا تھا تو اُس کے ترکے کا ایک مخصوص حصّہ شاہی خزانے میں داخل ہوتا تھا۔ اودھ میں اس طریقے کو شجاع الدولہ نے رواج دیا تھا لیکن یہ کوئی ایسی مخصوص و متعیّن آمدنی نہ تھی جس کی سالانہ یافت کا کوئی صحیح اندازہ لگایا جاسکے۔

فوج بکسر کی شکست کے بعد شجاع الدولہ نے اپنی فوج کی فراہمی نئے سرے سے شروع کردی تھی اور اُسے ولائتی سازوسامان سے آراستہ کیا تھا۔ اس کام کے لئے تقریباً دو سَو فرانسیسی افسر ملازم رکھے گئے تھے۔ چند سال کی محنت کے بعد ایک نئی تربیت یافتہ فوج تیار ہوگئی تھی جس میں اسّی ہزار سُرخ وردی پوش باقاعدہ پیدل اور چالیس ہزار سیاہ وردی والے بے قاعدہ سپاہی شامل تھے۔ اس تمام فوج کا افسرِ اعلیٰ سیّد احمد تھا جو "بانسی والا" کے نام سے مشہور تھا۔ چقماق سے چلنے والی انگریزی بندوقیں، جلدی بارود سے بھر جانے اور فائر کرنے میں شجاع الدولہ کی توڑے دار بندوقوں کا مقابلہ نہیں کرسکتی تھیں۔ اس جمعیت

کے علاوہ شجاع الدولہ کے پاس بائیس ہزار پیغامبر اور جاسوس بھی ملازم تھے جو ہفتہ وار پونا سے اور پندرہ روزہ کابل سے خبریں لاتے رہتے تھے [۱] اس تمام فوجی قوت سے خدشہ محسوس کر کے اسمتھ نے کمپنی سے شجاع الدولہ کی بعض خفیہ سازشوں کی شکایت کی تھی جس کے نتیجے میں شجاع الدولہ کو تخفیفِ فوج کی شرط قبول کرنی پڑی تھی۔ چنانچہ ایک صلحنامے کی رُو سے نواب وزیر کو پینتیس ہزار سے زیادہ فوج رکھنے کا حق حاصل نہیں رہا تھا مگر شجاع الدولہ نے اس معاہدے کے بعد بھی اپنی فوجی قوت میں کوئی کمی نہیں کی تھی۔ چنانچہ اُن کی وفات کے وقت تمام فوجی کاروبار میں ایک لاکھ پچاس ہزار سے زائد آدمی موجود تھے جن میں سے پچاس ہزار پیدل پچیس ہزار سوار، سوا سو کے قریب عمدہ توپیں، پانچسو ہاتھی، تین ہزار گھوڑے (علاوہ اُن کے جو سواروں کے زیرِ ران تھے) پانچسو پچیس ۵۲۵ ملاح، ایک سو چونسٹھ بار برداری کے اونٹ موجود تھے۔ آصف الدولہ سیاسی میدان میں انگریزوں سے بازی ہار چکے تھے اس لئے اُن کے دل میں استحکامِ قوت کا خیال مشکل ہی سے پیدا ہو سکتا تھا۔ اگرچہ اُن کے عہد میں تقریباً اُسی قدر فوج برقرار رہی جو شجاع الدولہ کی وفات کے وقت موجود تھی لیکن اس میں ایک زبردست تبدیلی یہ واقع ہو گئی کہ جان برسٹو کے ایماء سے اس کے افسر انگریز مقرر کر دیئے گئے اور وہ توپخانہ بھی جسے فرانسیسیوں نے تربیت دی تھی، انگریز افسروں کے ہاتھ میں آ گیا تھا [۲] مزید براں سعادت علی خان کے عہد میں صلحنامہ ۱۸۰۱ء کی رُو سے برطانیہ کو ملکِ اودھ میں انگریزی فوج رکھنے کی عام اجازت ہو گئی تھی اور نواب وزیر سوائے اس انگریزی فوج کے کوئی دوسری سپاہ ملک میں رکھنے کا مستحق نہ تھا۔ چنانچہ اُس نے اپنی تمام فوج برخاست کر کے صرف چار پیدل پلٹنیں، ایک نجیبوں اور میواتیوں کا دستہ، دو ہزار سوار اور تین سو توپچی باقی رہنے دیئے جن کی مجموعی تعداد تیس ہزار تھی۔ اِن فوجی دستوں کا مقصد کارزار نہ تھا بلکہ ان سے جلوس اور میلوں کے انتظامات، باغی تعلقداروں کی سرکوبی اور ریاست کے محاصل کی وصولیابی کا کام لیا جاتا تھا اس فوج کے بیشتر حصے مختلف نظامتوں سے منسلک تھے اور عموماً ناظم ہی ان کی نقل و حرکت کے احکامات

صادر کیا کرتے تھے۔ اس فوج کی حقیقت نائٹن نے یہ بیان کی ہے کہ:

"در حقیقت اودھ میں جو فوج تھی وہ کسی شمار قطار میں نہ تھی کمپنی کی فوج البتہ کارآمد اور یلغار کرنے والی تھی مگر وہ صاحب رزیڈینٹ کے تحتِ اقتدار وانتظام میں تھی۔ باقی بادشاہی فوج گنتی گنانے کو تھی اگرچہ اس میں پیدل بھی تھے، سوار بھی تھے، توپخانہ بھی تھا اور مجموعی تعداد بھی چالیس ہزار تھی۔ اس بادشاہی فوج میں بعض کی وردیاں اور ساز وسامان جیسا تھا اور بعض کا اسی طرح کا تھا جیسا کمپنی کی فوج میں تھا۔ اس فوج کا سپہ سالار نواب کا بیٹا تھا اور جنرل راجہ بختاور سنگھ تھا۔ [۱]

اودھ کی یہ غیر منظم فوجی جماعت بھی جو ایک حد تک جنگ آزمائی کے قابل نہ تھی انگریزوں کو برابر کھٹکتی رہی چنانچہ جب کوئی بادشاہ اس کی تنظیم کی طرف توجہ کرتا تو صاف صاف یا اشاروں میں انگریز اپنی برہمی کا اظہار ضرور کردیتے تھے۔ چنانچہ جب واجد علی شاہ نے انتظامِ حکومت ہاتھ میں لے کر کچھ سرگرمیاں دکھائیں، فوج کی درستی کی طرف توجہ کی اور کچھ مضبوط سپاہیوں کے چند دستے بھرتی کرکے ان کو نئے انداز پر تعلیم دینی شروع کی تو نواب علی نقی خاں نے رزیڈنٹ کی مرضی سے مطلع کرکے بادشاہ کو اس ارادے سے باز رکھا۔ بہرحال سعادت علی خاں کے عہد سے اودھ میں کوئی فوجی قوت باقی نہ رہی تھی۔ پھر بھی اس منظم اور غیر منظم جماعت کی تعداد ۱۸۵۴ء میں ستر ہزار نو سو چھپن ۶۷۹۵۶ تھی جس میں بیس ہزار تو باقاعدہ فوج تھی اور باقی ان سپاہیوں پر مشتمل تھی جو صوبوں میں پولیس اور مالگذاری کے افسران کے ماتحت رہتے تھے۔ سلیمین نے اپنی رپورٹ میں اس کی تعداد اٹھاون ہزار نو سو چار (۵۸۹۰۴) بتائی ہے جس کا صرفہ تقریباً بیالیس لاکھ روپے تھا [۲] اودھ کے ان معمولی فوجی سپاہیوں کو عموماً پانچ روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ اس زمانے میں انگریزی فوج کے دیسی سپاہی سات روپے مشاہرہ پاتے تھے۔ اس دو روپے کے فرق کے باوجود اودھ کے سپاہی اپنی ملکی فوج ہی میں رہنے کو ترجیح دیتے تھے [۳]

عدالت اور پولیس آصف الدولہ نے اپنے عہدِ حکومت کے آغاز ہی میں مسائلِ شرعیہ کے فتووں اور عدالت کے احکام کا کام مفتی غلام حضرت کے سپرد کردیا تھا لیکن پھر اپنی مسند نشینی کے آٹھویں سال یعنی ۱۱۹۷ھ/۱۷۸۳ء میں عدالتِ قانونی قائم کرکے مختلف صوبوں میں چیف جسٹس اور نظامتوں میں قاضی اور مفتی مقرر کردیئے تھے۔ خاص لکھنؤ میں بھی حیدر بیگ خان نائبِ مملکت نے اوّل مولوی محمد مبین کو شہری جج کی حیثیت سے متعین کیا تھا اور اُن کے بعد اُس عہدے پر محمد نصیر خاں کا تقرر عمل میں آیا تھا لیکن جب کچھ زمانے بعد وہ ترکِ سکونت کرکے بنارس چلے گئے تو ٹکیٹ رائے نے مفتی غلام حضرت کو دوبارہ یہ کام سپرد کردیا تھا۔ [۱]

نواب سعادت علی خاں نے عدالتوں کو تین شعبوں میں منقسم کردیا تھا یعنی فوجداری کا کام کوتوالِ شہر سے متعلق تھا جس کے مہتمم ابتدا میں میر بہادر علی اور میر خیرات علی ہوئے تھے۔ لیکن بعد میں اوّل خواجہ محمود کو اور پھر دھومی بیگ کو کوتوال بنادیا تھا۔ دُوسرا شعبہ عدالتِ دیوانی کا تھا جو پہلے مولوی سُبحان کے اور پھر مولوی ظہور الدین کے سپرد رہا۔ تیسرا شعبہ عدالتِ مرافعہ کا تھا جسے نواب وزیر نے خود اپنے ذمّے رکھا تھا۔ اس عدالت کا اجلاس ہفتہ میں ایک دِن حُسن باغ میں ہوتا تھا [۲] غازی الدین حیدر کے زمانے میں اعلانِ بادشاہت کے بعد کچہریوں کے نام دارالانشاء، دارالاجراء، صدر الصدوری، کچہری سلطانی، دفترِ نظامت دفترِ جرنیلی، دفترِ دیوان خانہ وغیرہ ہوگئے تھے۔ اِن عدالتوں کی تعداد اور ان کے حُکّام کی قابلیت میں رفتہ رفتہ اضافہ ہوتا رہا حتیٰ کہ واجد علی شاہ کے عہد میں اودھ کی ان تمام چھوٹی بڑی عدالتوں میں اکسٹھ حکّام مقدمات کی سماعت کرتے تھے۔ ان عدالتوں کے ماتحت بہتّر امین بھی مقرر تھے جن سے عموماً تحقیقات اور فیصلوں کا کام لیا جاتا تھا [۳] خاص دارالسلطنت میں جو عدالتیں قائم تھیں وہ اپنی کارکردگی کے لحاظ سے زیادہ اہم تھیں۔ جنرل آؤٹرم نے اپنی رپورٹ میں اُن کی تقسیم اس طرح بیان کی ہے :-

۱۔ عدالتِ العالیہ:۔ سب سے اعلیٰ عدالت تھی جو مجتہد العصر کے صاحبزادے مُنصف الدولہ کے ماتحت تھی۔

۲۔ عدالتِ کوتوالی:۔ یعنی مخصوص عدالتِ پولیس جو محمد علی رضا کے ماتحت تھی۔

۳۔ عدالتِ درخواست:۔ جس میں قرضے وغیرہ کے مقدمات دائر ہوتے تھے۔ یہ عدالت اسد بیگ کے ماتحت تھی۔

۴۔ عدالتِ دیوانی:۔ جس کی صدارت بادشاہ کے ذمے تھی لیکن اُن کے نمائندے کے طور پر داروغہ انجم الدولہ فیصلے صادر کرتے تھے۔

۵۔ عدالتِ دیوانی دوم:۔ جو وزیر السلطنت کی صدارت میں تھی لیکن اُن کی جانب سے وزیر خاں اس کی نگرانی کرتے تھے۔

۶۔ عدالتِ خُفیہ:۔ جس میں قرضے کے چھوٹے معاملات طے ہوتے تھے۔

۷۔ عدالتِ مخصوصۂ معتمد:۔ یہ خدمت راجہ کُندن لال کے سپرد تھی لیکن اُن کی طرف سے پورن چند اس کی نگرانی کا کام کرتا تھا۔

۸۔ تین عدالتیں:۔ علی واجد، محمد حیات اور امین علی کے ماتحت تھیں۔ ان میں وہ مقدمات طے ہوتے تھے جن میں کوئی ایک فریق سرکارِ برطانیہ کا ملازم ہوتا۔

۹۔ عدالت العالیۂ مخصوصہ:۔ جس میں دیوانی اور مذہبی معاملات کے متعلق اپیل دائر ہوتی تھی۔ یہ عدالت مجتہد العصر کے ماتحت تھی۔

۱۰۔ مُشیرِ بادشاہ:۔ اس کا کام بادشاہ کے سامنے وہ کاغذات پیش کرنا ہوتا تھا جن پر شاہی دستخط ضرور ہوتے تھے [۱]

۱۱۔ ادنیٰ درجے کی عدالتوں کا تذکرہ یہاں ضروری نہیں سمجھا گیا۔

ان عدالتوں کے حدود، اختیارات اور طریق کار کے متعلق صاحب مراۃ الاوضاع نے جو تفصیل دی ہے وہ ان کی کارکردگی کو سمجھنے کے سلسلے میں بڑی مفید ہے۔ ہم ذیل

میں اُس عبارت کا اُردو ترجمہ درج کرتے ہیں :۔

• اخذِ محصول ، بیع شرعی ، ہبہ و رہنِ مکانات ، انفصالِ مُقدّماتِ قرضہ و تنازعِ مکانات اور تقسیمِ ترکہ وغیرہ کے معاملات عدالت العالیہ سے متعلق ہیں ۔ اس محکمے کے قاضی مذاہبِ حنفیہ اور اثنا عشریہ کے مقرّر ہیں ۔ اگر متخاصمین میں سے دونوں فریق سُنّی المذہب ہوتے ہیں ، یا ایک فریق حنفی اور دوسرا ہندو ہوتا ہے تو ایسا مقدمہ مفتیانِ مذہبِ حنفی کے رُوبرو دائر ہوتا ہے ۔ اسی طرح وہ مقدمات جن میں دونوں فریق شیعہ یا ایک شیعہ اور ایک حنفی یا ہندو ہوتا ہے تو اُن کی تجویز اور فیصلہ مُفتیانِ مذہبِ اثنا عشری دیتے ہیں ۔ داروغۂ عدالت کو فیصلۂ مُفتیان کے رَدّ کرنے کا حق حاصل نہیں ہے ۔ سرکاری حُکم کے مطابق مُقدّماتِ فوجداری بھی اسی عدالت میں دائر ہوتے ہیں اور اُن کا فیصلہ بھی حسبِ دستورِ مذکورہ انہیں دونوں مذاہب کے مُفتیوں کی تجویز کے مطابق صادر ہوتا ہے ۔ لیکن اِس عدالت کو ابتدائے ظہورِ واقعات میں دخل دینے کا حق حاصل نہیں ہوتا ۔ چنانچہ ایسے قضیات پہلے کوتوالِ شہر کے پاس جاتے ہیں اور پھر وہ گرفتاری کے بعد سرکاری حکم کے مطابق یا رضامندیِ فریقین سے اُن کو عدالتِ مذکورہ میں بھیج دیتا ہے ۔ اگرچہ عدالت العالیہ کا مرافعہ مجتہد العصر کے محکمے سے متعلق ہے لیکن پھر بھی یہ امر مستقل نہیں کیونکہ بارہا ایسا بھی مشاہدے میں آیا ہے کہ اگر متخاصمین میں سے کسی ایک فریق کو بھی قبلِ فیصلہ عدالت العالیہ سے اپنی ناکامی کا اندیشہ ہوا ہے اور اس نے مجتہد العصر کے نام عرضی دے کر اپنا مقدمہ اُٹھوانے کی خواہش کی ہے تو اس کا مقدمہ عدالت العالیہ سے اُٹھ کر مجتہد العصر کی عدالت میں چلا گیا ہے اور وہاں اُس پر فیصلہ صادر ہوا ہے ۔

مجتہد العصر کی عدالت کو ماتحت عدالتوں کے فیصلے کے انتظار کی بھی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ مدّعی اور مدعا علیہ بغیر محکمۂ عدالت العالیہ میں جائے ہوئے اپنے نزاعات

کی نالش مجتہد العصر کے محکمے میں کر سکتے ہیں۔ مزید برآں یہ بھی لازمی نہیں ہے کہ اگر سکنائے شہر اپنے استغاثے کو عدالت العالیہ میں لے گئے ہیں تو پھر اُس کے ماسوا کوئی دوسری عدالت اُسے نہ سُن سکے۔ یہ تخصیص مکانات کے بیع وخرید کے معاملات میں نہیں ہوتی جن میں رسوم ابواب مقدمہ کے علاوہ مکانات کی زرِ قیمت کا چہارم ایسے مکانات کے سلسلے میں جو گنجیاتِ شہر میں واقع ہیں اور دو آنے فی روپیہ ایسی ملکیت کے لئے جو منڈیوں میں موجود ہیں داخل کرنا ہوتا ہے۔ ان مقدمات کے علاوہ دوسرے دعوے مثل نالشِ قرضہ و امانت، تنازعِ حدود، مکانات وغیرہ دوسری عدالتوں یعنی کچہری دیوانِ عام سلطانی (متعلقۂ انجم الدولہ) اور کچہری دیوانخانۂ وزارت وغیرہ میں بھی دائر ہو سکتے ہیں۔ البتہ تنازعِ نکاح و تقسیم ترکہ جن کا تصفیہ بنا بر شرع ہونا واجب ومختص ہوتا ہے، مجتہد العصر کے محکمے ہی سے متعلق ہیں بعض ساکنانِ شہر تخفیفِ زرِ محصول حاصل کرنے کے لئے ہبہ و رہنِ مکانات کا اظہار عدالت العالیہ میں نہیں کرتے بلکہ رہن نامے اور ہبہ نامے پر مجتہد العصر کی مہر لگوا دیتے ہیں اور یہ مُہر مثل رجسٹری کے شہادتِ کامل متصور ہوتی ہے۔" [۱]

عدل وانصاف ہی کے ذیل میں ایک مخصوص محکمہ "اخبار نویس" کا قائم تھا۔ یہ ایک سپرنٹنڈنٹ جنرل کے ماتحت ہوتا تھا اور اس کا عملہ جس کے کارکنوں کو چار روپے سے پندرہ روپے ماہوار تک تنخواہ ملتی تھی مختلف محکموں کی نگرانی کرتا تھا۔ اس کے ذریعہ سے تمام جرائم کی اطلاع دربار تک پہنچ جاتی تھی۔ نواب سعادت علی خاں نے اس محکمے میں بہت نمایاں اضافے کئے تھے۔ اُنہوں نے سرکاری عہدہ داروں کے نیک و بد کی اطلاعات کے لئے اضلاع میں ہرکارے مقرر کئے تھے اور کوئی سرکاری سررشتہ ایسا نہ تھا جہاں یہ ہرکارے متعین نہ ہوں۔ ان کے ذریعہ سے ریاست کے سود و زیاں اور دوسرے اُمور کی خبریں دارالاخبار کے افسرِ اعلیٰ کے پاس پہنچتی تھیں اور وہ پرچۂ اخبار نواب کے حضور میں پیش کر دیتا تھا۔

لیکن زیادہ اہم خبریں نواب ہی کو براہِ راست بھیجی جاتی تھی [۱] واجد علی شاہ کے عہد میں چھ سو ساٹھ اخبار نویس موجود تھے جن کی مجموعی ماہواری تنخواہ تین ہزار ایک سو چرانوے (۳۱۹۴) روپے تھی۔ مختلف نظامتوں، تحصیلوں اور تھانوں سے روزنامچوں کی نقلیں دفترِ اعلیٰ میں پہنچتی تھیں جہاں صدرِ شعبہ خاص خاص رپورٹوں کو اخذ کر کے وزیر کے سامنے پیش کر دیا تھا۔ وزیر ان کی تحقیقات، سزاؤں اور راضی ناموں کو اپنے نائبوں کے پاس بھیج دیتا تھا اور عموماً وہیں اُن پر احکام صادر کئے جاتے تھے۔ شاید ایک چوتھائی سے کم معاملات ایسے ہوتے ہوں گے جن پر خود وزیر السلطنت ہی کو حکم دینا پڑتا ہوگا۔ [۲]

جہاں تک پولیس کا تعلق ہے اس کا انتظام ایسا مکمل نہ تھا جیسا کہ محکمۂ اخبار نویسی کا تھا۔ مفصلات میں پولیس، ناظم کے ماتحت تھی اور اپنی حدودِ نظامت میں وہی اُس کے متعلق حکم احکام صادر کرتا تھا۔ خاص لکھنؤ کی پولیس کوتوالِ شہر کے ماتحت تھی جس کا کام صرف مجرموں کی گرفتاری ہی نہ تھا بلکہ ایک مجسٹریٹ کے اختیارات بھی اُسے تفویض تھے۔ وہ شہر کے مختلف تھانوں اور فوجداری کے بعض مقدموں کا فیصلہ خود ہی صادر کر دیتا تھا۔ اس انتظامی عملے کے علاوہ اپنی سرحدی پولس بھی اودھ میں موجود تھی جس کا قیام جنوری ۱۸۴۵ء سے عمل میں آیا تھا۔ یہ پولس اوّل اوّل پانچسو سپاہیوں اور سو سواروں پر مشتمل تھی لیکن واجد علی شاہ نے اس میں توسیع کر کے ساڑھے سات سو سپاہی اور ڈیڑھ سو سواروں تک اسے پہنچا دیا تھا۔ ان پر سالانہ صرفہ ستتر ہزار باسٹھ روپے ہوتا تھا۔ اس عملے کا کام اُن مجرموں کو گرفتار کرنا تھا جو یا تو برطانوی مقبوضات میں ٹھگی یا دوسرے جرائم میں ماخوذ ہو کر اِدھر آجاتے تھے یا پھر اودھ میں جرائم کا ارتکاب کر کے انگریزی علاقے میں پناہ لینے کی کوشش کرتے تھے۔ پولیس کا یہ شعبہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں بہت مستعد تھا [۳]

رفاہِ عام اور مصرفِ خیر

اودھ میں شاہی محلوں، خانہ باغوں اور مقبروں کے خرچ اخراجات کے علاوہ رفاہِ عام اور خیر و خیرات کی مدّیں بھی ہر سال لاکھوں

روپیہ صرف ہوتا تھا۔ چنانچہ اُس زمانے میں بہت سے پُل بنائے گئے، سڑکیں تیار ہوئیں، کئی عمدہ درسگاہیں قائم ہوئیں، شفاخانے اور خیرات خانے کھولے گئے اور متعدد مسجدیں، امام باڑے اور کربلائیں تعمیر ہوئیں۔ مصرفِ خیر کے اِن اداروں میں سے کچھ کے مستقل اخراجات کے لئے بعض بادشاہوں، نوابوں اور امیروں نے وثیقے اور اوقاف بھی چھوڑے جن سے یہ اب تک بہ سہولت چل رہے ہیں۔

سڑکوں اور پُلوں کی تیاری اور مرمت کے لئے ہر سال حکومت کی طرف سے معتدبہ رقم منظور ہوتی تھی لیکن پھر بھی وسیلۂ نقل و حمل کی دُشواریاں اور ریلوں اور موٹروں کے فقدان کے باعث مُلک کے اندرونی حصّوں سے گذرنے والی ایسی عمدہ سڑکوں کی نمایاں کمی تھی جو عصرِ حاضر کی مشینی گاڑیوں کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔ تاہم بعض بڑے شہروں کے درمیان چند اچھی سڑکیں بھی موجود تھیں۔ مثلاً سب سے نفیس پختہ سڑک وہ تھی جو لکھنؤ اور کانپور کو ملاتی تھی۔ اس سڑک کو نواب امین الدولہ نے اپنے زمانۂ وزارت میں دو لاکھ روپے سے زائد صرف کرکے ۱۸۴۳ء میں مکمل کرایا تھا۔ اس کے علاوہ لکھنؤ سے سیتاپور اور لکھنؤ سے فیض آباد جانے والی سڑکیں بھی کسی حد تک غنیمت ہی تھیں۔ ان میں سے موخر الذکر کو واجد علی شاہ نے نئے سرے سے پختہ بنوانا شروع کردیا تھا جو انتزاعِ سلطنت کے بعد مکمل ہوئی تھی۔ مُلک کے اندرونی علاقوں میں جانے والی شاہراہیں اور راستے اُس عہد کی عام مستعملہ سواریوں کی مناسبت سے بُری نہ تھیں۔ اُن شاہراہوں کو موجودہ ترقی یافتہ سواریوں کے معیار پر ہمیں جانچنا نہیں چاہیئے۔

سڑکوں کے علاوہ پُلوں کی تعمیر پر بھی حکومت متوجہ رہی جس کی وجہ سے کانپور جانے والی سڑک پر کئی عمدہ پُل تعمیر ہو گئے تھے۔ اسی طرح فیض آباد روڈ پر بھی اینٹ اور چُونے کے پانچ پختہ پُل موجود تھے۔ خود شہرِ لکھنؤ میں گومتی پر دو تین عمدہ پُل تعمیر ہوئے تھے۔ جن میں سے ایک آہنی پُل غازی الدین حیدر نے صرفِ کثیر کے بعد لندن سے تیار کرا کے منگایا تھا۔ لکھنؤ سیتاپور روڈ پر پیر نگر کے قریب دیسی معماروں کے ہاتھ کا بنایا ہوا ایک پُل موجود تھا جو آصف الدولہ

کے عہدِ تعمیر کی یادگار تھا۔ یہ پُل واجد علی شاہ کے عہد تک استعمال میں رہا [۱]

اودھ کے بہت سے قصبات اور شہر مشرقی علوم کے مرکز ہونے کی حیثیت سے بہت مشہور تھے۔ جن میں لکھنؤ، فیض آباد، بلگرام، کاکوری، سندیلہ، ملیح آباد، ردولی، گوپامئو جائس، نصیر آباد، خیر آباد اور سہالی خاص تذکرے کے مستحق ہیں۔ حکمرانِ وقت نے ان تمام علمی مراکز کی بھی ہمت افزائی کی اور ان کے علاوہ بعض تعلیمی ادارے خود بھی قائم کئے مثلاً غازی الدین حیدر نے ایک مدرسے کی بنیاد ڈالی۔ پھر نصیر الدین حیدر نے رصد خانۂ سلطانی میں علمِ ہئیت کے طلباء کی تربیت کا بندوبست کرایا اور ایک انگریزی اسکول بھی رزیڈینٹ کے زیرِ انتظام جاری کیا۔ امجد علی شاہ نے بھی اپنے عہدِ حکومت میں مدرسۂ سلطانی کی بنیاد ڈالی جس میں بقول کمال الدین حیدر ہزارہا طالب علم داخل ہوئے۔ ہر طالبِ علم کو پانچ روپے ماہوار وظیفہ ملتا تھا اور ہر تین طلباء پر ایک مدرس متعین تھا۔ زمانۂ شاہی میں اودھ میں مشرقی تعلیم کی جو آسانیاں موجود تھیں اُن کا اعتراف سلیمین جیسے مخالفِ اودھ نے بھی کیا ہے وہ لکھتا ہے کہ،

"مسلمان شرفا چاہے کسی مُلک میں ملازم ہوں اپنے خاندان، اودھ ہی میں رکھنا پسند کرتے ہیں اور خود بھی دورانِ ملازمت جو کچھ کماتے ہیں اُسے اودھ ہی میں رہ کر صرف کرنا چاہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری قلمرو کے مقابلے میں وہاں انہیں ایک بہتر سوسائٹی مل جاتی ہے جو اُن کے مذاق کے عین مطابق ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں اُنہیں اپنے بچّوں کی تعلیم کے لئے بھی وہاں بہتر ذرائع میسر آجاتے ہیں۔" [۲]

اودھ کے شاہی دَور میں ترقیِ تعلیم کے علاوہ خیر و خیرات کے بھی بہت سے کام سرانجام پائے مثلاً ریاست کی سالانہ آمدنی کا ڈھائی فیصد بطورِ زکوٰۃ نکالا جاتا تھا، جو محتاجوں، مفلسوں اور حاجت مندوں میں تقسیم کردینے کے خیال سے مجتہد العصر کے سپرد کر دیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ ہر حکمران نے اپنے عہد میں کچھ نہ کچھ ایسے ہی کام اور بھی کئے تھے جن سے اُن کی نیّتِ خیر کا ثبوت مہیّا ہوتا ہے مثلاً آصف الدولہ نے عتباتِ عالیات میں ایک زبردست کاروان سرائے تعمیر

کرائی تھی جس میں ایک خلقت آکر ٹھہرتی تھی اور روزِ قیام سے روزِ وداع تک ہر شخص کے حسب مرتبہ اُس کے مصارف کا انتظام ہوتا تھا۔ آصف الدولہ ہی نے دریائے فرات سے نجفِ اشرف تک کہ جس کا فاصلہ بتیس۳۲ کوس تھا بذریعہ نہر پانی کا انتظام کرایا تھا[۱] اُنہوں نے لکھنؤ میں بھی اپنے جوشِ عقیدت اور غربا پروری کے خیال سے امام باڑہ اور مسجدِ آصفی تعمیر کرائے تھے جن کی تعمیر و تزئین پر لاکھوں روپیہ صرف ہوا تھا۔ ان دونوں عمارتوں کی وجہِ تعمیر کے متعلق جو روایت عام طور پر مشہور ہے یعنی رعایا کو قحط کی تکالیف سے بچانے کے پیشِ نظر یہ عمارتیں شروع کرائی گئی تھیں، وہ بات بھی نواب کی غربا پروری پر دلالت کرتی ہے۔ اس امام باڑے کے متصل ہی ایک شفاخانہ اور ایک مسافر خانہ بھی کم حیثیت لوگوں کے لئے تعمیر کرایا گیا تھا کہتے ہیں کہ نواب آصف الدولہ کی والدہ یعنی نواب بہو بیگم صاحبہ نے ستر لاکھ روپیہ انہیں امور کے لئے رزیڈینٹ کی تحویل میں دے دیا تھا جس کی تقسیم اس طرح کی تھی کہ تین لاکھ روپے تو ان کے مقبرے کی تعمیر کے لئے مخصوص تھے، ایک لاکھ روپیہ برائے نذرانہ ذاکر علمائے معلّٰی و نجفِ اشرف تھا اور باقی تمام رقم وثیقہ دار ثار کے لئے تھی جس سے چوبیس ہزار سات سو اڑتالیس (۲۴،۷۴۸) روپے ماہوار وظائف تقسیم کئے جاتے تھے۔ بہو بیگم صاحبہ نے اپنے مقبرہ کے اخراجات کے لئے دس ہزار روپے سالانہ آمدنی کے دیہات بھی چھوڑے تھے۔ اس مد پر خرچ ہو کر جو رقم بچ جاتی تھی وہ بھی اُن غُربا میں تقسیم کر دی جاتی تھی جو مقبرہ میں رہتے تھے۔ آصف الدولہ کے بعد سعادت علی خاں نے بھی اپنے عہد میں اسی نوعیت کے بعض امورِ خیر سرانجام دیئے مثلاً درگاہِ حضرت عباسؑ کی تنگ و خام عمارت کو گرا کر ایک عالیشان عمارت از سرِ نو تیار کرائی[۲] اور انہیں کے ایماء سے کربلائے تال کٹورہ تعمیر ہوئی۔ غازی الدین حیدر نے بھی تختِ سلطنت پر بیٹھنے کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ پچاس لاکھ روپے عتباتِ عالیات میں برائے خیر و خیرات روانہ کئے[۳] پھر شاہ نجف اور قدم رسولؐ کی عمارتیں تعمیر کرائیں۔ نصیر الدین حیدر بھی اپنے لاابالی پن کے باوجود احساسِ خیر و برکات سے بیگانہ نہ تھے۔

چنانچہ اُنہوں نے بھی محلّہ ارادت نگر میں ایک کربلا بنوائی اور ملک کے اپاہجوں کے لئے ایک محتاج خانہ بھی تعمیر کرایا۔ اس کے صرفے کے لئے ایک معقول رقم انگریزی خزانے میں جمع کرادی تھی جس کے منافع سے یہ ادارہ آج تک چل رہا ہے۔ علاوہ ازیں ایک دارالشفاء بھی اُنہوں نے تیار کرایا تھا جس میں انگریزی اور ہندوستانی دونوں طرح کے علاج مفت ہوتے تھے۔ انگریزی شعبے کے نگراں ڈاکٹر شیون سن اور ہندوستانی شعبے کے مہتمم مرزا علی اکبر تھے۔ کیپٹن لیو لولاڈ نے امجد علی شاہ کے زمانے میں مذکورۂ بالا محتاج خانے اور شفاخانے کو دیکھا تھا چنانچہ ان اداروں کے متعلق اُس کا تاثر یہ تھا۔

"میں نے محتاج خانے کو دیکھا جو ڈاکٹر لوگن کی نگرانی میں چل رہا ہے۔ اس میں ایک سو تیس اپاہج موجود ہیں جن میں سے اکثر نابینا ہیں۔ یہ سب صحت بخش اور صاف شفاف کمروں میں رہتے ہیں۔ ڈاکٹر موصوف انہیں کاتنے اور ہاتھ کے بعض دوسرے کاموں میں مصروف رکھتے ہیں۔ اگرچہ محتاجوں کو اوّل اوّل اس کام پر لگانے میں بڑی دقتیں ہوئیں لیکن اب انہیں کاروبار میں مشغول دیکھ کر ڈاکٹر موصوف بہت خوش ہوتے ہیں۔ ہر محتاج پر ڈھائی روپے ماہوار صرفہ ہوتا ہے۔ ۱۸۳۷ء کے قحط میں آٹھ سو سے زیادہ آدمی اس محتاج خانے میں داخل تھے۔ اس خیرات خانے سے منسلک ایک شفاخانہ بھی ہے جس میں ساٹھ سے زیادہ مریضوں کے بستر ول کا انتظام ہے۔ ڈاکٹر لوگن ہر صبح شہر کے غریب مریضوں کو مفت دوا تقسیم کرتے ہیں۔ اس اسپتال کے مفید مطلب ہونے کا یہی ایک ثبوت بہت ہے کہ گذشتہ سال میں اس سے چھ ہزار مریض شفایاب ہو کر نکلے [1]

محمد علی شاہ اپنی ابتدائے مسند نشینی سے وقتِ آخر تک اعمالِ حسنہ اور امورِ خیر و مبرات کی طرف متوجہ رہے۔ اُنہوں نے کئی لاکھ روپے کربلائے معلّیٰ میں برائے ترمیم روضۂ حضرتِ عباسؑ و درستیِ نہر، روضۂ حضرتِ حُرؑ، معرفت آغا محمد اصفہانی روانہ کئے۔ علاوہ ازیں ایک ہزار روپے مجاورین اہلِ لکھنؤ کے لئے مقرر فرمائے جن سے ہر زائر کو پانچ روپے ماہوار

وظیفہ ملتا تھا [۱]

مصارفِ خیر کے ذیل میں اودھ کے وثیقہ جات بھی خاص تذکرے کے قابل ہیں، یہاں کے بعض حکمرانوں یا اُن کے اعزہ نے وقتاً فوقتاً حسبِ توفیق کچھ رقم انگریزی خزانے میں اس نیت سے داخل کی تھی کہ اُس کے منافع سے یا تو اُن کے ورثاء، لواحقین اور خدمت گذاروں کو نسلاً بعد نسلٍ اور بطناً بعدِ بطنٍ وظائف ملتے رہیں یا پھر اُن کے جاری کئے ہوئے امورِ خیر کے مصارف پورے ہوتے رہیں۔ اودھ کے یہ مخصوص وثیقے اُمت الزہرا عرف بہو بیگم، غازی الدین حیدر، نصیر الدین حیدر، محمد علی شاہ، اور امجد علی شاہ وغیرہ کے جاری کرائے ہوئے تھے۔ اس سلسلے میں تقریباً ساڑھے تین کروڑ روپیہ انگریزی خزانے میں بشرحِ مروجہ وقت داخل ہوا تھا۔ اِس رقم کا منافع چودہ لاکھ پینتیس ہزار چار سو دس (۱۴،۳۵،۴۱۰) روپے سالانہ تھا جس سے ورثاء کے وظائف کے علاوہ حسین آباد، شاہ نجف، اور بعض دوسرے معبدگاہوں اور درگاہوں وغیرہ کے مصارف پورے ہوتے تھے۔ [۲]

شانِ ریاست

دارالسلطنت

جاگیرداری نظام میں تمام تمدنی اور تہذیبی ادارے بڑے بڑے شہروں میں بنتے تھے اور بعض اوقات سلطنتوں کے نام بھی دارالسلطنت کے ناموں سے موسوم ہوتے تھے۔ ہند اسلامی دور میں یہی صورت عام طور پر تھی چنانچہ دلّی، جون پور، مرشد آباد، اکبر آباد، گولکنڈہ، بیجاپور اور احمد نگر ایسے مقامات تھے جو صدر مقام ہونے کے ساتھ اپنی سلطنت کے تہذیبی مرکز بھی تھے۔ یہی صورت اودھ کے شاہی عہد میں بھی تھی چنانچہ اس ریاست کے اہم تہذیبی ادارے اور تمام درباری شکوہ فیض آباد اور لکھنؤ میں نظر آتی تھی۔ سلطنتِ اودھ کا پہلا تمدنی مرکز فیض آباد تھا جس کی بنیاد قدیم ہندو زیارت گاہ

"اجودھیا کے متصل برہان الملک نے ڈالی تھی۔ اوّل اوّل اس جگہ کو بنگلے کی حیثیت حاصل تھی یعنی صرف دورۂ ملک کے زمانے ہی میں یہاں قیام ہوتا تھا۔ لیکن بعد کو اسے حویلی اودھ کا درجہ مل گیا تھا۔ رفتہ رفتہ بہت سے بازار، سرکاری دفاتر، باغات اور عمارتی اضافے ہونے کے بعد صفدر جنگ کے عہد میں اسے فیض آباد کا نام دے دیا گیا تھا۔ پھر شجاع الدولہ کے عہد میں اسے اتنا عروج حاصل ہوا کہ بعض سیاحوں نے فیض آباد کو لکھنؤ پر ترجیح دی ہے۔ اسی طرح میر حسن نے بھی مثنوی گلزار ارم میں فیض آباد کی مدح و توصیف اور لکھنؤ کی مذمت کی ہے۔ اِن دونوں شہروں کی آبادی کے انداز اور ترتیب میں جو فرق تھا اُس کے کئی اسباب تھے مثلاً فیض آباد یہاں کے فرماں رواؤں کی تجاویز اور خاکوں کے مطابق تعمیر ہوا تھا۔ اس لئے اُس کے بازار، باغات اور عمارتیں متناسب طور پر جوابی انداز میں بنائی گئی تھیں۔ شاہی محلات بھی اپنی وسعت و کشادگی اور عمارتی عظمت و جبروت سے عاری نہ تھے۔ برخلاف اس کے لکھنؤ قدیم زمانے سے ایک ناہموار زمین پر آباد چلا آرہا تھا جس میں دربار کے منتقل ہو جانے پر حسب ضرورت بعض تعمیری اضافے کر لئے گئے تھے لیکن قدیم محلوں اور مکانوں کو منہدم نہیں کرایا گیا تھا۔ اس لئے فیض آباد لکھنؤ کے مقابلے میں زیادہ شاندار تھا۔ فیض بخش نے ۱۱۸۳ھ / ۱۷۶۹ء میں جب کہ اس شہر کی زندگی کو شروع ہوئے چار سال گذرے تھے اس کی وسعت، بازاروں کی کشادگی اور زندگی کی چہل پہل کی تصویر اس طرح پیش کی ہے:۔

"جب شجاع الدولہ نے فیض آباد کو دارالسلطنت بنایا تو اُنہوں نے برہان الملک کے قلعہ کی دیواریں از سرِ نو تعمیر کرائیں۔ اُنہوں نے مغلوں کے مکانات مسمار کرا دیئے اور اپنے بعض ذاتی ملازموں کو اس احاطے سے باہر مکانات بنا لینے کا حکم دیا۔ ایک وسیع میدان جو قلعے کے دونوں طرف دو دو میل سے زیادہ تھا محفوظ کر لیا اور اس کے چاروں طرف ایک گہری خندق بنا دی۔ اس میدان کے وسط

میں اُن کے خانگی ملازمین اور فوجی افسروں نے اپنے رہنے کے لئے مکانات اور نشست گاہیں جتنی کشادہ وہ چاہتے تھے بنالیں۔ شب و روز آدمیوں کے قافلے، فوجی سپاہی، غیر فوجی عہدے دار، اور ہر قوم و ملت کے تاجروں کے آنے کا ایسا تانتا بندھ گیا تھا کہ یہ وسیع زمین بھی اپنے باشندوں کے لئے تنگ نظر آنے لگی تھی۔ چند سال بعد اُس پہلے حصار کے علاوہ دو اور فصیلیں شہر پناہ کے طور پر تعمیر ہوئیں۔ ایک فصیل نے تین طرف سے ایک وسیع رقبے کو جو طولاً اور عرضاً دو دو میل تھا احاطہ کر لیا تھا اور دوسری فصیل جو تقریباً ایک میل کے پھیلاؤ میں تھی قلعے اور بیرونی حصار کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ اسی سال ترپولیہ چوک میں واقع ہے اور چوک بازار جو قلعہ کے جنوبی دروازے سے شروع ہو کر سڑک الٰہ آباد کے ٹکڑے تک چلا گیا ہے تعمیر ہوئے۔ یہ دونوں مقامات اتنے چوڑے تھے کہ دس بیل گاڑیاں آسانی سے برابر برابر چل سکتی تھیں۔ فصیلِ شہر کا عرض درمیان میں دس گز سے کم نہیں ہے لیکن منڈیر تک پہنچتے پہنچتے محض پانچ گز چوڑی رہ گئی ہے۔ اس فصیل پر باقاعدہ اور بے قاعدہ دونوں قسم کی فوج کے دستے متعین رہتے تھے جن میں سے ایک سُرخ وردی میں اور دوسرا سیاہ وردی میں ملبوس ہوتا تھا۔ [۱]

• دربارِ اودھ میں بلادِ دُور و دراز کے سفیر بھی رہتے تھے۔ چنانچہ مرہٹوں، نظام علی خاں والیِ دکن، ضابطہ خاں، اور نواب ذوالفقار الدولہ نجف خاں وغیرہ کا ایک ایک سفیر مع اپنے دفاتر کے موجود تھا۔ ان کے علاوہ بہت سے دوسرے فوجی افسر بھی اپنی فوجی جمعیت کے ساتھ یہاں رہتے تھے مثلاً میر نعیم خاں کے نشان کے نیچے ثابت خانی، بندھیل کھنڈی، چندیلہ اور میواتی سپاہی جمع تھے۔ محمد بشیر خان قلعہ دار کے پیادے اور سوار شہر کے دروازوں اور فصیلوں پر متعین رہتے جن کے دفاتر اور اقامتی مکانات قلعہ کے اندر بنے ہوئے تھے۔ جب شہر پناہ میں قیام کی گنجائش نہ رہی تو سید جلال الدین خاں

اور گوپال راؤ مرہٹے نے موضع نوراہی کے پاس بود و باش اختیار کر لی تھی اور اپنے مکانات اور چھاؤنیاں وہیں بنوائی تھیں۔ جگہ کی قلت کے باعث نواب مرتضیٰ خاں بریچ، میر احمد بانسی والا، میر ابوالبرکات اور شیخ احسان، اجودھیا اور فیض آباد کے درمیان خیموں میں رہنے لگے۔ آدمیوں کی کثرت اور ہجوم کی وجہ سے چوک میں اس قدر بھیڑ لگی رہتی تھی کہ سڑک پر چلنا دشوار ہوتا تھا۔ مختلف اقسام کا ساز و سامان بڑی کثرت کے ساتھ بازاروں میں موجود رہتا۔ ایران، توران، چین اور یورپ کے تاجر بیش قیمت سامانِ تجارت لے کر فیض آباد میں آتے اور مختلف صورتوں سے معتدبہ فائدہ حاصل کر کے واپس جاتے تھے۔ وہ گروہ فرانسیسی جن میں موسیو ژان تیل (Monsieur Gentil) موسیو سوں سوں (Monsieur Sonson) اور موسیو پیدرز (Monsieur Pedrose) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں جو شجاع الدولہ کے ملازم تھے اور نواب وزیر سے نہایت یگانگت اور اتحاد رکھتے تھے۔ یہ فرانسیسی اودھ کے دیسی سپاہیوں کو فوجی تربیت دیتے تھے اور اپنی نگرانی میں اُن سے توپیں اور بندوقیں تیار کراتے تھے [۱]

فیض آباد کی شان و شوکت کی عمر تو دس سال سے زیادہ نہ ہوئی کیونکہ آصف الدولہ نے ۱۱۸۹ھ میں وارثِ سلطنت ہو کر اپنا دربار لکھنؤ میں منتقل کر دیا جس کی وجہ سے شرفاء، تجار، علماء و فضلا، صناع اور دیگر اہلِ کمال فیض آباد چھوڑ کر لکھنؤ چلے گئے جس سے فیض آباد کی عظمت و شکوہ کو گہن لگنے لگا اور لکھنؤ کے تمدن و تہذیب کا عروج شروع ہوا۔ لکھنؤ بھی زمانۂ قدیم میں ہندو مذہبی روایات کا گہوارہ رہ چکا تھا لیکن شجاع الدولہ کے زمانے تک اسے ایک معمولی شہر کی حیثیت حاصل تھی اور رونق و آراستگی کا وہ مرتبہ ابھی میسر نہیں ہوا تھا۔ جس کا آغاز آصف الدولہ کے عہد سے ہوا۔ لکھنؤ کی شہری حیثیت دارالسلطنت بننے سے پہلے کیا تھی اس کا اندازہ کرنے کے لئے ایک انگریز سیاح کا بیان نقل کیا جاتا ہے۔ اُس نے لکھنؤ کو اُس وقت دیکھا تھا جب کہ آصف الدولہ کو یہاں اقامت اختیار کئے ہوئے کچھ زیادہ زمانہ نہیں گزرا تھا اور

یہاں شہرۂ آفاق عمارات یعنی امام باڑہ، مسجدِ آصفی اور رومی دروازہ وغیرہ ابھی تعمیر نہیں ہوئی تھیں وہ لکھتا ہے:

"شہر خاصا وسیع ہے لیکن بہت بُری طرح سے آباد ہے۔ مکانات زیادہ تر کچی دیواروں کے ہیں جن پر چھپّر پڑے ہوئے ہیں۔ بہت سے مکانات تو صرف بانس کی چٹائیوں سے بنائے گئے ہیں جن پر ناریل، کھجور یا پھونس کے چھپّر ہیں۔ بہت کم باشندوں کے مکانات اینٹ کے بنے ہوئے ہیں۔ سڑکیں پیچیدہ، تنگ اور اتنی بُری حالت میں ہیں کہ میں نے ہندوستان میں کسی اور مقام پر ایسی خراب حالت میں نہیں دیکھیں۔ خشک موسم میں گرد و غبار کی کثرت اور گرمی کی شدت ناقابلِ برداشت ہوتی ہے اور برسات میں کیچڑ اتنی گہری ہوتی ہے کہ انسان گزر نہیں سکتا۔" [۱]

اِس بدرونق لکھنؤ کی ساخت اور زیبائش میں پچاس سال کے اندر ہی اندر زبردست انقلاب رُونما ہوا اور پھر وہ اس قسم کی ستائش کا مستحق ہو گیا ؎

آں لکھنؤ کہ گر ہمہ آفاق بسپری — دانی کہ اندکے ست ز بسیارِ لکھنؤ
آں لکھنؤ کہ نیست مثالش ز ممکنات — تکرینِ جنّت است بتکرارِ لکھنؤ
بر خوب و زشت آں نتواں آستیں فشاند — دامن فریب می نگرم خارِ لکھنؤ
ہر رہگذار قافلہ خیزِ صباحت است — یوسف نشین بود سرِ بازارِ لکھنؤ
از بوئے خوش گزیدہ تر آں حرفِ دلفریب — آں مشک بہ بگفت کہ عطارِ لکھنؤ
بادِ صبا بگوئے بر ہجرانِ اہلیا — حکمِ مسیح چیست بہ بیمارِ لکھنؤ

شاہی عہد کا یہ لکھنؤ جس کا رقبہ چھتیس مربع میل تھا چونسٹھ دیہات کی زمینوں پر آباد تھا۔ اُن دیہات میں سے بعض کے نام آج بھی محلّوں اور گلی کوچوں کے ناموں میں تلاش کیئے جاتے ہیں۔ اس شہر میں شاہی عہد کی طرح اب بھی دو طرح کی آبادی اور دو ہی طرح کا اندازِ زندگی نظر آتا ہے، یعنی اس کا وہ قدیم حصّہ جو پُرانے زمانے سے آباد چلا آ رہا ہے، گنجان محلّوں اور تنگ

گلیوں پر مشتمل ہے۔ لیکن وہ علاقے جو دورِ بادشاہت میں تعمیر ہوئے تھے، مغربی اور مشرقی دونوں طرز کی زندگی کے حسین امتزاج کے آثار پیش کرتے ہیں۔ اس تضاد کی بنیاد پر یہ کہنا کچھ غیر مناسب نہیں ہوگا کہ شہر کا اندرونی حصّہ بیرونی حصّے سے مطابقت نہیں رکھتا۔ شاہی عہد میں اس کا نو تعمیر خوبصورت حصّہ دریائے گومتی کے دونوں کناروں پر مسلسل چلا گیا تھا۔ یعنی داہنی طرف شاہی عمارات، سبزہ زاروں، چمنستانوں اور باغات کا متبادل سلسلہ باغ دلکشا تک پھیلا ہوا تھا جس کا فاصلہ تقریباً چھ میل ہوگا۔ دریا کے بائیں کنارے پر سرسبز و شاداب کھیتوں کے ساتھ ساتھ کچھ خوبصورت باغات، بنگلے، خانہ باغ، ایک توش خانہ اور بعض دوسری شاہی عمارتیں بھی تھیں جن کے حسین مناظر بقول لیوپولڈ ۶۰ درجہ فارن ہیٹ کی ملائم حرارت میں بعض یورپی علاقوں کی یاد دلا دیتے تھے۔ البتہ ان مناظر سے گذر کر جب شہر اپنی لاتعداد میناروں، سنہری اور سفید گنبدوں، دیوانِ شاہی کی خوبصورت بُرجیوں، عالی شان مقبروں اور پُر شکوہ مسجدوں کے ساتھ سامنے آتا تھا تو وہ تمام تصویر دیکھنے والے کو غرقِ حیرت کر کے خالص مشرقیت میں تبدیل ہو جاتی تھی [۱]

دارالسلطنت کی رونق زیادہ تر اُس کے لاتعداد گلستانوں، سبزہ زاروں، خانہ باغوں اور عمارتوں پر منحصر تھی۔ شہری آبادی کے مختلف النوع مکانات، باغات اور معبد گاہوں کو چھوڑتے ہوئے یہاں چار پانچ شاہی باغات، کئی خانہ باغ، دو وسیع رَمنے، چار شاہانہ آب و تاب کے مقابر، دو عالی شان مساجد، دو پُر شوکت امام باڑے، دو نفیس بارہ دریاں، چھ عظیم الشان محلات اور پندرہ بیس کوٹھیاں ایسی تھیں جن کے مناظر کو سامنے رکھ کر اگر کسی بلندی سے شہر پر نظر ڈالی جاتی تھی تو وہ دُنیا کے حسین و دلکش شہروں میں سے ایک نظر آتا تھا۔ لیوپولڈ نے ایسا ہی ایک دلکش منظر کیپٹن شیکسپیئر کی اقامت گاہ سے دیکھا تھا۔ وہ لکھتا ہے:

"اس مکان کے چبوترے سے تمام شہر کا ایک ایسا خوبصورت منظر نظر کے سامنے رہتا ہے جو ایک مسلسل مرقع کی شان اپنے اندر رکھتا ہے۔ اس منظر میں بہت سی

سفید مینا ریں، سنہری گنبد، مقبرے اور باغات شامل ہیں جن کو گومتی قطع کرتی ہوئی گزرتی ہے۔ یہ ایسا عجیب و دلکش منظر ہے جس میں بہت دُور تک اُس زندگی کی سرگرمیاں نظر آتی ہے جس میں اسلامی آثار بہت نمایاں ہیں۔ جب نگاہ دور دراز کے مناظر سے اردگرد کے منظر پر واپس لوٹتی ہے تو ایک حسین چمنستان کے نظارے سے جو اس محل کے چاروں طرف پھیلا ہوا ہے تر و تازہ ہو جاتی ہے۔" [۱]

لکھنؤ کے عمارتی مرقع کا تصور قائم کرانے کے لئے ہم صرف دو گوشے منتخب کر کے پیش کرتے ہیں۔ شیخ تصدق حسین اپنے مقالے میں لکھتے ہیں:۔

"اگر ہم صرف وکٹوریہ پارک ہی کی شمالی حد پر جاکر کھڑے ہو جائیں تو زمانۂ شاہی کی تعمیر شدہ خوبصورت اور عالیشان عمارتوں کا ایک دلفریب اور جاذب نظر مجموعہ آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے مثلاً داہنی طرف نواب آصف الدولہ کا مشہور عالم امام باڑہ بصد شان و رعنائی نظر آتا ہے۔ اس کے سامنے ہی ایک بلند ٹیکرہ پر حضرت عالمگیر اورنگ زیب کی رفیع الشان مسجد اپنا جھکڑا دکھا رہی ہے۔ اُدھر سے نظریں ہٹائیں تو بائیں جانب ہندوستان کا حسین ترین گھنٹہ گھر آسمان سے باتیں کر رہا ہے۔ اس کے سامنے ہی دولت خانۂ آصفی کا رفیع الشان پھاٹک ہے جس کے قریب ہی ست کھنڈے کی سربفلک عمارت ہے۔ اس کی بغل میں امام باڑہ حسین آباد ایک دلربایانہ انداز سے جلوہ گر ہے جس کا سنہری کرجی گنبد اپنی جگمگاہٹ سے آنکھوں میں چکا چوند پیدا کرتا ہے۔ اُس کی پُشت ہی پر شاہی جامع مسجد ہے جس کی گلکاری اور رنگ آمیزی آنکھوں میں کھبی جاتی ہے اور نظر کو اپنی طرف سے ہٹنے نہیں دیتی [۲]

اب مولانا شرر کے قلم سے قیصر باغ کے اطراف کی تصویر دیکھئے :۔

"قیصر باغ میں بہت سی خوشنما اور باشان و شوکت دو منزلی عمارتوں کا ایک مربع مستطیل رقبہ دُور تک چلا گیا تھا جس کا ایک رُخ جو دریا کی جانب تھا، غدر

کے بعد کھود ڈالا گیا اور تین ضلعے اب تک قائم ہیں۔۔۔ قیصر باغ کا اندرونی صحن جس میں چمن بندی تھی جلو خانہ کہلاتا تھا۔ درمیان میں پتھر والی بارہ دری تھی جو آج کل لکھنؤ کا ٹاؤن ہال ہے۔ اس میں اور کئی عمارتیں بھی تھیں جو اب باقی نہیں ہیں۔ اس کے باہر یہاں سے متصل ہی، بہت سی شاہی عمارتیں تھیں جنہوں نے اس قطعۂ زمین کو اعجوبۂ روزگار بنا دیا تھا۔ یہ عمارتیں قیصر باغ کے مشرقی پھاٹک کے باہر تھیں۔ لوگوں کو اس پھاٹک سے نکلتے ہی دونوں جانب چوبی اسکرینیں ملتی تھیں جن میں گزر کر وہ چینی باغ میں پہنچتے۔ وہاں سے بائیں ہاتھ کی طرف مڑ کر حسین پریوں کے ایک عالیشان پھاٹک پر پہنچتے جس پر مدار المہام سلطنت نواب علی نقی خاں کا قیام رہتا تھا تاکہ ہر وقت جہاں پناہ سے قریب رہیں اور بوقت ضرورت فوراً بلا لیے جا سکیں۔ اس پھاٹک کے اس طرف حضرت باغ تھا اور اندر ہی داہنی طرف چاندی والی بارہ دری تھی۔ یہ ایک معمولی اینٹ چونے کی عمارت تھی مگر چھت میں چاندی کے پتر جڑے ہونے کی وجہ سے چاندی والی بارہ دری کہلاتی تھی۔ اسی سے ملحق کوٹھی خاص مقام تھی جس میں خود جہاں پناہ سلامت رہتے اور وہیں نواب سعادت علی خاں کی بنائی ہوئی پرانی کوٹھی "بادشاہ منزل" تھی۔ پھر ان چوبی اسکرینوں کے کنارے سے نکل کے دوسری طرف مڑتے تو پیچیدہ عمارتوں کا ایک سلسلہ دُور تک چلا گیا تھا جو چولکھی کے نام سے مشہور تھیں۔ ان عمارتوں کا بانی، حضوری نائی اعظیم اللہ تھا جنہیں بادشاہ نے چار لاکھ روپے دے کر مول لیا تھا۔ نواب خاص محل اور معزز محلات عالیات اس میں رہتی تھیں۔ اس کے اندر غدر کے زمانے میں حضرت محل کا قیام رہا اور یہیں اُن کا دربار ہوا کرتا تھا۔ یہاں سے ایک سڑک قیصر باغ کی طرف آئی تھی جس کے کنارے ایک بڑا بھاری سایہ دار درخت تھا۔ اس کے نیچے گرداگرد سنگ مرمر کا ایک نفیس گول چبوترہ بنایا گیا تھا۔۔۔۔ اس چبوترے سے آگے بڑھ کے ایک عالی شان پھاٹک تھا جو لکھی پھاٹک کہلاتا، اس لئے کہ اس

کی تعمیر میں ایک لاکھ روپے صرف ہوئے تھے۔ اور اس سے بڑھ کے آپ قیصر باغ میں آجاتے۔ قیصر باغ کی عمارت میں سلطنت کے اسّی لاکھ روپے صرف ہوئے تھے۔ اور اس کے چاروں طرف کی عمارتوں میں جہاں پناہ کی بیگمیں اور پری جمال و ماہ طلعت خاتونیں رہتیں۔" [۱]

اس شاہی علاقے سے قطع نظر کر کے جب شہری زندگی پر نگاہیں پڑتی تھیں تو وہی تنگ راستے، گنجان بازار، بھری بھری دُوکانیں، لدے پھندے اونٹ، پالکی، فنیس اور ہاتھی کی سواریاں نگاہ کے سامنے آجاتی تھیں جو مشرقی طرزِ زندگی کی آئینہ دار تھیں۔ اس شہری علاقے کو دیکھ کر نصیر الدین حیدر کا انگریز مصاحب نائیٹن، نامانوس نہیں ہوا تھا اور اُس نے لکھنؤ کو مصر کے دارالسلطنت قاہرہ سے تشبیہہ دی تھی۔ یہاں کی شہری زندگی کی رونق اور چہل پہل اسی انداز کی تھی جس کا تذکرہ فیض آباد کے ذیل میں گزر چکا ہے۔ فیض آباد ہی سے شرفائے شہر، ماہرینِ فن اور صناع سمٹ کر لکھنؤ آگئے تھے۔ اور اُن کے علاوہ بعض دوسرے شہروں کی رونق نے بھی یہیں آکر پناہ لے لی تھی۔ ان سب شعبوں کے متعلق تفصیلی بحث اپنے اپنے مقام پر آئے گی۔ یہاں صرف یہ بات بیان کی جا سکتی ہے کہ جب کوئی مغربی سیاح ایک سرسری نگاہ سے لکھنؤ کا جائزہ لیتا تھا تو یہاں کے تنگ بازاروں اور تاریک گلی کوچوں میں اُسے کسی قسم کی لطافت نہیں ملتی تھی لیکن یہ تضادِ مذاق دیکھئے کہ جب ہمارے مشرقی اہلِ نظر اس شہر کے انہیں تنگ و گنجان گوشوں اور انہیں نخاس اور چوک کے بازاروں پر نگاہیں ڈالتے تھے تو انہیں اسی لکھنؤ کی دہلیز سپہرِ ثانی کی پُر بہار زندگی کی تمام تابانیاں نظر آجاتی تھیں چنانچہ رجب علی بیگ سرور۔ فسانۂ عجائب کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:-

" رشکِ گلستانِ ارم بھی جس کا خوشہ چیں ہے ... وہ بیشک لکھنؤ کی سرزمیں ہے

سبحان اللہ! لمہ! عجب شہر گلزار ہے، ہر گلی کوچہ دلچسپ باغ و بہار ہے۔ ہر شخص اپنے طور پر قطع دار ہے۔ وُہ رویہ بازار کس انداز کا ہے، ہر دکان میں سرمایۂ ناز و نیاز

کا ہے۔ ہر چند ہر محلہ میں جہان کا ساز و سامان مہیا ہے پر اکبری دروازے سے جلو خانے اور پچے پُل تک کہ صراطِ مستقیم ہے کیا جلسہ ہے۔ نان بائی خوش سلیقہ، شیرمال، کباب، نان، نہاری، جہان کی نعمت اس آبداری کی، جس کی بوباس سے دل طاقت پائے، دماغ معطر ہو جائے۔ فرشتہ گذرے تو سُونگھے، کیسا ہی سیر ہو ذرا نہ دیر ہو، دیکھے سے بھوک لگ آئے۔ وہ سُرخ سُرخ پیاز سے نہاری کا بگھار، سُریلی چھنکار۔ شیرمال شنگرف کے رنگ کی خستہ بھُربھُری، ایک بار کھائے نانِ نعمت کا مزہ پائے، تمام عمر ہونٹ چاٹتا رہ جائے۔ کباب، اس آب و تاب کی کہ مرغِ ماہی کا دل سیخِ آہ پر حسرت سے بھر گیا سے کباب، ادرک کا لچھا میاں خیر اللہ کی دُکان کا کترا، ہاضم، باریک، نایاب۔ حُسینی کے حلوا سوہن پر عجیب جوبن۔ اُس کی شیرینی کی گفتگو میں لب بند، جہان کو پسند۔ پیڑے دبیز، بسے، بلائے ہونٹ سے کھائے۔ جوزی خوب، حبشی، اہلِ ہند کو مرغوب۔ دُودھیا شیر خوار، نوشِ جاں کر جائے۔ ہر گھونٹ کی وہ تیکھی چتون آدمی صورت دیکھتا رہے۔ رُعبِ حُسن سے بات نہ کر سکے۔ دوکانوں میں انواع اقسام کے میوے قرینے سے چنے روز مرے محاورے اُن کے دیکھے نہ سُنے۔ کبھی کوئی پکار اُٹھے میاں ٹکے کو ڈھیر لگا دیا ہے کوئی موزوں طبیعت یہ فقرہ سُناتی ہے "مزہ انگور کا ہے رنگتروں میں"، کسی طرف یہ صدا آتی ہے "گنڈیریاں ہیں پونڈے کی"۔ ایک طرف تنبول سرخروئی سے یہ رمز و کنایہ کہتے، بولی ٹھولی میں چابک، ہر دم یہ دم بھرتے۔ "نگینے کا منہ کالا ہو، برگِ زرد کر ڈالا، عبیر ہے نہ گلال ہے، کتھے چونے سے آدمی میں کھرا لال ہے"۔ گلیوں میں گجردم یہ آواز آتی، "شیرمال ہے گھی اور دودھ کی، مفلس کا دل اُچاٹ، کُلّوں کی چاٹ، کدھر لینے والے ہیں، نمش کی قلفیاں کھیر کے پیالے ہیں"۔ جیٹھ بیساکھ کی وہ گرمی جس میں چیل انڈا چھوڑتی، دو پیسے کو برف کی قلفی جمی، دو کھائے بدن تھرتھرائے، زیادہ ہُوکا کرے، لقوے فالج میں مرے۔ سر چوک ہمیشہ شانے سے شانہ چھلا، نسیم و صبا کو سیدھا

رستہ نہ چلا۔ شیخ کول کی مٹھائی جس نے کھائی جہان کی شیرینی سے دل کھٹا ہوا۔ بنارس کا کھجلا بھولا، متھرا کے پیڑے کا ٹھٹھا ہوا۔ برفی کی نفاست، بوباس، دلداراپن، نقرئی ورق کا جوبن کسی شہر کا رکابدار اگر دیکھ پائے یا ذائقہ لب پر آ گئے زندگی تلخ ہو ہاتھ کاٹ کاٹ کر کھائے ـــ۔ برسات کے موسم میں شہر کا یہ عالم ادھر مینہ برسا پانی جا بجا بہہ گیا گلی کوچہ صاف رہ گیا۔ ساون بھادوں میں زردوزی جوتہ پہن کر پھرے کیچڑ تو کیا مٹی نہ بھرے۔ ساون بھادوں کے جھالے وہ رنگین جھولنے والے، دشتِ غربت میں یہ جلسے جو یاد آ جاتا ہے دل پاش پاش ہوتا ہے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔"

قصرِ شاہی اور دربار

اودھ کا پہلا ایوانِ شاہی جس کی بنیاد برہان الملک کے ہاتھوں پڑی اور جس کی تکمیل شجاع الدولہ نے کی، اپنی عظمت و شان کے اعتبار سے لکھنؤ کے شاہی محل سے کم نہ تھا۔ اُس کی وسعت و طوالت کی دلربائی کا حال فیض بخش نے بڑی تفصیل سے لکھا ہے جس کا ایک حصّہ ہم گذشتہ صفحات میں پیش کر چکے ہیں۔ آیئے اب اس کے مِٹتے ہوئے نقوش دیکھ کر ہم اس کی دیرینہ شکوہ کا تصوّر قائم کریں۔ ایک انگریز سیّاح جس نے فیض آباد کو اُس کی مرکزی اہمیت مٹ جانے کے بعد ۱۸۰۰ء کے مابین بزمانۂ بہو بیگم صاحبہ دیکھا تھا اس کے کھنڈروں کا بیان اس طرح کرتا ہے:۔

"شہر فیض آباد میں بہت سی حسین عمارتوں کے آثار موجود ہیں۔۔۔۔ میں شہر اور محل کے کھنڈر دیکھنے کے لئے جنھیں نواب شجاع الدولہ مرحوم نے تعمیر کرایا تھا روانہ ہوا۔ یہ عظیم الشان عمارت ایک وسیع ترین حصّۂ زمین کو گھیرے ہوئے ہے جس میں بہت سے قطعات ہیں اور ان قطعات میں بہت سی مختلف عمارتیں ہیں۔ اندرونی قطعہ میں دربار کے کھنڈر ہیں۔ یہ خوبصورت عمارت جو اُسی انداز پر بنی ہوئی ہے جیسی کہ ہم لکھنؤ کے شاہی محل (دولت خانۂ آصفی) کے سلسلے میں بیان کر چکے ہیں بڑی قیمتی ہے۔ اس کی تعمیر کے نقش و نگار اب بہت کچھ مٹ چکے ہیں۔ ان عمارات

میں چند حصے دفاتر اور دوسرے سرکاری کاروبار کے لئے بنے ہوئے ہیں۔ اندرونی قلعہ میں ایک وسیع عمارت ہے جس کا رُخ دریائے گنگا کی طرف ہے۔ جب یہ عمارت پہلے پہل بنی ہوگی تو بہت لاجواب ہوگی۔ یہ حصہ نواب کی ذاتی اقامت کے لئے مخصوص تھا۔ اس کے متصل کچھ اور عمارات ہیں جو زنان خانے کے طور پر استعمال ہوتی تھیں۔ اس کے اندر ایک چمنستان کے مٹے ہوئے نقوش بھی موجود ہیں۔ محل میں جانے کا راستہ ایک وسیع اور خوبصورت دروازے سے گزرتا ہے جس کی بالائی منزل میں سلاح خانہ تھا۔ اس کے اندر اب بھی ایک گارد رہتی ہے۔ دروازے کے بالائی حصے پر کبھی نوبت بجنے کا انتظام بھی تھا جو ہندوستان میں شہنشاہیت کا ایک نشان سمجھی جاتی ہے۔" [۱]

فیض آباد کے بعد لکھنؤ کا پہلا ایوانِ شاہی دولت خانۂ آصفی تھا جس کی تصویر اسی سیاح کے قلم نے اِن الفاظ میں کھینچی ہے:۔

"نواب کا محل دریا کے کنارے واقع ہے جہاں سے دریائے گومتی اور مشرقی خطۂ زمین کے وسیع مناظر صاف نظر آتے ہیں۔ اس محل کا کچھ حصہ نواب شجاع الدولہ نے تیار کرایا تھا لیکن موجودہ حکمراں (آصف الدولہ) نے اس میں بہت زیادہ اضافہ کیا ہے۔ اس احاطے میں وسیع قطعات اور ایک دربار جہاں وہ حاضرین سے آزادی کے ساتھ ملتے ہیں تیار کرایا ہے۔ یہ دربار تین محرابوں کا ایک سلسلہ ہے جو ایک دوسرے کے متوازی اور بربری (Moorish) انداز کے ستونوں پر قائم ہیں۔ اس کی چھت اور دیواریں خوبصورتی کے ساتھ ملمع کی گئی ہیں اور سجاوٹ اور گلکاری سے منقش ہیں۔ دربار تک آنے والا زینہ ایک خوبصورت چمن میں واقع ہے۔ اس چمن کا قرینہ بالکل ویسا ہی ہے جیسا کہ ہم اکثر ہندوستانی مصوری میں دیکھتے ہیں یعنی یہ مربع قطعات پر مشتمل ہے۔ اس چمنستان میں ایسی تیز خوشبو کے پھول لگائے ہوئے ہیں کہ جو ایک یورپین کے اعصاب پر فوراً حملہ آور ہوتے ہیں۔ اس عمارت کا بیرونی حصہ کچھ زیادہ توصیف کے قابل نہیں ہے۔ آگے

دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ شاید بارہویں صدی میں یورپ کا بیرنس کاسل (Baron's Castle) بھی اسی انداز کا ہوگا۔" [۱]

نواب آصف الدولہ کے بعد سعادت علی خان نے اس محل کی درباری حیثیت ختم کر کے کوٹھی فرح بخش کو قصرِ شاہی کا درجہ دے دیا تھا پھر غازی الدین حیدر اور اُن کے صاحبزادے نصیر الدین حیدر نے بہت نمایاں عمارتی اضافے کر کے اس نئے مقام کو گنجینۂ محلات بنا دیا تھا۔ نائٹین اپنی مشہور کتاب میں اِن محلات کی تفصیل اس طرح بیان کرتا ہے:۔

"مجھے ایوانِ شاہی دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کیونکہ یہ عمارت فی الحقیقت ایک محل نہ تھا بلکہ گنجینۂ محلات و قصور تھا جن کا سلسلہ دریائے گومتی کے کنارے کنارے (جس پر لکھنؤ آباد ہے) دُور تک چلا گیا ہے۔ محلِ شاہی اُودھ کا بعینہٖ وہی نقشہ تھا جیسا کہ محلاتِ شاہی قسطنطنیہ یا ایوانِ شاہِ ایران واقع طہران یا عماراتِ شاہی پکین کا سُنا جاتا ہے۔ کیونکہ کُل مشرقی سلطنتوں میں محلاتِ شاہی جو دار السلطنت میں ہوا کرتے ہیں محض بادشاہ کے قیام گاہ نہیں ہوتے بلکہ حکومت کے تمام کارخانے وہیں ہوتے ہیں۔ ایک چھوٹا سا شہر ہوتا ہے اور اس میں ایک سلسلۂ محلات ہوتا ہے جس میں حرمِ شاہی اور اُن کے حشم و خدم اور متعلقین و لواحقین ہوتے ہیں۔ پھر باغ، باغیچہ، تالاب، حوضیں، فوارے اور آبشار، چوک اور چوپڑ کے بازار۔ خاص خاص وزرائے سلطنت اور اعلیٰ حکام ملک کے مکانات بھی اُسی میں ہوتے ہیں۔ یہی حالت بجنسہٖ لکھنؤ میں تھی ...... اگرچہ قصرِ شاہی جو فرح بخش کے نام سے موسوم ہے، اُس کا بیرونی حصہ زیادہ باشان و شکوہ نہیں لیکن اُس کی وسعت و طوالت کی دلربائی نے اُس کی صنعتِ تعمیر اور شوکت سے زیادہ مجھے محوِ حیرت کر دیا ..... میں سب کے ہمراہ ایوانِ شاہی میں داخل ہوا۔ اس محل کے کمرے عام طور سے بہت وسیع اور اعلیٰ درجہ کے جھاڑ فانوس سے آراستہ تھے۔ بیش قیمت اور نفیس چوکٹوں میں بہت سی عمدہ عمدہ تصویریں اور مرقعے آویزاں تھے۔ قطعہ کرتا تو عجائب

صنعت، نوادرِ روزگار کا ایک ذخیرہ تھا جسے دیکھ کے بجائے محظوظ ہونے کے آدمی حیران و ششدر رہ جاتا تھا۔ جگمگاتے جھاڑ فانوس، صندل اور آبنوس وغیرہ نادر الوجود لکڑیوں اور ہاتھی دانت کی میزیں، الماریاں، نفیس نفیس زرہ بکتر، خود اور چار آئینہ کے جوڑ اور جواہرات سے مغرق اسلحہ، جواہر جڑی ہوئی ڈھالیں، ہر طرف انہیں چیزوں کی بہتات تھی جن کے دیکھنے سے نظر خیرہ ہوتی تھی۔ اس محل میں صرف کھانے کا کمرہ جس میں بادشاہ اپنے مصاحبینِ خاص کے ساتھ خاصہ نوش فرماتے تھے بہت سادہ سجا تھا اور سجاوٹ کی سادگی میں انگریزی کھانا کھانے کے کمروں سے کچھ فرق نہ رکھتا تھا۔ [۱]

• دوسرے دن میں نے وہ حصہ ایوانِ شاہی کا دیکھا جو اب تک میری نظر سے پنہاں تھا۔ اِس اندرونی حصے میں بھی وہی آراستگی تھی جو ایوان کے دیگر حصص میں تھی۔ یعنی بہت سے مرقع اور زرنگار آئینے اور بیش بہا نفیس شیشہ آلات سے مکان سجا ہوا تھا۔ جس میں ظاہری آب و تاب بہت تھی لیکن حسن و خوشنمائی کم تھی۔ مجھے اس قطعے کے ایک حصے کو دیکھ کے بہت ہی حیرت ہوئی۔ یہ ایک مصنوعی جھیل تھی جو تمام باغ کو چھائے ہوئے تھی۔ اِس کے بیچوں بیچ میں ایک بہت ہی خوبصورت بارہ دری بنی تھی جو کسی کنارے سے ملحق نہ تھی۔ اس بارہ دری میں باہر کی جانب نہایت نفیس رنگ آمیزی اور گلکاری کی ہوئی تھی اور اس کی وضع بڑی بانکی تھی۔ اس پر چھوٹی چھوٹی بیکلی غمزیاں اور خوبصورت خوبصورت قبّے اور منارے بنے ہوئے تھے۔ اس جھیل کا پانی ایسا صاف شفاف تھا کہ تہ تک کی سب چیزیں بلا تکلف دکھائی دیتی تھیں اور اس کے اندر بڑی بڑی سنہری اور روپہلی مچھلیاں تیرتی تھیں۔ یہ مچھلیاں ایسی نہ تھیں جیسی اکثر انگلستان میں شیشوں کی اجاریوں یا چھوٹے چھوٹے حوضوں کے اندر بند پانی میں تیرتی نظر آتی ہیں۔ بلکہ برخلاف اس کے ایک فٹ یا ڈیڑھ فٹ کی لانبی تھیں۔ اس بارہ دری تک پہنچنے کی صورت یہی تھی کہ بجرے پر سوار ہوں۔ یہ بجرا ایک کنارے سے لگا رہتا تھا اور

اس کا رُخ محل کی اُس جانب تھا جدھر سے ہم نکلے تھے۔ میرے رفیقِ طریق جو شل میرے مصاحبِ شاہی تھے اور اُن کی وقعت بادشاہ کی نظر میں مجھ سے زیادہ تھی کشتیوں میں بیٹھے اور مجھے بھی اُنہوں نے اشارے سے بُلالیا۔ ملاحوں نے بجرا کھولا اور ہم اس پرستان کی سیر کے لئے روانہ ہوگئے۔ جب کنارے پر پہنچ کر ہم اس عمارت میں داخل ہوئے تو لکھنؤ میں یہی عمارت سب سے زیادہ خوشنما معلوم ہوئی۔ اس بارہ دری میں دو کمرے تو متوسط عرض و طول کے تھے اور دونوں بے حد آراستہ تھے۔ اس میں بڑے بڑے دنگل اور کرسیاں دیواروں سے لگی ہوئی رکھی تھیں۔ بڑے کمروں میں سے ایک میں ایک میز پر پورا نمونہ محلاتِ شاہی کا بنا ہوا رکھا تھا جس میں پورے محل کے ہر ہر جزو کا نہایت باریک بینی اور دیدہ ریزی کے ساتھ چربہ اُتارا گیا تھا اور رنگ ایسے ٹھیک دیئے گئے تھے کہ گویا ہُو بہو تصویر کھینچ دی تھی۔ یہ بات تو ہندوستانی دستکاروں کا حصّہ ہے۔ اِسی نقشے میں اس بارہ دری کی نقل جو ایک اخروٹ سے بڑی نہ تھی اس خوبی سے اتاری تھی کہ اِس کی جزئی سجاوٹ تفصیل وار مع کمروں کے دکھلائی گئی تھی۔ کوئی چیز چھوڑی نہ تھی۔ بارہ دری میں کھڑے ہوکر صاف شفاف پانی کا نظارہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا پرستان میں گذارا ہوگیا ہے۔ جھیل میں مچھلیوں کا سیماب وشی سے اِدھر اُدھر تیرنا، ڈوبنا، اور اُبھرنا، بجرے کی سجاوٹ، ساحل پر رنگ برنگی پھولوں کی گوٹ اور اُن کے اِردگرد لانبی گھاس اور گھنی جھاڑیاں جھنکاڑیاں جن میں پھول چھپے ہوئے تھے اور جن کی وجہ سے گردو پیش کی عمارتیں نظر سے پوشیدہ ہوگئی تھیں یہ سارا سماں مجھے اس قدر دلفریب و دلکش معلوم ہوا کہ اگر میں بادشاہ ہوتا تو سارے ایوانِ شاہی کو چھوڑ کر اسی بارہ دری میں بود و باش اختیار کرتا۔ بادشاہ سلامت اب یہاں کبھی کبھار آجاتے ہیں اور اس وجہ سے بے توجہی کے علامات رُونکار ہونے لگے ہیں۔" [۱]

قصرِ شاہی یعنی فرح بخش کے متعلق نائٹین لکھتا ہے کہ:۔

دربار

• اِس کی وسعت اور گنجائش، اس کے متعدد قطعے اور ہر قطعہ میں اچھے خاصے صحن، اس کے تالاب یا آراستہ حوض، اس کے مختلف باغیچے اور چمن، اور اس کے لانبے لانبے شاگرد پیشہ کے مکانات ایک نظر دیکھ لینے سے صرف اس کی بیرونی شوکت اور اوپری اوپر کی حالت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کے درون دروازوں کے بھاری بھاری پردے، اس کی دیواروں پر گنگا جمنی ملمع کاری اور رنگ آمیزی، اس کی زرق برق آرائش وزیبائش، اس کے ذخیرۂ زوارات و عجائبات صنعت، اس کے نظر خیرہ کرنے والے جھاڑ فانوس، کنول، ہر رنگ کر دیکھ کے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قصرِ شاہی کے اندر کیا کچھ ہے اور کن مخصوص چیزوں سے اس کی نمود ہے۔

اس کوٹھی میں وہ کمرہ بھی ہے جس میں تختِ شاہی رکھا تھا۔ اس کمرے کی دیواروں پر چھچھاتے ہوئے سُرخ رنگ کے زربفتی پردے پڑے ہوئے تھے جو بجائے خود فریبندہ و دلچسپ تھے۔ دیواروں پر اِدھر اُدھر کی طرف جو کھڑکیاں تھیں ان سے بہت پاک و پاکیزہ ہلکی ہلکی روشنی پھیلتی تھی کہ جس سے شاہی دربار کا جبروت دوبالا ہو جاتا تھا۔ انہیں پردوں کے بیچ بیچ میں شاہانِ اودھ کی چند قدِ آدم تصویریں بھی دکھائی دیتی تھیں۔ یہ تصویریں بکسی طرح بُری نہیں کہی جا سکتی تھیں اور پادری بشپ ہیبر صاحب نے یہ بہت منصفانہ بات کہی ہے کہ غازی الدین حیدر اوّل شاہِ اودھ کی تصویر جس مصور نے کھینچی ہے وہ اگر لندن یا پیرس جاتا تو وہاں بھی نام و نمود پیدا کرتا۔ اس وسیع دالان کے ایک سرے پر جو ذرا بلند تھا تختِ شاہی رکھا ہوا تھا اور وہ بہت ہی گراں بہا تھا۔ وہ بالکل ایک چبوترے کی قطع کا تھا جو وسعت میں ۸ گز مربع اور فرش سے چند فٹ بلند تھا۔ اس کے سامنے کی طرف چند سیڑھیاں طے کر کے اس پر پہنچنا ہوتا تھا۔ باقی تین طرف سونے کا کٹہرا لگا ہوا تھا۔ اس چبوترے کی دیواریں ٹھوس چاندی کی تھیں اور ان پر بافراط جواہرات جڑے

ہوئے تھے۔ سابق شاہِ اودھ یا نوابانِ اودھ کی عادت یہ تھی کہ اس چبوترے پر ایک اعلیٰ درجے کی مسند بچھوا کے مشرقی لوگوں کی طرح زانو توڑ کے بیٹھتے تھے لیکن نصیر الدین حیدر کا یورپین مذاق بھلا اس کو کیونکر گوارا کر سکتا تھا۔ انہوں نے ایک بیش بہا اور نفیس کرسی جو سونے اور ہاتھی دانت کی بنی تھی بجائے مسند کے اسی تخت پر رکھوا دی تھی۔ اس تخت پر ایک مربع شامیانہ تنا ہوا تھا جس کی چوبیں اندر سے لکڑی کی تھیں اور اوپر سونے کے خول چڑھے ہوئے تھے۔ اس شامیانے اور شامیانے کی چوبوں میں گراں بہا جواہرات بے حساب جڑے ہوئے تھے۔ اسی شامیانے میں سامنے کے رُخ پر ایک بہت ہی بڑا زمرد جڑا ہوا تھا جس کی بابت کہا جاتا ہے کہ دنیا میں اس کا ثانی نہیں ہے۔ کمرے کے دروں کی طرح اس شامیانے کے پردے بھی ارغوانی رنگ کے نہایت نفیس کاشانی مخمل کے تھے جن پر سنہری زردوزی کا کام بنا ہوا تھا اور گرد موتیوں کی جھالر ٹنکی ہوئی تھی۔" [1]

جب ۱۲۳۳ھ / ۱۸۱۸ء میں نواب اودھ کو شاہی اعزاز مل گیا تھا تو غازی الدین حیدر نے گورنر جنرل کے حسب ایما، اور بہاری لال مہاجن کی معرفت اپنے لئے ایک بیش بہا تاج بنوایا تھا۔ چنانچہ اسی تاج کو پہن کر پہلا شاہی دربار منعقد ہوا تھا۔ اس تاج کی تفصیل بشپ ہیبر نے اپنے سفرنامے میں اس طرح بیان کی ہے۔

"ناشتے کے بعد بادشاہ اُٹھے اور میرا اور مسٹر ریکٹس (ریزیڈنٹ) کا سہارا لیتے ہوئے متصل کے جھولے سے ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئے جہاں ایک میز پر اُن کا تاج رکھا ہوا تھا۔ یہ تاج بہت ہی نفیس تھا جس کو مشرقی انداز کا کہنا چاہیئے۔ یہ ایک مخملی کلاہ ہے جو جواہرات کی جھلملی شعاعوں سے محیط ہے اور جس پر سامنے کی طرف ہما کا ایک سفید پر لگا ہوا ہے۔ میں جواہرات کی پرکھ کی اہلیت نہیں رکھتا لیکن یہ بات ایمانداری سے کہہ سکتا ہوں کہ بادشاہ رُوس کے تاج کے علاوہ میں نے اتنی چمک دمک کبھی نہیں دیکھی۔ بادشاہ نے مجھ سے اپنے اور شاہِ انگلستان کے تاج کا فرق دریافت کیا۔ میں نے فرق بتاتے

ہوئے عرض کیا کہ حضور کا تاج بادشاہِ روم کے تاج سے زیادہ مشابہ ہے۔" [۱]

اودھ کے درباری رسم و رواج کے متعلق بھی ہمارے پاس معاصرین ہی کی شہادتیں موجود ہیں۔ چنانچہ ہم اس سلسلے میں بھی نائیٹین ہی کی کتاب سے ایک اقتباس ذیل میں درج کرتے ہیں۔ وہ لکھتا ہے:۔

"مشرقی بادشاہوں کے سامنے کوئی شخص خالی ہاتھ نہیں جا سکتا۔ ایسی صورت میں نذر دکھانی لازمی ہے حتیٰ کہ معمولی درباروں میں بھی نذر دکھانی پڑتی ہے اگرچہ بعد اس کے بادشاہ کی جانب سے دوسرے پیرائے میں اس سے بہت زیادہ خلعت و انعام ہو جاتا ہے۔ جب میں پہلی مرتبہ حضوری میں باریاب ہوا تھا اس وقت میں نے اُن کو دربارِ عام کے بڑے کمرے کے ایک سرے پر تخت نشین دیکھا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ وہ مسند پر پالتی مارے بیٹھے ہوں گے، لیکن وہ ایک سنہری جگمگاتی کرسی پر بہت بھاری ہندوستانی پوشاک پہنے اور ایک جواہر نگار تاج جس میں ہما کے پر کا طرّہ لگا تھا سر پر رکھے ہوئے جلوہ افروز تھے..... دوسری مرتبہ جب میں پھر حاضر ہوا تو میں نے دیکھا کہ بادشاہ مع اپنے چند یورپین ملازمانِ خانگی کے قصرِ شاہی کے ایک باغ میں گلگشت فرما رہے ہیں۔ میں ایک روش کے کنارے بادشاہ کی تشریف آوری کا منتظر کھڑا ہو گیا۔ ہاتھ پر ریشمی رومال رکھ کے اُس پر پانچ اشرفیاں رکھ لی تھیں۔ اور بائیں ہاتھ سے داہنے ہاتھ کو (جس پر رومال اور اشرفیاں تھیں) سنبھالے ہوئے تھا..... خدا خدا کر کے بادشاہ سلامت مع رفیقِ نفقاؔ کے تشریف لائے۔ اُس وقت وہ انگریزی جنٹلمین کا ایسا سادہ سیاہ ملبوس زیبِ تن کئے ہوئے تھے اور سر پر لندن کی بنی ہوئی ٹوپی مرتب تھی۔ اُن کا چہرہ بشاش تھا۔ جب وہ نزدیک پہنچے تو اپنے مصاحبوں سے انگریزی بولنے لگے..... اب بادشاہ قریب پہنچ گئے۔ مسکرائے۔ اپنے بائیں ہاتھ کو میرے ہاتھ کے نیچے رکھ کے داہنے ہاتھ کی انگلیوں سے میری نذر کی۔ اشرفیوں کو اُنہوں نے چھوا۔" [۲]

" دربارِ عام کے مواقع پر یا کسی خاص مجلسِ شوریٰ میں کُل عمائدینِ اودھ اور وہ انگریز حکام جنہیں رزیڈینٹ صاحب پیش کرنا چاہتے تھے حضورِ شاہ میں باریاب تھے۔ یہ لوگ ہاتھوں میں اُسی طرح نذریں لے کے چلتے تھے جس طرح میں بیان کر چکا ہوں، اور جب کمرے میں داخل ہوتے تھے تو سرِ نیاز جُھکائے اور بہت جُھک جُھک کے تسلیمیں بجالاتے حاضر ہوتے تھے۔ پھر جس کے حال پر بادشاہ مہربان ہوتے تھے اُس کی نذر ہاتھ سے چُھو لیتے تھے اور جس پر کچھ عتاب ظاہر کرنا منظور ہوتا تھا اُس کو دُور ہی سے اشارہ کر دیتے تھے۔ بعد اس کے نواب یعنی وزیرِ اعظم نذریں لے لے کر تخت کے ایک کنارے پر رکھتے جاتے تھے اور درباری لوگ نذریں پیش کر کے پچھلے پاؤں پیچھے ہٹ جاتے تھے۔ اگر انگریز ہوتے تھے تو تخت کی داہنی جانب اور ہندوستانی ہوتے تھے تو بائیں جانب مؤدب کھڑے ہو جاتے تھے۔ جب سب نذریں گزر چکتی تھیں تب بادشاہ ایک ہار صاحب رزیڈنٹ کے گلے میں پہناتے تھے۔ اس پر صاحب رزیڈینٹ ایک ہار بادشاہ کو پہنا دیتے تھے۔ ان مراسم کے ادا ہو چکنے پر بادشاہ اور صاحب رزیڈینٹ دونوں اُٹھ کے ایک کمرے کے وسط میں آکے کھڑے ہو جاتے تھے اور جن لوگوں کو خود بادشاہ سرفراز فرمانا چاہتے تھے یا صاحب رزیڈنٹ کی خواہش ہوتی تھی کہ سرفراز فرمائے جائیں اُنہیں ہار پہنائے جاتے تھے۔ یہ ہار اکثر سنہری گوٹے کے بنے ہوتے تھے۔ ہم ملازمانِ خانگی کو اکثر یہی ہار عطا ہوا کرتے تھے اور ہم لوگ بعد کو انہیں دربار کے ہندوستانی جوہری کے ہاتھ بیچ ڈالتے تھے۔ ان کی قیمت پانچ روپے سے لے کر پچیس ۲۵ روپے تک ہوتی تھی۔

ہاروں کی تقسیم کے بعد دربار برخاست ہوتا تھا اور بادشاہ کمرے کے دروازے تک صاحب رزیڈینٹ کی مشایعت کو آیا کرتے تھے اور رُخصت کے وقت اُن کے ہاتھ

میں تھوڑا عطرِ گلاب ٹپکا کے فرماتے تھے "خدا حافظ"۔ اس کے بعد بعجلت تمام بادشاہ اپنے نج کے کمرے میں تشریف لاتے تھے۔ اس کمرے میں ہم سب ملازمانِ خانگی ناشتے کی میز پر اُن کی تشریف آوری کے منتظر ہوتے تھے۔ یہاں آتے ہی آتے وہ بہت ہی بے تکلفی اور سادگی کے ساتھ جلدی سے تاج اور قبائے شاہی اُتار کے پھینک دیتے اور اُنگلیاں چٹخانے لگتے تھے۔" [۱]

کیپٹن لیوپولڈ نے دربار میں اپنی حاضری کی تفصیل اس طرح بیان کی ہے:۔

"ہم نے اپنی سواری باؤلی کے دروازے پر چھوڑ دی اور جنرل ناٹ اپنے "تام جھام" میں فرح بخش تک لے جائے گئے۔ ہم امین الدولہ وزیر السلطنت کے ہمراہ اُن کے ساتھ ہو لیئے۔ بادشاہ (امجد علی شاہ) اپنے حشم و خدم کے ہمراہ فرح بخش کی سیڑھیوں تک ہمارے استقبال کو آئے۔ جنرل ناٹ نے مجھے بادشاہ کے حضور میں پیش کیا۔ بادشاہ نے محبت کے ساتھ اپنا ہاتھ عنایت فرمایا اور کچھ ہمدردی کے الفاظ کہے۔ وہ طویل القامت اور جسیم آدمی ہیں۔ عادت۔ مزاج بہت اچھی اور شکل و صورت بُری ہے۔۔۔ بادشاہ نے مجھ سے میرے مُلک کے حالات بیان کرنے کی فرمائش کی اور فطری طور پر میرے مُلک کے بادشاہ اور اُس کی فوج کے متعلق کچھ تحقیق کی۔ اتنے میں امین الدولہ کچھ ہار لیئے ہوئے برآمد ہوئے جن میں دو پہلے تاروں میں سات ڈھالیں آویزاں تھیں۔ اور ہر ڈھال پر دو تلواریں، ایک مچھلی، کُلاہ اور تاج سنہرے بنے ہوئے تھے۔ یہ اعزازی ہار دو قسم کے تھے۔ اوّل قسم کی قیمت بیس روپے ہوگی۔ سب سے پہلے ایک اچھا ہار جنرل ناٹ کے گلے میں ڈالا گیا جس کے جواب میں اُنہوں نے بادشاہ اور وزیر اعظم کا شکریہ ادا کیا۔ اسی قسم کا دوسرا ہار مجھے عنایت ہوا اور چونکہ اب کوئی قسم اوّل کا ہار باقی نہ رہا تھا اس لئے کیپٹن شکسپیئر کو دوسری قسم کے دو ہار عطا ہوئے۔ اس رسم کے بعد عطرِ گلاب کی تقسیم عمل میں آئی جو ہمارے لئے رخصت ہونے کا اشارہ تھی۔

چنانچہ ہم بادشاہ کی معیّت میں فرح بخش کی آخری سیڑھیوں تک آئے۔ رُخصت کے وقت بادشاہ ہم سے بغلگیر ہوئے اور خلوص کے ساتھ ہاتھ ملائے۔" [۱]

رسمِ مسند نشینی

اَودھ میں جب کسی نواب وزیر یا بادشاہ کا انتقال ہوتا تھا تو پہلے رزیڈینٹ، انگریزی ڈاکٹر کے ہمراہ تصدیقِ وفات کے لیے حرم سرا میں آتا تھا۔ جب ڈاکٹر میّت کے معائنے کے بعد اپنا اطمینان ظاہر کر دیتا تھا تو نئے حکمران کی تخت نشینی کی تیاریاں شروع ہو جاتی تھیں۔ رزیڈینٹ کی نظرِ انتخاب جن صاحب پر پڑتی تھی اُن کے استقبال کے لئے تمام فوجی افسر چھاؤنیوں سے آجاتے تھے اور "گلستانِ ارم" میں مہمانوں اور متوسلینِ ریاست کا اجتماع شروع ہوتا تھا۔ جب سب لوگ جمع ہو جاتے تھے تو متوقع بادشاہ کی سواری بڑی دھوم دھام سے آتی تھی۔ رزیڈینٹ دروازے تک اُن کا استقبال کرتا تھا۔ مجوّزہ بادشاہ مقررہ مقام تک بوچہ میں سوار آتے تھے اور سواری سے اُتر کر وہ رزیڈینٹ سے معانقہ کر کے وسطی کمرے میں چلے جاتے تھے جس کے دروازے بند کر لئے جاتے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ تختِ رواں پر سوار ہو کر برآمد ہوتے اور قصر السّلطان (لال بارہ دری) میں جو تخت گاہ بھی داخل ہو جاتے تھے۔ اس جگہ وہ پہلے ایک خاص کمرے میں جا کر دو رکعت نمازِ تشکرانہ ادا کرتے پھر عبائے خاص کاندھے پر ڈال کر تخت پر کھڑے ہو جاتے۔ رزیڈینٹ اُن کے برابر ہوتا تھا۔ کوئی شاہی ملازم ایک چھوٹی سی کشتی میں تاجِ شاہی لے کر آتا اور پیش کرتا تھا جسے رزیڈینٹ خود اپنے ہاتھ سے اُٹھا کر بادشاہ کے سر پہ پہنا دیتا تھا۔ اس موقع پر بزبانِ انگریزی اعلان کر دیا جاتا تھا کہ اب فلاں صاحب بادشاہِ اَودھ ہو گئے۔ اس کے بعد بادشاہ چار زانو ہو کر تخت پر بیٹھتے اور اس قسم کا فرمانِ جلوس پڑھتے کہ "ما بدولت و اقبال نے باعانت و امدادِ آنریبل سرکار کمپنی انگریز بہادر وراثتِ آبائی پر تختِ سلطنت کے جلوس کیا۔۔۔" اب جلوس فرمایا جاتا تھا۔ پہلے وزیرِ اعظم نذر پیش کرتا۔ اس کے بعد دوسرے لوگ نذریں دیتے جنہیں وزیر اُٹھا لیتے۔ رزیڈینٹ

زیرِ تخت کرسی پر بیٹھتے رہتے اور تمام انگریز افسر کھڑے رہتے۔ بادشاہ پانچ اسم ساداتِ حسنی دستخط فرماتے۔ سامنے مبارکباد کا غُل ہوتا، ناچ ہوتا، انگریزی باجا بجتا، شلک سلامی سَر ہوتی اور شہر میں منادی کی جاتی۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد بادشاہ تخت سے اُترتے اور ایک طرف رزیڈنیٹ اور دوسری طرف برگیڈیر تختِ رواں تک پہنچا کر رُخصت ہوجاتے۔ اب روشن چوکی بجتی اور بادشاہ سوار ہو کر متّصلِ بارہ دری محل سرا میں داخل ہوجاتے۔ چھاؤنی سے عموماً پانچ کمپنیاں حفاظتِ بادشاہ اور بندوبست کے لئے متعین ہو کر آجاتی تھیں اور کئی دن تک انگریزی پہرہ لگا رہتا تھا۔ یہ دستور کرنل جان بیلی کے وقت سے رائج ہوا تھا [۱]

شاہی جلوس

بادشاہی شان و شوکت کے اظہار کا سب سے شاندار موقع وہ ہوتا تھا۔ جب لکھنؤ میں کسی گورنر جنرل، رزیڈنیٹ کمانڈر ان چیف یا سفیرِ انگریزی کی آمد ہوتی تھی۔ ایسے مواقع پر میزبان اور مہمان دونوں اپنی عظمت و شکوہ دکھانے کا اہتمام کرتے تھے۔ معمولی کاروبار کے لئے جب بادشاہ یا بادشاہ بیگم کی سواری محل سے باہر جاتی تھی تو صرف نقارہ آگے آگے بجتا ہوا چلتا تھا لیکن خاص خاص تقاریب میں شاہی سواری کی شان و شوکت نگاہوں کو چکا چوند کر دیتی تھی۔ بعض ہمعصر شہادتوں کے بیانات کو پڑھ کر اس شکوہِ خسروی کا کچھ اندازہ ہوجاتا ہے۔ مثلاً میر تقی میرؔ نے "ذکرِ میرؔ" میں لکھنؤ میں گورنر جنرل کی آمد کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ بھی خاصا دلچسپ ہے لیکن خود ایک گورنر جنرل نے اپنے استقبال اور داخلۂ شہرِ لکھنؤ کی جو کیفیت بیان کی ہے اُس میں کسی قسم کے شاعرانہ مبالغے کا امکان نہیں ہے۔

> "ہم لوگ علی الصباح (۲۷ اکتوبر ۱۸۲۷ء کو) شہر کی طرف روانہ ہوئے۔ نواب وزیر غازی الدین حیدر شہر سے دو میل کے فاصلے پر برسمِ استقبال ملے اور ہم کو دیکھتے ہی اپنے ہاتھی سے اُتر پڑے۔ میں بھی اپنے ہاتھی سے اُترا اور اُن سے بغل گیر ہونے کے بعد دونوں ایک اور ہاتھی پر سوار ہوئے جس کا مرصّع ہودج اور مُغرّق جھول نہایت شاندار تھی اور ہودے میں دونوں کے بیٹھنے کے لئے جُدا جُدا نشست گاہیں بنی ہوئی تھیں۔ اس کے بعد ہم مع خدم و حشم شہر کی

طرف روانہ ہوئے۔ دولت مند اہلِ شہر زرق برق پوشاکیں پہنے اپنے مکانات کی چھتوں پر جمع تھے.... میں نے ایک ہزار روپے لٹائے۔ اربابِ نشاط اپنے آراستہ کمروں پر پُر تکلف پشوازیں پہنے نہایت میٹھے سُروں میں مبارکباد گا رہے تھے۔ اہلِ شہر ہمیں دیکھنے کے لئے اِدھر اُدھر دوڑتے پھرتے تھے اور زندہ چڑیوں کو جو پنجروں میں بند تھیں نکال نکال کر ہوا میں اُڑا رہے تھے جس کا یہ مطلب تھا کہ خوشی اور مسرت کے موقعوں پر اسیرانِ قفس کو آزاد کرنا مبارک و مسعود کارروائی ہے۔" [1]

مولوی محمد کاظم نے بھی اپنی سوانح عمری میں غازی الدین حیدر کے ایک شاہی جلوس کا حال بیان کیا ہے لیکن اُس سے زیادہ تفصیلات اُس استقبالیہ میں ملتی ہیں جو نصیر الدین حیدر کے عہد میں لارڈ کمبر میئر کمانڈر ان چیف کی آمد پر شہر میں نکالا گیا تھا۔ اس جلوس کا حال نوبت رائے نظرؔ نے اپنے ایک مضمون میں اور نجم الغنی نے اپنی تاریخِ اودھ میں قلمبند کیا ہے۔ ہم ان دونوں تحریروں سے امداد لے کر اس تقریب کی ایک تصویر پیش کرتے ہیں۔ نجم الغنی لکھتے ہیں کہ۔

"جب رات ختم ہوگئی اور دن نکلا بادشاہ نے بیدار ہوکر حمام کیا۔ پوشاک بدلی، لباسِ شاہی زیبِ تن فرمایا، تاجِ مرصع سر پر رکھا، موتیوں کا ہار گلے میں پہنا، جواہرات سے جڑے ہوئے چھوٹے بڑے جوشن بازوؤں پر باندھے، اُنگلی میں انگوٹھی پہنی، اصفہانی تلوار کمر میں لگائی، اور اِس بناؤ سے ہاتھی پر طلائی حوضے میں سوار ہوکر فرح بخش سے برآمد ہوئے۔ یہ حکم پہلے سے تھا کہ بازاروں کی دکانیں اور لبِ سڑک کے مکانات آراستہ رہیں۔ صرّاف اپنی اپنی دوکانوں کو طرح طرح کے رنگوں سے منقش کرکے لباس ہائے فاخرہ پہن کر بیٹھے تھے جن کے سیدھی جانب اشرفیاں رکھی تھیں۔ اُلٹی طرف روپیوں کے ڈھیر تھے اور سامنے قسم قسم کے زیور اور سونے چاندی کے برتن رکھے ہوئے تھے۔ بزازوں نے اپنی دوکانوں کو بادلے، زربفت کمخواب اور اطلس کے قیمتی اور رنگین کپڑوں سے سجایا تھا اور دوکانوں کی چھتوں پر طوائف سنگار کرکے تماشے کی منتظر تھیں۔ سڑک پر تماش بین نوجوان بانکے ترچھے اچھے اچھے کپڑے پہنے پھرتے تھے کہ سواری بادشاہ کی آئی۔ اس میں علیحدہ علیحدہ جلوس کی صف بندی تھی۔

پہلی صف میں :- ایک بڑے ہاتھی پر نشان تھا اور اس کے بعد چند ہاتھیوں پر ماہی مراتب تھا۔

دوسری صف میں :- ہاتھیوں اور اونٹوں پر نقارے تھے اور اُن کے پیچھے پیچھے سَو شتر سواروں کا رسالہ تھا جس کے سوار سبز و سُرخ بانات کی وردیاں پہنے اور زرکار ستارے لگائے ہوئے تھے۔

تیسری صف میں :- نہایت عمدہ خانہ زاد عربی و دکھنی گھوڑوں پر نقارے تھے اور عمدہ ساز و سامان اور زیور اُن پر پڑا ہوا تھا۔

چوتھی صف میں :- کوہ پیکر، کلاں سر، اور قوی دندان ہاتھیوں کی قطار تھی جن پر زر بفت اور بانات کی جھولیں پڑی تھیں اور ہر ایک پر ایک پہلوان ہاتھوں میں گرزِ گراں لئے بیٹھا تھا۔

پانچویں صف میں :- تین سو سوار تھے جن کے رسالہ دار و جمعدار زر بفت اور پشمینۂ رنگین کے لباس پہنے اور قیمتی ہتھیاروں سے مسلّح تھے۔

چھٹی صف میں :- دو سو کے قریب تُرک سوار، سیاہ بانات کی وردیاں پہنے اور نشنگ کرچیں ہاتھوں میں لئے ہوئے تھے۔

ساتویں صف میں :- دو سَو خاص بردار، زرّیں مُنڈیلیں سر پر باندھے ہوئے تھے اور اُن کے ہاتھوں میں چقماق بندوقیں تھیں۔ جن پر بانات کے غلاف چڑھے ہوئے تھے۔

آٹھویں صف میں :- سَو آدمیوں کے ہاتھوں میں چمکدار نشان تھے۔

نویں صف میں :- سَو آدمیوں کے ہاتھوں میں چاندی کی برچھیاں تھیں جن میں پرچم لٹک رہے تھے۔

دسویں صف میں :- سَو چوبدار چاندی سونے کے عصا ہاتھ میں لئے ہوئے

بادشاہ کے داہنی طرف رزیڈینٹ دوسرے ہاتھی پر سوار تھے اور بائیں طرف رزیڈینٹ کا نائب ایک اور ہاتھی پر بیٹھا ہوا تھا اور پیچھے بادشاہ کے رشتہ دار اور سردار ہاتھیوں پر سوار تھے جو عمدہ عمدہ جھولوں سے آراستہ تھے۔" [۱]

اس شاہی جلوس سے قطع نظر اب شہزادے کے استقبالیہ جلوس کی شان و شوکت دیکھئے۔ بادشاہ نے شاہزادہ کیواں جاہ کو ایک دوسرے شاندار جلوس کے ہمراہ جس میں نواب معتمد الدولہ اور دیگر اعیانِ سلطنت بھی موجود تھے لارڈ موصوف کے استقبال کو پہلے ہی سے رحمت گنج تک بھیج دیا تھا۔ جب یہ لوگ کمانڈر انچیف کے نزدیک پہنچے تو شاہزادہ اپنے ہاتھی سے اتر کر لارڈ موصوف کے ہاتھی پر سوار ہوگیا اور یہ دونوں جلوس لکھنؤ کی طرف بڑھے۔

"اس جلوس میں تقریباً چالیس ہاتھی تھے جن کے مُرصّع ہودج اور کارچوبی جھولیں زر و جواہر سے منقش تھیں۔ جلوس کے ہمراہ عصابردار، بیرق بردار، جھنڈیوں والے اور باجے والے خوشنما وردیاں پہنے ہوئے تھے اور آگے آگے نقیبوں کا ایک زبردست ہجوم جو زعمر شہزادے کا نام و خطاب باآوازِ بلند پکارتے جاتے تھے۔ ان کے بعد کوتل گھوڑے تھے جو مُرصّع ساز و یراق سے آراستہ تھے۔ ہاتھیوں کے آگے پیچھے اور دونوں پہلوؤں میں رسالے کے کرتب اور نیزہ بازی کے جوہر دکھائے جا رہے تھے۔" [۲]

جب دونوں جلوس عالم نگر کے میدان میں ایک دوسرے کے قریب پہنچے تو بادشاہ نہایت گرمجوشی سے بغلگیر ہوئے اور۔

"دونوں ایک ہی ہاتھی پر سوار ہو کر شہر کی طرف روانہ ہوئے۔ اب شاہی سواری کا جلوس بھی پہلے جلوس (لارڈ کیمبر میئر کے جلوس) میں شامل ہوگیا اور ایک نہایت پُرعظمت اور شاندار نظارہ پیدا ہوگیا۔ شہر میں داخل ہونے پر تماشائیوں کا ہجوم قابلِ دید تھا۔ عالیشان مکانوں کے دروازوں اور کھڑکیوں میں بھی جن میں شالی اور کارچوبی پردے پڑے ہوئے تھے تماشائیوں کے اُسی طرح ٹھٹ لگے ہوئے تھے جس طرح گلیوں اور سڑکوں پر

جہاں تِل رکھنے کی جگہ نہ تھی۔ بہت سے لوگوں نے اپنے بادشاہ کو نہایت مؤدب طریقے سے سلام کیا۔ سواری کے پیچھے پیچھے شُہدوں کا ایک جمِ غفیر تھا جو نہایت زبردست شور وغل کر رہے تھے اور جن کے غول میں بادشاہ کی طرف سے مٹھیاں بھر بھر کے روپے پھینکے جاتے تھے۔ اس ہجوم میں ہاتھیوں کی ہوشیاری نہایت حیرت انگیز تھی جو اس قدر سنبھل سنبھل کر پاؤں رکھتے تھے کہ کوئی شُہدہ کچلنے نہیں پاتا تھا حالانکہ روپے لوٹتے وقت یہ حریص وطامع فرقہ اپنے کو ہاتھیوں کے پاؤں کے پاس اس طرح بے دھڑک ڈال دیتا تھا کہ اُن کے پاؤں کی ایک خفیف سی جھڑپ بھی ان لوگوں کی ہڈیاں پسلیاں چُور کردینے کو کافی تھی۔ بعض مکانوں کی چھتوں اور کمروں پر بھی روپے پھینکے گئے۔" [۱]

مختصر یہ کہ "جہاں جہاں بادشاہی سپاہ کے سوار پیادے کھڑے ہوئے تھے اُن کی سلامی لیتے ہوئے یہ لوگ فرح بخش پہنچ گئے۔ جب حاضری کی میز پر جلوہ افروز ہوئے تو اکیس فیر سلامی کے سَر ہوئے۔ حاضری سے فارغ ہو کر ناچ گانا ہوا۔ اس صحبت میں صرف شوقیہ بات چیت ہوئی۔ رُخصت کے وقت بادشاہ کی طرف سے کشتیوں میں بانات، زربفت اور کمخواب کے کپڑے اور جواہر لارڈ صاحب کے سامنے پیش ہوئے۔ اسی طرح اُن کے اسٹاف کے انگریزوں کو تحائف دیئے گئے اور عطر اور گوٹے کے ہار بھی تقسیم ہوئے۔" [۲]

کیپٹن لیوپولڈ بھی اپنے سفرنامے میں جنرل ناٹ کے استقبال کے متعلق لکھتا ہے کہ:۔

"میری آمد سے چند روز قبل جنرل ناٹ موجودہ سفیر لکھنؤ میں وارد ہوئے تھے۔ اس موقع پر بادشاہ (امجد علی شاہ) اور اُن کی رعایا نے نامور جنرل کا بڑے اعزاز کے ساتھ استقبال کیا تھا۔ جہاں پناہ اپنے صاحبزادگان اور متوسلین ریاست کے حلقے میں دو سَو مرصّع ہاتھیوں پر سوار ہو کر اپنی باقاعدہ سپاہ کی معیت میں اُن سے ملنے کے لئے گئے تھے۔ تقریباً تمام ہی باشندگانِ شہر اپنے فاخرہ لباس میں جلوس کے ہمراہ تھے۔ جنرل ناٹ

نے مجھے یقین دلایا تھا کہ حقیقت میں ایک ہندوستانی بادشاہت کے متعلق تصور جو تصویر کھینچ سکتا ہے یہ منظر ان سب سے لاجواب تھا۔" [۱]

حرم سرا فرح بخش کی خاص عمارت کے مشرقی پہلو سے متصل حرم سرا تھی جس میں متعدد عمارات تھیں۔ ان عمارتوں میں کوئی بیرونی دریچہ نہ تھا۔ خواتین کے یہ محلات شیش محل، خورد محل اور رنگ محل کے نام سے موسوم تھے۔ ان کے اندر چھوٹے چھوٹے خوبصورت باغیچے، حوضیں اور فوارے نہایت اہتمام سے بنائے گئے تھے اور ان کی تعمیر مردانہ مکانات سے مختلف نہ تھی۔ ہندوستان میں محل سراؤں کی بناوٹ کا جو ایک خاص طریقہ ہوتا ہے وہی اودھ میں بھی رائج تھا یعنی ایک مربع عمارت جس کے چاروں طرف مربع یا مستطیل دالان ہوتے تھے۔ آگے غلام گردش اور اس کے سامنے چبوترا اور چبوترے کے آگے صحن۔ ان دالانوں میں عموماً کواڑوں کی جوڑیاں نہیں چڑھائی جاتی تھیں بلکہ بھاری بھاری پردے حسب ضرورت لٹکا دیئے جاتے تھے۔ انہیں عمارتوں میں حرم کی عورتیں رہتی تھیں اور انہیں میں وہ اپنے زیورات اور روزمرہ کی ضروریات وغیرہ کا سامان رکھتی تھیں۔ گرمیوں میں دن کے وقت تہہ خانے استعمال کئے جاتے تھے اور رات میں خواتین کی نشست صحن میں ہوتی تھی۔ صحن میں ایک شبنمی تان کر اُس کے نیچے فرش بچھا دیا جاتا تھا۔ ہر محل کی خاتونِ خاص بیچ میں تخت یا مسند پر بیٹھتی تھی اور جو کوئی اُس سے ملنے آتی تھی وہ وہیں سلام کر کے بیٹھ جاتی۔ یہ میزبان خاتون عموماً اپنے سے زیادہ معمر یا زیادہ ذی مرتبہ عورت یا کسی مرد رشتہ دار کی آمد پر اپنی جگہ سے اُٹھ کر تعظیم بھی بجا لاتی تھی۔

بادشاہ کے مختلف محلوں کی ڈیوڑھیاں الگ الگ ہوتی تھیں جن میں خلوت خانے، دالان اور مسندیں بھی علیحدہ علیحدہ ہوتی تھیں۔ ان میں سے بہت سی خواتین ایسی ہوتیں جنہیں مہینوں بھی بادشاہ کی زیارت نصیب نہ ہوتی تھی۔ ان بیگموں کی خدمت کے لئے کثیر تعداد میں مامائیں، اصیلیں اور پیش خدمتیں مقرر ہوتی تھیں جن میں بہت سی خانہ زاد ہوتیں لیکن کبھی کبھی حُسنِ صورت

اور سلیقۂ خدمت گزاری وغیرہ کے پیشِ نظر کچھ لڑکیوں کو غریب والدین سے خرید لیا جاتا تھا۔ ان کی خصوصیات کا معیار اچھا سینا پرونا، اچھے سوز پڑھنا، اچھی باتیں کرنا یا اچھی داستان سنانا تھا۔

خواصوں کے علاوہ کچھ عورتیں کہاریوں کے کام پر بھی نوکر رکھی جاتی تھیں جو حرم شاہی کے اندر ہی اندر بادشاہ یا کسی بیگم کو پالکی میں سوار کرا کے ایک مکان سے دوسرے مکان تک لے جاتی تھیں۔ ان عورتوں کی قواعد سپاہیانہ انداز سے ہوتی تھی۔ حرم شاہی میں ایک تیسرا گروہ اُن عورتوں کا بھی ہوتا تھا جو سپاہیانہ وردی پہن کر کاندھے پر بندوق رکھتے، خوابگاہِ شاہی یا محل سرا کا پہرہ دیا کرتی تھیں۔ ان عورتوں کی طرح بعض خواجہ سرا بھی محلاتِ شاہی میں ملازم رہتے تھے جن کی تعداد نصیر الدین حیدر کے عہد میں تقریباً ڈیڑھ سو تھی۔ ان کا افسرِ اعلیٰ بادشاہ بیگم کی ڈیوڑھی پر متعین رہتا تھا جس کی لکھنؤ بھر میں بڑی عزت ہوتی تھی۔

بیگموں کی وضع قطع، شکل وصورت، اور لباس وزیورات کے متعلق "مسز پارکس وانڈرنگز" جلد اوّل میں ہمیں ایک انگریز خاتون کی عینی شہادت ملتی ہے جو نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ کی تخت نشینی کی سالگرہ واقع ١٨ اکتوبر ١٨٣١ء کے متعلق اپنی ایک سہیلی کو خط میں لکھتی ہیں کہ۔

"اٹھارہ اکتوبر کو بادشاہ کی تخت نشینی کی سالگرہ تھی اور میں بھی اس مبارک رسم میں شریک ہوئی تھی۔ اس تقریب کے اختتام پر ہم سب بادشاہ کی والدہ کے محل میں گئے جہاں تمام بیگمیں اور شہزادیاں مدعو تھیں۔ کہاریاں تامجام اُٹھا کر محل میں لے گئیں۔ دروازے کے قریب اردابیگنیوں اور مُغلانیوں کی ایک چھوٹی سی پلٹن مردانہ لباس پہنے، ہاتھوں میں سونے اور چاندی کے عصا لئے ہماری تعظیم کے لئے صف بستہ کھڑی ہوئی تھی۔ بادشاہ بیگم صاحبہ (والدۂ نصیر الدین حیدر) بہت سادہ پوشاک میں تھیں اور کسی قسم کا زیور بھی اُن کے جسم پر نہ تھا۔ شاہِ متوفی کی ایک اور بیگم جو بہت کم سن اور خوبصورت تھیں، اُن کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں۔ مگر اُن کا لباس بھی بہت سادہ تھا کیونکہ یہاں کے دستور کے مطابق بیوہ عورتیں مُکلّف لباس اور زیورات سے احتراز کرتی ہیں۔ بادشاہِ حال کی بیگمیں خصوصیت کے ساتھ نہایت قیمتی اور نفیس پوشاکیں زیبِ تن کئے ہوئے

تھیں۔ وہ اپنے لباس میں عربی کہانیوں کے کرداروں سے مشابہ معلوم ہوتی تھیں۔ ان میں سے ایک بیگم رتاج محل، حقیقت میں اس قدر حسین وجمیل تھیں کہ جنہیں دیکھ کر میرا خیال معًا لالہ رُخ (مور شاعر کی ہیروئن) اور اُس کے عروسی ملبوس کی طرف منتقل ہوگیا۔ میں نے ہندوستان اور انگلستان میں ایسی خوبصورت عورت کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اُن کے خدوخال مکمل تھے اور اتنی خوبصورت آنکھیں اور پلکیں کبھی میرے دیکھنے میں نہیں آئی تھیں۔ موجودہ زمانے میں یہی بادشاہ کی منظورِ نظر ملکہ ہیں۔ ان کی شادی کو ابھی ایک دو ماہ گذرے ہیں۔ ان کا سن تقریبًا چودہ سال ہوگا۔ ایسی کم عمر خاتون نرم ونازک ہاتھ پاؤں اور بے حد شرم و انکسار کے ساتھ تصوّر سے بالاتر ہے۔ یہ اتنی دلرُبا اور اَنہڑ تھیں کہ اگر تم بھی دیکھتیں تو مسحور ہوجاتیں۔ ان کی پوشاک سُرخ کمخواب کی تھی اور ان کے بالوں میں بکثرت موتی پروئے ہوئے تھے جو گردن پر ایک طویل چوٹی کی شکل میں لٹک رہے تھے۔ چوٹی کے سرے پر بڑے بڑے موتی تھے، پیشانی پر ایک چھوٹا سا طلائی ٹیکا آویزاں تھا جس کے نصف حصّے تک بڑے بڑے موتی اور زمرّد لٹک رہے تھے۔ اس کے اوپر ایک خوبصورت طرّہ تھا، جس سے موتیوں کی لڑیاں اس طرح سر پر سے گذر رہی تھیں۔ جیسے ہم لوگ اپنے بال گھما لیتے ہیں۔ ان کے کانوں میں سونے کی متعدد بالیاں تھیں جن میں موتی اور زمرّد پڑے ہوئے تھے جو سلسلے وار بڑے ہوتے چلے گئے تھے۔ ناک میں ایک بُلاق تھا اس میں بھی بڑے بڑے گول موتی اور زمرّد موجود تھے۔ ان کے گلوبند، کنٹھے اور ہار اتنی زیادہ تعداد میں تھے کہ جن کی تفصیل بیان سے باہر ہے۔ ان کا لباس ایک مکمل پیٹی کوٹ جیسے جو جسم پر چپٹا ہوا اور صرف گلے کے نزدیک کھُلا ہوا تھا۔ آستینیں لانبی اور کہنیوں کے پاس کشادہ تھیں۔ جب وہ چلتی تھیں تو متعدد خادمائیں اُن کے غرارے کو سنبھالے رہتی تھیں۔ وہ جس کوچ پر متمکن تھیں اُس کی پُشت پر کئی خواصیں اُن کے دوپٹے کو سنوارنے کے لئے کھڑی رہتی تھیں۔ کیونکہ ذرا سی حرکت سے موتی کمخواب کے بھاری دوپٹے میں اُلجھ جاتے

تھے۔ ان سے دوسری بیگمیں بہت حسد کرتی تھیں۔ جس کا سبب یہ تھا کہ بادشاہ اور اُن کی والدہ دونوں ان پر مہربان ہیں۔ بادشاہ نے انہیں نواب تاج محل کا خطاب عنایت کیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ خود نور جہاںؒ بھی ان سے زیادہ حسین و جمیل نہ ہوگی۔ ایک اور نئی بیاہی ہوئی بیگم بھی ان کے قریب ہی بیٹھی ہوئی تھیں یہ ایک انگریز سوداگر کی بیٹی ہیں جن کی شکل وصورت بہت معمولی ہے مگر یہاں کی مستورات انہیں بہت خوبصورت تصور کرتی ہیں۔ ان کی پوشاک تاج محل کی پوشاک سے بھی زیادہ پُر تکلف تھی اور ان کی پیشانی پر بھی ایک بہت بیش قیمت مرصّع الماس کا بیضہ آویزاں تھا۔ اس زیور کی شکل چاند سے بہت مشابہ تھی۔ یہ بیگم خاص تعلیم یافتہ ہیں یعنی اپنی مادری زبان انگریزی کے علاوہ اُردو فارسی بھی اچھی طرح لکھ پڑھ لیتی ہیں۔ لیکن جب ہم نے اُن سے انگریزی میں ہمکلام ہونا چاہا تو انہوں نے جواب دیا کہ میں اب انگریزی بھول گئی ہوں۔ سُنا جاتا ہے کہ بادشاہ اُن سے انگریزی پڑھتے ہیں باوجودیکہ یہ دونوں بیگمیں برابر برابر ایک ہی کوچ پر بیٹھی تھیں لیکن جوشِ رقابت ان دونوں میں ایسا بڑھا ہوا تھا کہ آپس میں بول چال مطلقاً نہیں ہوئی۔ نواب ملکہ زمانی بیگم جو صاحبِ اولاد ہیں اور بہت اقتدار رکھتی ہیں اس صحبت میں شریک نہ تھیں۔ ہم خود اُن کے محل میں ملاقات کے لئے گئے۔ خاندانِ مغلیہ کی شاہزادی جن سے کہ شاہِ متوفیؒ نے بادشاہِ حال کی بچپن ہی میں شادی کر دی تھی، اپنے محل میں نظر بند ہیں۔ بادشاہ اُن سے بہت کبیدہ خاطر رہتے ہیں۔ سُنا جاتا ہے کہ اُن کے حسن و جمال کو ان میں سے کوئی بیگم نہیں پہنچتی تھی۔ [۱]

حرم سرا کی چہلوں اور دلچسپیوں کی جو تصویر میر حسن نے سحر البیان میں پیش کی ہے وہ یہاں کی حقیقی زندگی کی محض ایک جھلک کہی جا سکتی ہے۔ اُس تفصیل کو پڑھ کر بھی ایسے رنگین ماحول کا تصور کسی حد تک قائم ہو سکتا ہے۔ لیکن ہم یہاں حرم سرا کی ایک تقریب سے محض ایک عورت

کی تفصیل پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں جسے پڑھ کر وہاں کی پُر شوکت زندگی کا ایک حقیقی مرقع نگاہ کے سامنے آجائے گا۔ نوبت رائے نظرؔ ، پکٹوریل لکھنؤ، سے اخذ کر کے اس دعوت کا نقشہ اس طرح کھینچتے ہیں:۔

"محل سرا کے سب سے بڑے کمرے میں بیگمات اور خاندانِ شاہی کی دعوت کی تیاریاں کی گئی تھیں۔ رات کا وقت تھا اور کمرے میں نئے نئے خوشنما قالین بچھائے گئے تھے جن پر اس سرے سے اُس سرے تک دو لمبے دستر خوان دو رویہ بچھے ہوئے تھے اور جن کے دونوں جانب پلیٹیں چُنی ہوئی تھیں۔ کمرے کے صدر میں ایک دیوار سے دوسری دیوار تک ایک اور دستر خوان تھا جو ایک زرتار قالین کے سامنے بچھا ہوا تھا جس میں سنہری جھالر ٹکی ہوئی تھی۔ اس کے قریب نہایت عالیشان کارچوبی مسندیں بچھائی گئی تھیں اور چاندی سونے کے ظروف چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے۔ سب سے چھوٹے دستر خوان پر جو کمرے کے صدر مقام پر آراستہ تھا اور جو سب سے زیادہ معزز جگہ تھی، بادشاہ کی والدہ جناب عالیہ متمکن تھیں۔ اُن کے برابر خود بادشاہ (واجد علی شاہ) نواب خاص محل، مرزا ولی عہد بہادر، جنرل صاحب (برادرِ خُرد واجد علی شاہ) اور اُن کے بڑے بیٹے رونق افروز تھے۔ نوبت بج رہی تھی، شہنائی اور نرسنگھے کے شور میں کان پڑی آواز نہیں سُنائی دیتی تھی۔ فوجی باجہ علیحدہ بج رہا تھا اور توپیں داغی جا رہی تھیں۔ اس کے بعد شاہی محلات کی بھیر آنا شروع ہوئی۔ ان میں کوئی کشیدہ قامت تھی کوئی پستہ قد، کوئی سانولی، کوئی گوری، کوئی جوان، کوئی ادھیڑ، کوئی حسین، کوئی بدصورت، لیکن سب کی سب زر بفت اور کمخواب کے جوڑے پہنے ہوئے تھیں اور مرصّع زیورات سے جواہر کے دریا میں غرق تھیں۔ کمرے کی چھت میں جھاڑ اور قندیلیں روشن تھیں۔ دیواروں پر کنول اور قدِ آدم آئینے لگے ہوئے تھے۔ تمام کمرہ روشنی سے جگمگا رہا تھا اور چاندی سونے کے برتنوں، جواہرات اور زرتار پوشاکوں کے عکس سے آئینوں کے اندر ایک دوسری

محفل معلوم ہوتی تھی جس نے ایک عظیم الشان نظارہ پیدا کر دیا تھا۔ گویا راجہ اندر کا اکھاڑا یا پرستان ہے۔ نرم اور سُریلی آوازوں کے قہقہے گونج رہے تھے۔ کمسن بیگمات کی خوش الحانی کے ساتھ سن رسیدہ بیگمات کی کرخت آوازیں مل کر بغیر کسی ساز کے موسیقی کا لطف پیدا کر رہی تھیں۔ فرش پر اِکّے دُکّے فانوس اور لالے روشن تھے۔ اور ان سب کے عکس مع شرکائے دعوت کے خوبصورت و بدصورت چہروں کے عکس کے، آئینوں میں جو لطف پیدا کر رہے تھے وہ زبانِ قلم سے ادا نہیں ہو سکتا۔ ہر طرف خوشی و مسرت چھائی ہوئی تھی۔ شرمیلی آوازیں، بیباک قہقہوں میں اس طرح غائب ہو جاتی تھیں گویا وہ منہ سے نکلی ہی نہ تھیں۔ کمرے کی لمبی صفوں میں ہر جگہ ایک نیا سماں بندھا ہوا تھا۔" [۱]

بیگمات کی سواریاں

حرم سرا میں بیگمات کے ایک ڈیوڑھی سے دوسری ڈیوڑھی تک جانے کے لئے پالکیاں استعمال ہوتی تھیں جنھیں محل کی کہاریاں اُٹھا کر چلتی تھیں۔ معمولی قسم کی سواریوں کے ساتھ کوئی خاص اہتمام نہیں ہوتا تھا لیکن جب مخصوص تقاریب کے موقعوں پر بیگمات کی سواریاں نکلتی تھیں یا جب وہ درگاہ یا کسی دوسرے متبرک مقام کی زیارت کو حرم سرا سے باہر جاتی تھیں تو اُس وقت سواری کا تزک و احتشام قابلِ دید ہوتا تھا۔ مختلف بیگمات کی ایسی سواریوں میں کوئی خاص امتیاز نہیں ہوتا تھا، سوائے اس کے کہ ملکۂ خاص کی سواری کے ساتھ نوبت و نقارہ، ماہی مراتب، چترِ زرنگار اور سائبان وغیرہ بھی ہوتے تھے چنانچہ نائیٹین بادشاہ بیگم کی سواری کے شکوہ کی تصویر اس طرح کھینچتا ہے۔

"بادشاہ بیگم جب درگاہ جاتی تھیں تو اُن کی سواری کے آگے سب سے پہلے بادشاہی باڈی گارڈ کے کچھ سوار جن کی نیلی رنگ کی وردیوں پر زرد پہلو کام زردوزی بنا ہوا تھا، جھنڈیاں ہوا میں اُڑاتے بینڈ باجہ بجاتے نکلتے تھے، اُن کے بعد دو پلٹنیں پیدلوں کی، یہ بھی جھنڈی اور باجے کے ساتھ، ان کے بعد علم برداروں کی ایک کمپنی جن کی وردیاں سفید اور علم چاندی کے ہوتے تھے اور جو پیدل پلٹنوں کی ارغوانی رنگ کی وردیوں کے مقابلے میں بہت ہی

خوشنما معلوم ہوتی تھیں۔ ان کے بعد کچھ لوگ سفید لباس پہنے نُقرئی جھنڈیاں ہاتھوں میں لئے نکلتے تھے۔ ان کی جھنڈیاں تکونی (مثلث نما) ہوتی تھیں۔ اور ان پر سلطنتِ اودھ کا شاہی مارکہ کڑھا ہوتا تھا۔ ان جھنڈی برداروں کے بعد ہی ایک بند سواری نکلتی تھی جس میں بادشاہ بیگم صاحبہ ہوتی تھیں۔ یہ سواری ایک بڑے صندوق کی قطع کی ہوتی جس پر چاندی منڈھی ہوتی تھی اور اوپر سے ایک مغرق پوشش بھی پڑی ہوتی تھی۔ اس کو بیس کہار اپنے کاندھوں پر اُٹھائے ہوتے تھے جو چہارم حصّہ میل کے فاصلے پر بدلتے رہتے تھے۔ یہ کہار سفید چُست لباس اور اُوپر سے ڈھیلی ڈھیلی قبائیں گلنار رنگ اور کارچوبی کام کی پہنے ہوئے تھے۔ ان کی سُرخ سُرخ پگڑیوں میں سنہری اور رُوپہلی مچھلیاں ٹنکی ہوتی تھیں اور ان مچھلیوں میں طلائی زنجیریں اور پھُندنے پڑے ہوتے تھے جو شانوں تک لٹکتے تھے۔ کہاروں کے پیچھے ایک جمِ غفیر طلائی اور نقرئی عصابرداروں اور چوبداروں کا ہوتا تھا۔ یہ لوگ بیگم صاحبہ کے نام اور خطاب کا کڑکا بولتے چلتے تھے" [1]

طرزِ زندگی مذاق اور دلچسپیاں

غذا

اودھ میں عوام کی غذا بہت سادہ اور صحت آور تھی۔ مغربی علاقوں کے لوگ عموماً گیہوں اور مشرقی علاقے کے باشندے چاول استعمال کرتے تھے۔ عام طریقے سے ہر غریب و امیر کے یہاں ایک دُو گائے یا بھینسیں بھی ہوتی تھیں جن سے انہیں اور اُن کے بچوں کو دُودھ، دہی اور گھی وغیرہ بافراط مل جاتا تھا۔ خوش حال لوگوں کے دستر خوان پر روزانہ شیرینی بھی ضرور ہوتی تھی۔ خواص اور بالخصوص شہری طبقے کی غذا بہت امیرانہ تھی۔ مسلمان اُمراء کے یہاں پلاؤ، متنجن، مزعفر سفیدہ، فیرینی، شیرمال، باقر خانی، شیر برنج، لوزانی، قورمہ، شامی کباب، مُربّہ اور اچار وغیرہ اقسامِ طعام کا اہتمام دعوتوں کے موقعوں پر عموماً ہوتا تھا۔ ان میں بھی نفاستیں پیدا کر کے ایک ایک

چیز کی کئی کئی قسمیں تیار کر لی جاتی تھیں مثلاً پلاؤ ہی متعدد اقسام کے ہوتے تھے۔ ہندو اُمراء کے یہاں ان میں سے وہ غذائیں عموماً نہیں کھائی جاتی تھیں جن میں گوشت کا استعمال ہوتا تھا۔ اُن کے بجائے پُوریاں، کچوریاں، قسم قسم کی ترکاریاں، اچار اور دہی بڑے وغیرہ بڑھا لئے جاتے تھے۔ اُمرا کی اس خوش خوراکی نے اَودھ میں بڑے بڑے ماہر باورچی اور رکابدار پیدا کر دیئے تھے۔ مثلاً شاہ نصیرالدین حیدر کے باورچی کے متعلق مشہور تھا کہ وہ بادام کے چاول تراشتا اور پستے کی دال تیار کرتا تھا۔ پھر ان سے اس قدر نفیس کھچڑی پکاتا کہ جو دیکھنے میں ماش کی کھچڑی معلوم ہوتی تھی لیکن کھانے میں اُس کا ذائقہ ہی کچھ اور ہوتا تھا جس کا زبان مدتوں چٹخارہ لیتی رہتی تھی۔ اسی صُورت سے واجد علی شاہ کا رکابدار بھی کھانوں کی ہیئت تبدیل کر دینے میں ایسا کمال رکھتا تھا کہ مُربّے کو کھایئے تو قورمہ کا مزہ ہوتا، قورمے کو کھایئے تو فیرینی کا لُطف آتا اور فیرینی کھاتے تو پلاؤ کی لذت آتی تھی۔ بعض دُوسرے رکابداروں نے بھی کھانوں اور بالخصوص چاولوں کی تیاری میں عجب عجب صنعتیں دکھائی تھیں مثلاً کسی نے پلاؤ کو نَو رنگ کے چاولوں سے تیار کر کے قاب کو جواہرات سے مشابہ بنا دیا۔ کسی نے آدھا چاول ارغوانی اور نصف کو سفید بنا کر انار دانہ تیار کر دیا۔ اسی کمال نے ان رکابداروں اور باورچیوں کو بڑا مغرور بنا دیا تھا۔ اِن کے ہُنر نے اَودھ میں اپنی صحیح قیمت پاکر اس فن کی ترقّی کے بہت سے ذرائع مہیا کر دیئے تھے ان کی تنخواہوں کا اندازہ اس بات سے کیجئے کہ نواب سالار جنگ کے خاص رکابدار کو بارہ سو روپے مشاہرہ ملتا تھا۔

حُکمرانوں کے کھانوں، باورچی خانوں، اور رکابداروں کی تفصیل کچھ زیادہ طویل اور غیر ضروری ہوگی اس لئے ان کے انتظام و اہتمام کے اندازے کے لئے تاریخ فرح بخش کے ایک بیان کا خلاصہ یہاں درج کیا جاتا ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ شجاع الدولہ کے عہد میں کھانے کے وقت دسترخوان پر چھ مختلف جگہوں سے کھانا آتا تھا۔ ان میں سب سے مخصوص باورچی خانہ مرزا حسن رضا خان کے ماتحت تھا جس میں دو ہزار روپے روزانہ کی کھپت ہوتی تھی۔ دوسرا چھوٹا باورچی خانہ جو اوّل مرزا حسن علی کے تحت میں تھا اور پھر عنبر علی خان کی نگرانی میں آگیا تھا اُس پر تین سو روپے روزانہ

خرچ ہوتے تھے۔ علاوہ ازیں بہو بیگم، نواب بیگم، مرزا علی خاں اور نواب سالار جنگ کے باورچی خانے بھی بہت مخصوص تھے۔ جن سے شاہی دسترخوان پر روزانہ کھانا آتا تھا [۱]

آصف الدولہ کے باورچی خانے کا خرچ بھی بقولِ ابوطالب دو تین ہزار روپے روزانہ تھا۔ اس عہد کے کھانوں کی تفصیل ہم گورنر جنرل کی آمد کے سلسلے میں صفحاتِ گزشتہ میں بیان کر چکے ہیں جس کا اعادہ یہاں مناسب نہ ہوتا اس لئے ہم میر حسن کی مثنوی "خوانِ نعمت" کا کچھ اقتباس پیش کرتے ہیں۔ اس مثنوی میں اٹھتر (۷۸) اشعار ہیں جن میں نواب آصف الدولہ کے دسترخوان کی نعمتوں کی تفصیل بیان کر دی ہے۔ یہ مثنوی ایک دوست کے نام خط کی صورت لکھی ہے۔ میر حسن نے اپنے دوست کو جو لکھنؤ چھوڑ کر کسی اور مقام پر چلا گیا تھا۔ ترغیبِ واپسی دینے کے خیال سے یہ مثنوی لکھی ہے۔ ہم اس کا انتخاب یہاں درج کرتے ہیں ؎

کہوں کیا میں ثنا و حمدِ رزاق ۔۔۔ کہ گویائی کی طاقت ہے یہاں طاق
لگا غفلت سے تا ایامِ پیری ۔۔۔ ہماری ہر طرح کی دستگیری
کیا پھر ایسے آقا کے حوالے ۔۔۔ کھلائے جس نے نعمت کے نوالے
سو وہ کون، آصف الدولہ بہادر ۔۔۔ کہ بحرِ بخشش اُس کا دے بہادر
رکھے آباد حق اُس کو کرم سے ۔۔۔ کہ اتنی خوبیاں ہیں اُس کے دم سے
کرے کس واسطے کفرانِ نعمت ۔۔۔ سدا آگے ہے اپنے خوانِ نعمت
پُلاؤ زیر بریانی و قورمہ داغ ۔۔۔ ہر اک عالم میں اپنی قطع کا باغ
وہ بشقابیں بھری بریانیوں کی ۔۔۔ مُلتبس تفلیاں بورانیوں کی
پُلاؤ میں رکھا زردا جو اک بار ۔۔۔ ہوا اک تختۂ چیں زعفراں زار
مُچنے دوپیازے اور قلیے تمامی ۔۔۔ اُتاریں ہاتھ جن اُوپر سلامی
کباب اقسام کے رکھتے وہ ہر سو ۔۔۔ بھریں دم فاختہ جن کا کہ، کوکو
سلونی اور تلی مچھلی مزے دار ۔۔۔ کہ دریائی کباب اُن کے نمک خوار
حُسینی وہ کباب اعلیٰ و نامی ۔۔۔ ہوئے مردود جن کے آگے شامی

پنیروں کی ہر اک سُو نیم چینی　　ہر اک کتلے میں تِتو باریک بینی
قبولی تھی عجب اسلام خانی　　کہ تھی وہ تم سے مومن کو کھلانی
حلیموں کے طبق جلتے ہوئے گرم　　جسے خورشید کھاوے دیکھ کر شرم
وہ تُنکی اور نُخش مُبرّاق جوں برف　　نہ پاوے جس کی لذّت ہر تُنک ظرف
دہی وہ صاف اور مُقّل وہ کوری　　شفق میں جیسے سورج کی کٹوری
وہ شہ کاسے بھرے آشوں سے لبریز　　جہاں ہو توسنِ رغبت کو مہمیز
دھرے وہ قورمے اُن پر سراسر　　کہ جن سے بہہ چلے گھی تر ترا کر
وہ بھُرتے اور ترکاری کے دُلمیں　　کہ جب کھولو تو بُو باس اُن کی گل میں
جو شُربے تھے سو اپنے شور میں تھے　　جو قلیے تھے سو اپنی قور میں تھے
عجائب زیر بریاں نُور محلّی　　محلِ لُطف سے مشہور ملّی
مصالحہ دار وہ تحفہ و بڑے تھے　　کہ حیراں اُس پہ سب چھوٹے بڑے تھے
وہ باقر خانیاں جن کا بڑا پہن　　سو آئے تھے وہ بادامی قبا پہن
پنیری سے لگا تا نانِ سنگی　　سمیت از نان نعمت ہفت رنگی
وہ پھیلے خوانچے فرنی کے جوں چاند　　کہ جن کی ہو چمک سے چاندنی ماند
سموسے اور نمکپلا دے مٹھائی　　کہوں کس کس کا عالم تم سے بھائی
پیالے کھیر کے جوں ماہِ تاباں،　　کھلے یا جیسے نسرینِ گلستاں،
وہ تحفہ خوانچے ماقوتیوں کے　　کہ جیسے زرد گل داؤدیوں کے
دھرے خوشبو مزعفر کے پیالے　　کہ زردی پر ہنسے جن کی نوالے
وہ ماقوتی وہ فرنی مل کے باہم　　دکھاتی تھی گلِ نرگس کا عالم
وہ حلوے رشکِ یاقوتی و معجون　　دوا نہ جن کا بُقراط و فلاطون
خطائی اور کماچ اور گاؤ دیدے　　روٹی کے خشخشی ستھرے ملیدے

وہ ٹکڑے دودھ کے پکتے ہوئے سُرد ۔۔۔ گدا لذت پہ جن کی ہر زن و مرد
ملائی کے پیالے اور مٹکے ، ۔۔۔ زبانوں میں ہیں اب تک جن کے چسکے
مٹھائی روشن الدولہ کے یہاں کی ۔۔۔ بھر کوں سے جسے مصری بھی جھانکی

مشرقی کھانوں کا یہ مخصوص رنگ یوں تو واجد علی شاہ کے عہد تک قائم رہا لیکن سعادت علی خاں کے زمانے سے انگریزی کھانے بھی استعمال کئے جانے لگے تھے چنانچہ بشپ ہیبر نے غازی الدین حیدر کی جس دعوت کا تذکرہ کیا ہے اُس کا انتظام مشرقی انداز پر دستر خوان بچھانے کے بجائے انگریزی طرز میں ایک طویل میز پر ہی ہوا تھا۔ اور اس میں انگریزی فرنیچر اور انگریزی اور چینی ظروف کے ساتھ اشیائے خوردنی میں پلاؤ ، کباب وغیرہ کے علاوہ قہوہ ، چائے ، مکھن اور انڈا وغیرہ ایسی چیزیں موجود تھیں جنہیں مغربی حضرات بھی دلچسپی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ انگریزی کھانوں کی طرف توجہ اور رغبت نصیر الدین حیدر کی انگریز دوستی کے سبب کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ چنانچہ اُنہوں نے اپنے مطبخ کا مہتمم ایک فرانسیسی رکابدار کو مقرر کر دیا تھا جو کسی زمانے میں بنگال کلب واقع کلکتہ کا منتظم رہ چکا تھا۔ اس فرانسیسی کے زمانۂ ملازمت میں شاہی دستر خوان کے مغربی کھانے بھی خاصے مقبول ہو گئے تھے۔ اس بادشاہ کے ایک عام دستر خوان کی کیفیت بیان کرتے ہوئے نائٹین لکھتا ہے:۔

"کھانے کے کمرے میں جب ہم لوگ جا کے بیٹھے تو عجیب سماں نظر آیا۔ مغربی ممالک کا سامانِ عیش و عیش درسی نمائش کے ساتھ ملا ہوا دکھائی دیا۔ بادشاہ ایک زر نگار کرسی پہ جو زمین سے کچھ اُونچے پر بچھی تھی میز کے بیچ میں متمکن تھے۔ اور ہم لوگ اُن کے دونوں پہلوؤں پر بٹھائے گئے تھے۔ میز کا دوسرا رُخ بالکل خالی تھا۔ کچھ تو اس غرض سے کہ ملازمین کو رکابیاں ، اور پلیٹیں رکھنے اٹھانے میں دقت نہ ہو اور زیادہ تر اس غرض سے کہ جو کچھ کھیل تماشے اُس شب کے واسطے مخصوص تیار کئے گئے تھے انہیں بادشاہ سلامت بآسانی ملاحظہ فرما سکیں۔ ہم لوگ آ کے بیٹھے ہی تھے کہ قریب نصف درجن کے اعلیٰ درجے کی حسینہ اور جمیلہ خواصین ملبوسِ زر زیب تن کئے ہوئے اُس کمرے کے ایک گوشے

سے جہاں گلاچ کا ایک پردہ پڑا ہوا تھا برآمد ہوئیں۔ چونکہ ہمیں آگاہ کر دیا گیا تھا کہ ہرگز اچنبھے یا حیرت کی وجہ سے بھی اُن کی طرف نگاہ نہ جمائیں کیونکہ یہ خواتین مثل مستورات حرم شاہی لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ خیال کی جاتی ہیں۔ بادشاہ کی پُشت پر یہ عورتیں چُپ چاپ کھڑی ہو گئیں ..... یہ عورتیں نہایت خوشی اور سلیقے کے ساتھ مگس رانی یا حقّہ برداریِ شاہ کی خدمات اپنی باری باری باضابطہ انجام دیتی تھیں۔ کھانے کا سامان ہر طرح پر انگریزی طرز کا تھا اور اس تمام دعوت میں بہت ہی کم فرق کلکتے کے کسی بڑے گھر کی دعوت سے تھا۔ ہندوستانی خدمتگار ادب قاعدے سے بہت ہی خاموش آتے جاتے اور کام کرتے تھے اور ہم لوگ بادشاہ سے بے تکلف بات چیت کر رہے تھے۔ معمولی طریقے سے سُوپ دیگنی، مچھلی، بُھنی ہوئی رانیں، دال، چاول، میوہ جات اور تنقلات باری باری میز پر چُنے جاتے تھے۔ کھانا نہایت نفیس و لذیذ تھا کیونکہ اعلیٰ درجے کا فرانسیسی رکابدار مطبخِ شاہی کا مہتمم تھا۔" [۱]

امیرانہ کھانوں کے عام ذوق نے اودھ میں اس فن کو بہت ترقی دی چنانچہ لکھنؤ کے بازاروں میں بھی نفیس ترین نہاری، کباب، باقرخانی، شیرمال، نان جلیبی، دُودھ کی پُوریاں، گلوریاں اور پنجیری وغیرہ عموماً دوکانوں پر ملنے لگیں جن کو نزدیک و دُور کے شہروں میں بڑی شہرت حاصل ہو گئی۔

لباس

دربارِ مغلیہ کے آخری عہد تک دِلّی میں جو لباس رائج تھا بعض تصاویر اور تحریروں سے اُس کی تفصیل یہ معلوم ہوتی ہے کہ سر پر پگڑی، بدن میں شلوکہ اور اس کے اوپر جامہ جو بہت کچھ قبا سے مشابہ تھا، کمر میں پٹکا، ٹانگوں میں مشروع یا گلبدن کا تنگ مہریوں کا پائجامہ اور پیروں میں کفش نما ایڑی دار جُوتا۔ دربارِ اودھ میں یہ لباس آصف الدولہ کے عہد تک بہت کچھ برقرار رہا لیکن نواب وزیر علی اور سعادت علی خان کے عہد سے پگڑی کی جگہ شملہ اور جامہ کی جگہ "بالا بر" نے لے لی تھی۔ گرمیوں میں چکن یا شالی رومال اور سردیوں میں دوشالہ کندھوں

پر پڑا رہنے کا بھی رواج ہو گیا تھا۔ پائجامے کی تنگ مُہریاں بھی عرض کے پائنچوں سے جن میں چوڑی گوٹ ہوتی تھی بدل گئی تھیں۔ لیکن سعادت علی خاں انگریزی سوسائٹی کے اثر سے انگریزی لباس کے بھی شوقین تھے، اس لئے اُن کے عہد سے شاہی لباس سادگی اور انگریزیت کی طرف مائل ہو چلا تھا۔ بالآخر غازی الدین حیدر کی تاج پوشی نے پگڑی، سرپیچ اور شملہ کی وقعت کم کردی اور اب یہ لباس صرف علماء اور متوسلینِ ریاست کے لئے مخصوص رہ گیا۔ لیکن دربار میں حاضر ہونے والوں کے لئے مُندیل کی بھی اجازت دے دی گئی تھی جو "کارچوب" کی بنی ہوئی گول ٹوپی ہوتی تھی۔ اب شرفاء روزانہ کے لباس میں گول قبہ دار ٹوپیاں پہننے لگے تھے جن کے باہری حصے میں تنزیب کے پانچ پان اور اندرونی حصے میں نین سُکھ کی صراحیاں اور چاند اس طرح کاٹ کر لگائے جاتے تھے کہ جو باہر رُو نما ہو کر خوبصورتی پیدا کر دیتے تھے۔ جب ان ٹوپیوں میں نفاست کی طرف زیادہ توجہ کی گئی تو چکن پر زر لبفت کا کام بنا کر یہ ٹوپیاں تیار کی جانے لگیں۔ اسی زمانے میں کچھ عوام وخواص دو پلڑی ٹوپی بھی پہننے لگے تھے جس میں بیضاوی کاٹ کے دو پلّے جوڑ دیئے تھے۔ اس ٹوپی کی بناوٹ پر ترقی کر کے لکھنؤ کی تپلی مُنکّے دار ٹوپی ایجاد ہوئی جو اب بھی موسم گرما میں بعض لوگوں کے سروں پر نظر آجاتی ہے۔ واجد علی شاہ نے اپنے دربار کے خطاب یافتہ لوگوں کے لئے عالم پسند کے نام سے ایک جھوُلے دار ٹوپی ایجاد کی تھی جس کی جھولی پیچھے گردن کی طرف لٹکتی رہتی تھی۔

لکھنؤ دربار کے ابتدائی زمانے میں شلوکے کے اُوپر انگرکھے کا عام رواج تھا۔ ان شلوکوں میں بڑی بڑی نفاستیں پیدا کی گئیں اور اس کام میں اس لئے زیادہ اہتمام کیا گیا کہ تنزیب کے سفید انگرکھے میں سے شلوکے کا تمام کام جھلکتا رہے۔ انگرکھے کے ساتھ ساتھ چکن بھی لکھنؤ میں رائج تھا جس کی کاٹ تو "بالابر" سے مشابہ تھی لیکن "بالابر" ڈھیلی ڈھالی قبا ہوتی تھی اور چکن بالکل چُست رکھا جاتا تھا۔ پھر انگرکھے اور چکن کے اتصال سے لکھنؤ کے آخری زمانے میں اچکن ایجاد ہوئی اور شلوکے کی جگہ اوّل کُرتے نے اور پھر انگریزی اثرات کے عام ہوتے پر قمیص نے

لے لی۔ عوام اور بادشاہوں کے لباس اپنی قطع اور ساخت میں کوئی نمایاں امتیاز نہ رکھتے تھے صرف یہ فرق نظر آتا تھا کہ موخر الذکر کا لباس جواہرات اور زردوزی کی افراط سے زیادہ بیش قیمت ہوتا تھا۔ چنانچہ لیوپولڈ نے امجد علی شاہ کے لباس کی یہیں یہ تفصیل بتائی ہے :۔

"ایک سبز ریشم کا چغہ جس پر سنہرا روپہلا کام ہو رہا تھا اُن کے شانوں سے ٹخنوں تک لٹکتا تھا۔ سُرخ ریشم کا پائجامہ اور ایسا جُوتہ جس پر زردوزی ہو رہی تھی اور جس کی نوکیں اوپر کو مُڑی ہوئی تھیں وہ پہنے ہوئے تھے۔ وہ ایک اونچی ٹوپی مثلِ کُلاہ اوڑھے ہوئے تھے جو جواہرات میں چھپی ہوئی تھی۔ بڑے خوبصورت موتیوں کی متعدد لڑیاں اُن کی گردن میں پڑی ہوئی تھیں اور دو بیش قیمت ہیروں کی انگوٹھیاں وہ انگلی میں پہنے ہوئے تھے" [۱]

اسی صُورت سے "پکٹوریل لکھنؤ" میں ایک عینی شہادت واجد علی شاہ کے لباس کے متعلق یہ ملتی ہے :۔

"ہماری جگہ بادشاہ کے عین مقابل تھی جس سے ہمیں اُن جواہرات کے اندازہ کرنے کا بخوبی موقع ملا جن میں شاہی جسم سر سے پاؤں تک ڈوبا ہوا تھا۔ ہم نے اس آب و تاب کے جواہرات اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ موتیوں کی ایک بدھی ایک شانے سے دوسرے شانے تک پڑی ہوئی تھی جس میں زمرد کی ہڑیں اور الماس و یاقوت کی تختیاں آویزاں تھیں۔ پائجامہ اور شلوکہ ہیروں اور دوسرے قیمتی جواہرات سے لپا ہوا تھا اور یہ امر نہایت تعجب انگیز تھا کہ باوجود سر سے پاؤں تک جواہرات میں لدے ہوتے کے کمرے کی گرمی نے اُن پر کوئی اثر نہیں کیا" [۲]

علمائے اودھ کی پوشاک عوام و خواص سب سے مختلف ہوتی تھی اور ان میں بھی سُنّی علماء کا لباس شیعہ عالموں سے مختلف تھا۔ اوّل الذکر تو سیدھے سادے گول علمائے ایرانی وضع کے جامے، گلے میں تیلا دو پٹہ اور پاؤں میں ٹخنوں سے اُونچا مغلیہ پائجامہ پہنتے اور موخر الذکر کی وضع بہت کچھ عربی علماء سے مشابہ ہوتی تھی یعنی سر پہ قُبّہ نما سیاہ عمامہ بدن میں لمبا کُرتا جس

جس کا چاک بائیں شانے کے پاس ہوتا۔ کُرتے پر قبا، اور پاؤں میں چوڑے پائنچوں کا پائجامہ۔

عورتوں کے اوپری حصّے کا لباس تھوڑے بہت تغیر کے ساتھ ہندوستان کے ہر حصّے میں قدیم زمانے سے ایک ہی چلا آرہا تھا یعنی سر پر دوپٹہ، سینہ پر تنگ محرم اور پیٹ اور پیٹھ پر ایک خاص قطع کی کُرتی لیکن لکھنؤ میں دوپٹہ، محرم اور کُرتی سب میں ٹیکی، نفاست اور آرائش کو مدِ نظر رکھا گیا تھا چنانچہ کریپ کا چُنا ہوا باریک دوپٹہ اور لاہی کی محرم عام طور پر استعمال ہونے لگی تھی۔ انگیا کُرتی کے اُوپر جامہ دان کا بھی عام رواج تھا جو نفیس ترین ململ کے بنائے جاتے تھے اور جن میں ریشم یا کامدانی کی پھول پتیاں بھی ہوتی ہیں۔ زیریں حصّے کا زنانہ لباس دلّی میں ڈھیلے پائنچوں کا پائجامہ تھا جو لکھنؤ میں آکر چُست ہوگیا تھا لیکن نصیرالدین حیدر کے عہد میں چُست پائنچوں کا رواج کم ہوگیا اور امیرزادیوں نے گھیردار پائجاموں کو زیادہ پسند کیا جن کے دامنوں کو چلتے وقت کئی کئی خادمائیں سنبھالے رہتی تھیں۔ ناٹیٹن نے ایک تقریب کے نظارے سے بیگماتِ شاہی کے لباس کی تفصیل اس طرح بیان کی ہے:۔

"ہم کو خاص بیگمات کے پہناوے دیکھنے کا بھی اتفاق اکثر ہوا۔۔۔۔ اس لباس میں پائجامہ ساٹن کمخواب یا کسی اور نفیس ریشمی کپڑے کا ہوتا۔ کمر گھٹنوں میں چھنا چھنا لیکن نیچے پہنچ کے خوب پھیلا ہوا۔ بڑے بڑے پائنچے ڈھیر کے ڈھیر کبھی آگے زمین پر پڑے ہوئے، کبھی ان میں گرہ لگی ہوئی، کبھی ٹانگوں کے پیچھے دُور تک فرش کو جھاڑو دیتے ہوئے، کبھی کمر میں کھونسے ہوئے اور اُن پر روپہلی سنہری پٹیاں لگی ہوئیں۔ سامنے کی طرف زرتار اِزار بند لٹکتا ہوا۔ اس کے پھُندنے زانو پر پڑے ہوئے۔ جگہ جگہ پر کمر بندوں میں جواہرات اور مرتی ٹنکے ہوئے۔ ان پائجاموں کا گھیر چُست اور چپٹی سے کسا کولھوں میں بالکل چھنا چھنا ہوتا اور آگے بتدریج پھیلتے جانا عجب بہار دکھاتا تھا۔ سینہ پر محرم یا سینہ بند اکثر کسی نازک ہلکے کپڑے کی ہوتی تھی جیسے جالی، لگاچ یا باریک ململ کی۔ محرم سے سینے کا اُبھار پوری طرح سے نظر آتا تھا کیونکہ جس قدر زیادہ باریک کپڑے کی بنائی جاتی تھی، اُتنی ہی

نفاستِ مذاق ظاہر ہوتی تھی۔ یہی پوشش عام ہندوستانی عورات کی ہے۔ اس کی سلائی اور قطع برید اور سجاوٹ میں بڑی دستکاری صرف کی جاتی ہے۔ اس کے گرد گردن سے لے کر نیچے تک اور کٹوریوں میں بیل، بُنت، سلمے ستارے کے نہایت نازک کام بنا ہوتا تھا۔ محرم پر ایک کُرتی کمر تک ہوتی تھی۔ یہ اکثر جالی کی ہوتی تھی اگرچہ کُرتی اوپر سے پہنی جاتی تھی لیکن اس سے محرم کا جوبن، زیورات کی آب و تاب، سینہ اور پیٹی کا حسن ہرگز چھپ نہ سکتا تھا۔ سب چیزیں ہو بہو نظر آتی تھیں اور ان پر کُرتی کا زرق برق مسالہ اور بھی رُوپ دکھاتا تھا۔ اس پوشاک پر ایک ہلکا سا دوپٹہ بھی اوڑھا جاتا تھا۔ دوپٹے اکثر سنہری اور رُوپہلی بادلے کے ہوتے تھے۔" [۱]

جہاں تک جُوتے کا تعلق ہے اس میں دِلّی کی سلیم شاہی وضع سے کچھ زیادہ فرق نہیں پیدا ہوا تھا البتہ سُبکی، نرمی، آرائش و زیبائش وغیرہ میں لکھنؤ نے اس کے اندر بھی کمال دکھایا تھا۔ لکھنؤ کے معروف "خورد نوکے" جُوتے مخمل، کمخواب، بانات، زربفت اور کیمخت وغیرہ کے عام طور پر بنتے تھے جن میں کلابتو، کامدانی اور سلما ستارہ وغیرہ کا حسین و نازک کام ہوتا تھا۔

اب ہم اس تمام بحث کو مولانا عبدالحلیم شرر کے ایک فقرے پر ختم کرتے ہیں جس میں اُنھوں نے غازی الدین حیدر کے بعد لکھنؤ کے امیروں کی عام وضع بیان کی ہے:-

"بخلاف دیگر مقامات کے رئیسوں کے یہاں لکھنؤ میں یہ عام وضع ہوگئی کہ سر پر مانگ، اُس پر سالے کی کامدار ٹوپی، کانوں تک بال جن میں کنگھی کرنے میں ماتھے پر دونوں جانب پٹیاں جمائی جاتیں۔ منہ میں پان، ہونٹوں پر لاکھا، پنڈے میں تین تین کرتیوں کا چُست انگرکھا، اس کے نیچے گلبدن کا ریشمی کمپا ہوا گھٹنا، ہاتھوں میں مہندی، پاؤں میں ٹاٹ بافی یعنی کامدار بُوٹ اجاڑوں میں انگرکھے کی جگہ نیلے، زرد، یا سبز شُتر نوخ اطلس یا گرنٹ کا روئی دار دگلا۔" [۲]

زیورات اور سامانِ آرائش

اودھ کی عورتوں کی شکل وصورت اور خدوخال کی دلکشی کا اعتراف مسز کنڈرسلے نے بھی اپنے خطوط میں کیا ہے۔ اُن کی پیشانی کی کشادگی، ابروؤں کی نفاست، آنکھوں کی تراش، پلکوں کی درازی اور چہرے کی نرمی ایک انگریز خاتون کو بھی قابلِ ستائش نظر آئی تھی۔ لیکن اِن دلکش خدوخال کی آرائش وزیبائش پر مزید توجہ کی جاتی تھی چنانچہ عورتیں بعض خاص پتیوں سے اپنے سر اور ابرو کے بال دھوتی تھیں جن سے وہ زیادہ سیاہ اور تابناک ہوجاتے تھے۔ آنکھوں میں خطوطِ سُرمہ کی گوشۂ چشم کے باہر تک کشیدگی ایک خاص لطف پیدا کردیتی تھی، ہونٹوں پر پان کا لاکھا، دانتوں میں مسّی کا اُودا پن، ہاتھ پیروں کی ہتھیلیوں اور ناخنوں میں حنا کی سُرخی اور اس میں نفاست کے ساتھ کچھ نقش ونگار، اُن کے حُسن کی رنگینی میں اضافہ کردیتے تھے۔ اِس زیبائش پر اُن کے زیورات اُن کے حُسن کو چار چاند لگا دیتے تھے۔ ان زیورات میں سے بعض کے نام یہ ہیں۔ سر پر سنگار پٹی، ماتھے پر ٹیکا اور جھومر، کانوں میں بالیاں، بجلیاں، کان چین، بُندے اور پتے، گلے میں تُلسی، مالا، گلوبند، چمپاکلی، مُگتا اور ہار، بازوؤں میں جوشن اور نورتنگے، ہاتھوں میں کڑے، چوڑیاں، جہانگیریاں، پہنچیاں، کنگن اور علی بند، انگلیوں میں آرسی، چھلّے اور انگشتریاں، پیروں میں بِل، جھانوریاں، کڑے، چاند توڑے، چھاگل، پازیب، کشتیاں اور رام جھول وغیرہ۔ امیر عورتوں کے اِن زیورات میں قیمتی موتی، زمرد، ہیرے، نیلم اور پکھراج وغیرہ کا جڑاؤ کام ہوتا تھا جن کی وجہ سے اُن کی تاب وتابش میں نمایاں اضافہ ہوجاتا تھا۔

مُعاشرت

اودھ کے عام باشندے اپنی عادات واطوار کے اعتبار سے بڑے معتدل نرم مزاج، پُرتامل اور مہمان نواز رہے ہیں اور مسز کنڈرسلے، جارج فورسٹر، ولیم ہوجز وغیرہ بہت سے سیاحوں نے اُن کی اِن خصوصیات کی طرف بھی اشارات کیے ہیں۔ یہاں کے اونچے طبقے کی عورتوں میں پردے کا عام دستور تھا۔ ہندوؤں میں ان کی شادی

بچپن ہی میں ہو جاتی تھی لیکن مسلمان عموماً بلوغ کے بعد اپنے بچے بچیوں کی شادی کرتے تھے۔ مسلمان اُمراء کے علاوہ اُمرائے ہنود میں بھی ایک مرد کی کئی شادیاں ہونے کا رواج تھا۔ لیکن آبادی کی زیادہ تعداد صرف ایک ہی بیوی پر قناعت کرتی تھی۔ ہندوؤں اور بالخصوص راجپوتوں میں ستی ہونے کا عام رواج تھا لیکن سلیمین نے راجپوتوں میں اس کے علاوہ ایک اور مکروہ رسم کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ جب ان کے یہاں لڑکا پیدا ہوتا ہے تو خوشی میں بندوقیں چھوڑتے ہیں، خیرات کرتے ہیں، مندروں پر چڑھاوے چڑھاتے ہیں، غرض ہر طرح سے خوشیاں مناتے ہیں۔ لیکن جب لڑکی پیدا ہوتی ہے تو تمام گھر میں ایک سناٹا چھا جاتا ہے اور اُسے زندہ ہی دفن کر دیتے ہیں [۱] واجد علی شاہ نے یہ دونوں قبیح رسمیں یعنی ستی اور لڑکیوں کا قتل بند کرنے کے احکامات صادر کر دیئے تھے [۲]

تمام ملک اودھ اندازِ گفتگو کی شیرینی میں ایک خاص امتیاز رکھتا تھا لیکن شہروں کے باشندے خصوصیت کے ساتھ بڑی نرم و نازک زبان بولتے تھے اور لکھنؤ تو اپنی شائستگیِ زبان کے علاوہ مذاقِ معاشرت، شستگیِ ذوق وغیرہ سب میں ایک خاص دلکشی رکھتا تھا۔ ایک انگریز خاتون جس نے ایک مدت تک لکھنؤ میں قیام کیا تھا، یہاں کے باشندوں کے متعلق یہ رائے ظاہر کی تھی کہ یہ لوگ نہایت متمدن، مہذب اور اپنی گفتگو میں بہت شائستہ ہوتے ہیں۔ حقیقت میں لکھنؤ کے خاص و عام کا مذاق نہایت ستھرا اور لب و لہجہ بہت دلکش تھا۔ ہر خُرد و کلاں، امیر و غریب اور جاہل و عالم میں شاعرانہ ذوق اس قدر بس گیا تھا کہ پردہ نشین خواتین تک ادبی نکات سمجھنے اور تخیل کی رنگینیوں کی داد دینے کی صلاحیت رکھتی تھیں۔ اُن کی نسائیت نے اُن کے لب و لہجہ کو مردوں سے زیادہ دلکش بنا دیا تھا جس پر لکھنؤ کے خالص بیگماتی محاورات نے اور زیادہ لطافت پیدا کر دی تھی۔ اسی بنیاد پر ایک ریختی نگار شاعر، بیگم نے اپنی ایک ریختی میں یہ دعوے کیا تھا کہ ؎

زباں کے خُلد کی ہے حورِ عورت ۔۔۔ اگر ہو لکھنؤ کے بوستاں سے

شاعری کے علاوہ لطیفہ گوئی، طنز، پھبتی، ضلع جگت اور تلازمے میں بھی لکھنؤ والوں کا خاص حصّہ رہا ہے۔ نو عمر لڑکے، اجاہل، اہلِ حرفہ، زنانِ بازاری اور ادنیٰ طبقے کے مرد و زن وغیرہ بھی اکثر ایسی پھبتیاں کہہ جاتے تھے کہ جن کا جواب نہیں ہوتا تھا۔ ضلع یا رعایتِ شاعرانہ میں اگرچہ لکھنؤ کے شعرا نے سیکڑوں دیوان مرتب کر دیئے ہیں لیکن عام لوگوں میں بھی اس کا چرچا کچھ کم نہ تھا حتیٰ کہ فقیر فقرا، اور بازاری عورتیں بھی ضلع بولنے میں طاق تھیں۔ ان لطافتوں کے ما ورا، آداب و سلام کے قاعدے، نشست و برخاست کے انداز، استقبال اور مزاج پُرسی کے اسلوب، آدابِ مجلس کے طور طریق لکھنؤ میں ایک فن کی حیثیت پا گئے تھے۔ شاعری کا ذوق اتنا بڑھ گیا تھا کہ شادی بیاہ کے دعوت نامے، موت و حیات کے رُقعے، مجلس و محفل کے اشتہار نظموں میں لکھے جانے لگے تھے اس لئے عام طور پر لکھنؤ والوں کو موزوں طبع سمجھا جانے لگا تھا۔ شررؔ نے لکھا ہے کہ آدابِ معاشرت میں اہم چیز گفتگو اور طرزِ کلام ہے۔ دُنیا میں ہر شخص کی شائستگی اور ادبی قابلیت کا پہلا اندازہ اُس کے اندازِ گفتگو سے ہوتا ہے۔ دُنیا کی ہر اقبال مند قوم پہلے اپنی زبان کی اصلاح کرتی ہے اور اُسے ترقی دیتی ہے۔ اس بارۂ خاص میں اہلِ زبانِ لکھنؤ یہاں کے شائستہ لوگوں کو جو کمال حاصل ہے وہ ہندوستان کے کسی اور شہر والوں میں نظر نہ آئے گا۔

طوائف معاشی فارغ البالی کی وجہ سے اودھ کی فضاؤں میں عیش پسندی کے عناصر بہت قدیم سے چلے آ رہے تھے۔ پھر شاہانِ اودھ کی قومی و نسلی روایات بھی بہ حیثیت ایک ایرانی کے کچھ نہ تھیں۔ چنانچہ جب اِن والیانِ ریاست کو سیاسی اطمینان حاصل ہو گیا تو انھوں نے سازِ عشرت کی لَے کچھ اور بڑھا دی۔ ان کے رہن سہن، کھانے پینے، اور ذوق و شوق ہر چیز میں اسی عیش پسندی کا جذبہ شامل رہا ہے۔ حسن، نغمہ اور شراب قدیم زمانے سے لوازمۂ عشرت خیال کئے جاتے تھے۔ چنانچہ ان سے دلچسپی اودھ میں بھی باقی رہی ہے۔ جہاں تک جمال پرستی کا تعلق ہے وہ اودھ کے لئے اس درجہ مخصوص ہو گئی تھی کہ زنانِ بازاری

سے اختلاط عیب نہیں خیال کیا جاتا تھا۔ عورت ہر صاحبِ ثروت کی زندگی کا ایک جزو ہو گئی تھی۔ معشوقوں کی نکلی ہوئی اُبرو باختہ طوائف مہمانوں کے استقبال اور بچوں کی تربیت کے لئے عام طور پر ملازم رکھی جاتی تھی۔ شجاع الدولہ سے واجد علی شاہ تک بہ استثنائے امجد علی شاہ کون شخص تھا جسے حُسن پرستی کے جذبے سے بیگانہ سمجھا جائے۔ شجاع الدولہ کے متعلق ہر چرن داس کا بیان ہے کہ،

• اُن کے حرم میں دو ہزار سات سو سے زیادہ عورتیں تھیں جن میں سے دو ہزار خواصیں اور سات سو ایک اُن کے محلات تھے۔ ان میں سے بہو بیگم صاحبہ خاص محل تھیں اور باقی بیویاں خورد محل کہلاتی تھیں۔" [۱]

• خود بہو بیگم آصف الدولہ کو ایک خط میں لکھتی ہیں کہ شجاع الدولہ کے حرم میں کئی ہزار عورتیں تھیں جن میں سے بعض سے نکاح ہوا تھا اور بعض سے نہیں ہوا تھا۔ [۲]

شجاع الدولہ کا ذوقِ حُسن پرستی صرف حرم ہی پر کمتفی نہ تھا بلکہ بعض زنانِ بازاری بھی اُن کے دائرۂ پسندیدگی میں کسی نہ کسی ذیل سے آجاتی تھیں، اس لئے اودھ میں خوشحال طوائفوں کی کثرت تھی۔ اپنے والد کی طرح آصف الدولہ میں بھی عیش پسندی کا رجحان پایا جاتا تھا لیکن سعادت علی خان کی کفایت شعاری اور ضبط و تحمل کے پیشِ نظر اُن پر کسی بے راہ رَوی کا شبہ نہیں ہو سکتا تھا تاہم ایک ہمعصر مؤرخ اُن کے متعلق بھی انکشافات کرتا ہے کہ،

• حضور (سعادت علی خاں) نے اپنے قدومِ میمنت سے لکھنؤ کو رشکِ بہارستان بنا دیا اور ۱۲۱۶ھ/۱۸۰۴ء تک رنگ رلیوں میں مصروف رہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ زنانِ کسبی ہر سال ایّامِ ہولی میں سیکڑوں ہزار نقد و جواہر گراں بہا پاتی تھیں۔ چنانچہ اُس سال بھی ایسا ہی ہوا۔ لیکن ۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء میں حضورِ عالی نے آستانِ جنابِ عبّاس علیہ السلام پر جا کر توبہ کی اور اُس وقت سے آج تک خدا کے فضل سے پھر زبان پر ان عیاشیوں کا ذکر نہیں لائے۔ [۱]

اسی طرح انشاء اللہ خاں "دریائے لطافت" میں سعادت علی خاں کی فصاحتِ زبان کی تعریف

کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

"جس کسی کو میرے قول میں خوشامد کا گمان نظر آئے وہ ہولی کے ایام میں نواب کے حضور میں حاضر ہو کر دیکھے کہ راجہ اندر پریوں کے اکھاڑے میں اچھا معلوم ہوتا ہے یا نواب، حور نژادوں کے مجمع میں۔"

نجم الغنی نے بھی کسی ہمعصر شہادت کا حوالہ دیئے بغیر اُن کے متعلق لکھا ہے کہ:۔

"نواب ایسے حسن پرست تھے کہ اہلِ شہر حسن پرستی کا لفظ اُن کی نسبت اطلاق کرتے ہیں۔"[۲۱]

غازی الدین حیدر بھی اپنے ذوقِ حسن پرستی میں طاق تھے۔ چنانچہ اُن کے عہدِ حکومت میں لکھنؤ کے گلی کوچے مینا بازار بن گئے تھے اور لکھنؤ حسین عورتوں سے معمور ہو گیا تھا۔ ہر طرف اربابِ نشاط اور زنانِ بازاری کے چرچے تھے۔ اُن کے بعد اُن کے صاحبزادے نصیر الدین حیدر نے بھی اس ذوق کی تکمیل میں کوئی کمی نہ کی۔ چنانچہ نائٹین کی کتاب اس قسم کے متعدد بیانات اپنے صفحات میں محفوظ رکھتی ہے۔ علاوہ ازیں دوسرے ذرائع سے بھی ہمیں اُن کے بڑھے ہوئے ذوقِ جمال کا پتا ملتا ہے۔ چنانچہ رجب علی بیگ فسانۂ عبرت میں لکھتے ہیں:۔

"ستر سو چلنے والیاں، نادرۂ زمانہ، مشہورۂ آفاق، محبوبی میں طاق، ملازم تھیں۔ بارہ سو چُست و چالاک بیباک فنِ موسیقی میں یکتا، جانِ دلبری، سراپا ناز۔ اُن کے علاوہ ہزاروں رنڈیاں جوبن کی متوالیاں، ماہ سیما، رشکِ مہر، کمسن، جن کے اُمنگ کے دن اڑی رُو، حافظ ہیراں گریا جلنے کی جان ہیں۔"

نصیر الدین حیدر کی وفات کے بعد چند مخصوص محل باقی رہ گئی تھیں لیکن بازاری اور پیشہ ور عورتیں درخواست دے کر محمد علی شاہ کی مرضی سے اپنی پچھلی زندگی پر لوٹ گئی تھیں اور اُنہوں نے طوائفوں اور خانگیوں کی تعداد میں بہت نمایاں اضافہ کر دیا تھا۔ رجب علی بیگ سرور نے فسانۂ عبرت میں لکھا ہے کہ اُن دنوں لکھنؤ میں رنڈیوں کی یہ کثرت ہوئی کہ گلی کوچے بھر گئے۔[۲۲]

محمد علی شاہ بھی اپنے عالمِ شباب میں اس ذوق کے لیے خاصے مشہور رہے تھے لیکن

تخت نشینی کے وقت چونکہ وہ عمر کی آخری منزل میں تھے اس لئے اُس وقت اُن کے مذاق کے آثار باقی نہیں رہے تھے اور اُن کے بعد اُن کے ایسے صاحبزادے یعنی امجد علی شاہ تخت نشین ہوئے جو شاہانِ اودھ میں سب سے زیادہ صاحبِ تقوےٰ اور دیندار شخص تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ لہو ولعب اور عیش پسندی کی طرف کوئی رُجحان نہیں رکھتے تھے لیکن شہر کے خاص وعام کے مذاقِ حُسن پرستی میں اب بھی کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ چنانچہ اُن کے عہد میں بھی کوچہ و بازار پریزادوں سے بھرے ہوئے تھے۔ لیوپولڈ وان اورلچ اپنے سفرنامے میں چوک بازار کی رونق کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:-

"چوک بازار میں دُکانیں نچلی منزل میں ہیں۔ اُوپر کی دو منزلیں اقامتی کمروں اور اُن کے سامنے ایک خوبصورت منقش برآمدے پر مشتمل ہیں۔ جوں ہی سُورج غروب ہونا شروع ہوتا ہے اِن مکانات کی باشندگان مختلف حلقوں میں برآمدوں کے اندر نظر آنے لگتی ہیں اور سڑک پر سے گذرنے والوں کو دیکھنے لگتی ہیں۔ چونکہ یہ طوائف اکثر بلانقاب ظاہر ہوتی ہیں اس لئے مجھے لکھنؤ کی ان خوبصورت عورتوں کے دیکھنے کا کافی موقع ملا ہے۔ وہ تمام سر برہنہ تھیں اور اُن کے سیاہ خوبصورت بال یا تو مُوباف میں بندھے ہوئے چوٹیوں کی شکل سے لٹکتے تھے یا موتیوں سے گُندھے ہوئے تھے۔ ان میں سے بیشتر نتھنیاں پہنے ہوئے تھیں جو اُن کے رُخساروں پر لٹک رہی تھیں۔ ان کے کانوں کے زیورات ان کے شانوں کو چھو رہے تھے۔ ان میں بہت کم کو حسین کہا جا سکتا ہے لیکن وہ سب دِل برمانے والی نگاہیں رکھتی تھیں جو سُرمے کی سیاہی سے اور زیادہ چمکدار ہو گئی تھیں۔ ایک رنگین رُومال بڑی خوبصورتی اور نزاکت سے اُن کی گردن اور کندھوں پر پڑا ہوا تھا، جو اُن کے بالائی حصۂ جسم کو بجائے چھپانے کے اور نمایاں کر رہا تھا۔ وہ ہم پر فقرے اور پھبتیاں کسنے سے نہیں چُوکیں اور مسکرا کر، قہقہہ لگا کر، مذاق کر کے ہماری توجہ کو منعطف کرنے کے لئے کوشاں رہیں لیکن چونکہ یہ طوائفیں اکثر پیچھے پڑ جایا کرتی ہیں اس لئے ان کی طرف التفات قرینِ مصلحت نہیں ہوتا۔" [1]

اسی عہدِ حکومت میں مرزا واجد علی، اودھ کے ولی عہد تھے۔ کمسنی ہی سے وہ حسن پرستی کی طرف مائل تھے۔ اُن کی شادی اگرچہ پندرہ ہی سال کے سن میں ہو گئی تھی لیکن وہ درپردہ محل کی کنیزوں سے بھی چھیڑ چھاڑ رکھتے تھے۔ آخر اُن کے جوشِ جوانی نے یہ ترکیب ذہن نشین کرائی کہ کچھ عورتوں کو بطریقِ خدمت گذاری نوکر رکھ کر پوشیدہ اُن سے رابطۂ محبت پیدا کریں۔ چنانچہ اٹھارہ حسین عورتیں چنور برداری کی خدمت پر مامور ہوئیں اور حضور والیاں خطاب پایا۔ کچھ عورتیں خواصوں کے زمرے میں شامل ہوئیں۔ بعض کنیزی میں رکھی گئیں اور ایک بڑی تعداد پری خانہ میں رقص و موسیقی کے نام سے رفتہ رفتہ داخل ہوئی۔ پری خانہ کی عورتیں عموماً اربابِ نشاط میں سے تھیں اُن کے خطابات یاسمن پری، سلیمان پری، عزت پری، سلطان پری، حور پری، ماہ رخ پری، امتیاز پری، دلربا پری، سرفراز پری، سردار پری، عجائب پری، شہنشاہ پری، معشوق پری، مہک پری، دلدار پری، حور پری، نور افشاں پری، اور بلقیس پری وغیرہ تھے۔ ان پریوں کے لئے رنگ برنگ لباس تیار ہوئے تھے اور لاکھوں روپے کا ساز و سامان بنا تھا۔ ان سب پریوں نے رفتہ رفتہ فنِ موسیقی میں بقول واجد علی شاہ وہ کمال حاصل کیا تھا کہ راجہ اندر کو ان کی چھبی و چالاکی پر رشک و حسد ہوتا تھا۔ ان میں سے ہر ایک کا عشوہ و انداز و ادا انسان کا دل ٹکڑے ٹکڑے کرتا تھا۔ واجد علی شاہ لکھتے ہیں کہ یہ تمام جلسۂ عشق باز و معشوق مزاج میری نظر میں تھا۔ اگر ایک کے فریب سے چھوٹتا تھا تو دوسرے کے جال میں گرفتار ہو جاتا تھا۔ ہر گھڑی خوابِ غمزہ و نازش گفتگو و حکایات، سیر و تماشا۔ بغیر ان پریوں کے ہرگز اچھا نہ معلوم ہوتا تھا [۱]

سیر و شکار

شاہی عہد سے لکھنؤ، باغات، سبزہ زاروں اور چمنستانوں کا شہر کہلاتا ہے۔ اس ذوق نے اوّل اوّل فیض آباد میں اپنا اظہار کیا تھا چنانچہ تاریخ فرح بخش سے شہادت ملتی ہے کہ نواب صفدر جنگ کے عہد میں حویلی اودھ کے حصار کے باہر مغل اُمراء نے کچھ باغات لگائے تھے جن میں وہ اکثر سیر و تفریح کے لئے آتے تھے۔ پھر نواب شجاع الدولہ نے بھی باغات میں اضافے کئے۔ اُن کے عہد میں تین باغات خاص شہر کے اندر واقع ہوئے

تھے جو شہزادگان اور شریف زادگان کی سیر کے قابل تھے۔ انگوری باغ تو خاص محل کے اندر تھا اور تمام احاطے کا چوتھائی حصّہ گھیرے ہوئے تھا۔ موتی باغ، چوک بازار کے عین وسط میں واقع تھا۔ اور لال باغ جو وسعت میں ان سب سے زیادہ تھا، اپنے مخصوص و معروف پھولوں کی وجہ سے بہت قابلِ قدر سمجھا جاتا تھا۔ یہ صوبے بھر میں یہاں تک مشہور ہو گیا تھا کہ ہر شخص اس میں سیر کا متمنی رہتا تھا۔ شہر کے نوجوان اس میں حلقہ حلقہ سیر و تفریح کے لئے جایا کرتے تھے۔ یہ باغ اتنا دلکش تھا کہ جب شاہِ عالم بادشاہ الٰہ آباد سے یہاں آئے تھے تو انہوں نے اسی میں ایک مدت تک قیام کیا تھا۔ فیض آباد کے باقی دو باغات یعنی آصف باغ اور بلند باغ لکھنؤ کی سمت شہر کی سرحد پر واقع تھے [۱] ان باغات کی نگرانی کے لئے بقول ہرچرن داس ایک ہزار باغبان ملازم تھے۔ شہری علاقے کے باغات کے علاوہ شہر پناہ کے چاروں طرف تین میل کا دور باغات اور سبزہ زاروں اور چمنستانوں سے بھرا ہوا تھا۔ فیض آباد کے علاوہ لکھنؤ میں بھی آصف الدولہ کے عہد میں بہت سے نئے باغات کی داغ بیل ڈالی گئی تھی۔ بالآخر ان دونوں شہروں میں بقول ابو طالب سیکڑوں باغات نواب وزیر کی ملکیت ہو گئے تھے۔ جن کی نگرانی کے لئے چار ہزار ملازم موجود تھے [۲] سید عبداللطیف شوستری نے "تحفۃ العالم" میں ان باغات کی کچھ تفصیل دی ہے:۔

"قریب چار سو عمارات مع سامانِ آرائش اور سرسبز باغات شہر اور بیرونِ شہر واقع تھیں۔ عمارات سے ملحق یا جداگانہ جتنے بھی باغات تھے سب بے نظیر تھے۔ ان کی نگرانی، چمن بندی، تخم ریزی اور پیوند سازی وغیرہ کے کام کے لئے یورپین یا چینی ماہر فن باغبان ملازم تھے جنہوں نے درختوں کو اس ہنرمندی کے ساتھ ترتیب دیا تھا کہ ہر ایک باغ رشکِ روضۂ رضواں اور حسرت افزائے نوبہارِ اصفہاں بنا ہوا تھا۔ انہیں باغات میں سے عیش باغ کو میں نے دیکھا جس کے درخت ایک دو ذرع دست سے زیادہ نہ تھے اور وہ تمام کے تمام پھلوں سے لدے ہوئے تھے۔ گلاب کی ایک قسم ایسی بھی دیکھی جو چاروں فصلوں میں پھول دیتی تھی۔ یعنی اپنے مقررہ موسم میں کچھ زیادہ لیکن خلافِ موسم تعدد سے کمی کے ساتھ۔ اس قسم کے گلاب بنگال اور دوسرے شہروں

میں بھی کہیں کہیں ملتے ہیں۔ اصل میں یہ پودے فرنگیوں نے چین سے حاصل کئے تھے، جو اب تمام ملک میں پھیل گئے ہیں۔ میں نے چھوٹے درختوں کی بابت دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہ اہلِ چین کی صنعت کاری ہے کہ جس درخت کو جس حد پر چاہیں اتنے ہی قد کے اوپر اُس سے ثمر حاصل کر سکتے ہیں۔" [۱]

سعادت علی خاں کے زمانے میں بھی ان ذرائع سیر و تفریح میں مزید اضافہ ہوا چنانچہ کوٹھی دلکشا اور اُس کے ساتھ باغِ دلکشا تعمیر ہوئے اس پارک کے متعلق بشپ ہیبر لکھتا ہے کہ:-

"یہ پارک بہت وسیع ہے اور اس کے بعض حصّے حسین ترین ہیں جو گنجان جنگلات کی وجہ سے مختلف النوع مناظر پیش کرتے ہیں۔ کچھ حصّے بہت کھُلے ہوئے اور سیر و گشت کے لئے بہت مفید ہیں۔ یہاں میں ہرن، بارہ سنگھے اور نیل گائیں پھرتی نظر آتی ہیں۔" [۲]

مختصر یہ کہ اودھ کے مختلف حکمرانوں کے عہد میں دارالسلطنت کے سبزہ زاروں اور چمنستانوں میں مسلسل اضافے ہوتے رہے جن کی تفصیلات ہمیں بعض سیاحوں کے بیانات سے بھی حاصل ہوتی ہیں۔ مثلاً لیوپولڈ نے بزمانۂ امجد علی شاہ لکھا تھا کہ:-

"نصیری باغ فرانسیسی انداز پر بنا ہوا ہے۔ یہ دریا کے نزدیک واقع ہے اور اس کے وسط میں ایک بنگلہ ہے جو سامانِ آرائش سے مزیّن ہے۔ اسی باغ کے مُتصل "بادشاہ باغ" واقع ہے جو بہت خوشنما اور وسیع ہے۔ یہ انگریزی انداز پر ترتیب دیا ہوا ایک غیر معمولی طور پر خوبصورت باغ ہے۔ اس میں متعدد فوارے جوش مارتے ہیں۔ آم کے سبز سبز پتوں کے سائے میں سینکڑوں قسم کے پھولوں کی کیاریاں موجود ہیں اور باغ میں جا بجا پتھر کے رنگین مجسّمے نصب ہیں۔ اس باغ کے دوسرے سرے پر دو بنگلے بھی ہیں جن کے متصل ایک حرم سرا موجود ہے۔ یہاں بادشاہ سلامت (امجد علی شاہ) دُنیا کے جھگڑوں سے چھُوٹ کر چند روز تنہائی کا لُطف لینے کے لئے اپنے حرمِ شاہی کے ساتھ آجاتے ہیں۔" [۳]

یہ اور اسی قسم کے متعدد باغات اور چمنستان مثل سکندر باغ، بنارسی باغ، عالم باغ اور چار باغ وغیرہ لکھنؤ میں ایک

وسیع رقبہ گھیرے ہوئے تھے اور اہلِ شہر کی سیر و تفریح کے لئے بہترین مواقع مہیا کرتے تھے۔

باغات سے قطع نظر، اودھ میں شکارگاہوں کی بھی کثرت تھی۔ سلیمین کے بیان سے پتا چلتا ہے کہ یہاں ترائی کے علاقے کے علاوہ چوبیس[۲] جنگلات اور بھی تھے جو آٹھ سو چھیاسی (۸۸۶) مربع میل میں پھیلے ہوئے تھے اور شکار کے لئے بہترین جانور مہیا کرتے تھے۔ یہاں نہ صرف حکمرانوں بلکہ تعلقہ داروں، زمینداروں اور متوسلینِ ریاست کو بھی شکار کھیلنے کی اجازت تھی۔ ان قدرتی شکارگاہوں کے علاوہ شجاع الدولہ نے حوالیِ فیض آباد میں دو اور شکارگاہیں بھی تیار کرائی تھیں۔ جن میں سے ایک گرجی بیگ خان کی مسجد سے گپتارگھاٹ تک ایک وسیع علاقے میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے دو طرف کچی دیواریں تھیں اور تیسری طرف دریائے گھاگرا واقع تھا۔ اس کے اندر شکار کے جنگلی جانور مثل چیتل، ہرن، بارہ سنگھے، نیل گائے ذخیرہ چھوڑی گئی تھیں۔ فیض آباد میں دوسری شکارگاہ مشرقی سمت میں موضع جنوڑا اور چھاؤنی گنشائیں سے دریا کے کنارے چھ میل تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس میں گیارہ مواضعات کی اراضی شامل تھی [۱]

ان شکارگاہوں کا تیار کرانا ہی خود اس بات کی دلیل ہے کہ شجاع الدولہ شکار کھیلنے کے بہت شائق تھے۔ شجاع الدولہ کے شکار کھیلنے کی تفصیلات ہم پچھلے باب میں کسی حد تک بیان کر چکے ہیں۔ اب ان کے صاحبزادے یعنی آصف الدولہ کی سیر و شکار سے دلچسپی کا کچھ تذکرہ ضروری سمجھتے ہیں۔ ہمیں بعض معاصرین کی تالیفات سے اُن کے مذاقِ سیر و شکار کی کیفیات بھی معلوم ہوتی ہیں مثلاً میر تقی میر نے آصف الدولہ کے ہمراہ شکار پر جانے اور لطف اندوز ہونے کی بہت سی تفصیلات اپنے "صیدنامون" میں بیان کی ہیں۔ ان میں مچھلی اور پرندوں سے لے کر شیر ژیاں اور سیلِ دمان تک کے شکار کرنے کا تذکرہ موجود ہے۔ تاہم اس میں شک نہیں کہ ان نظموں میں شاعرانہ پہلو تفصیلات پر غالب رہا ہے۔ میر تقی میر نے اپنی نثری تصنیف "ذکرِ میر" میں نواب آصف الدولہ کی ہمراہی کا جو مختصر حال قلمبند کیا ہے وہ بھی نواب وزیر کی شکار سے دلچسپی، شکارگاہ کی نوعیت

اور مدتِ شکار کے اندازے کے لئے خاصی مفید ہے۔ میر تقی لکھتے ہیں:۔

"ایں جا فقیر با نواب عالی منزلت است۔ در دعا گوئیِ ایشاں بسر می کند۔ بندگانِ عالی برائے شکار تا بہرائچ رفتند۔ من در رکاب بودم۔ شکار نامہ موزوں نمودم۔ بارے دیگر باز برائے شکار سوار شدند تا دامنِ کوہِ شمالی تشریف بردند۔ اگرچہ مردماں از نشیب و فرازِ ایں سفرِ دور و دراز سخت خوردند لیکن شکارِ چنیں و فضائے چنیں و ہوائے چنیں ندیدہ بودند۔ بعد از سہ ماہ بدار القرار خود آمدند" [۱]

آصف الدولہ کے نشانے کی مشق و مہارت کے متعلق سید عبداللطیف شوستری کا بیان ہے کہ "دیدہ ام کہ مرغ را در پرواز تفنگ زدہ است۔ دستگاہے عالی درشت کہ کمتر رئیسے را میسر بود" [۲]

شاہی اندازِ شکار کے متعلق ولیم ٹامٹین کی بیان کردہ تفصیلات بھی خاصی دلچسپ ہیں جن سے شکار و شکارگاہ کا پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھینچ جاتا ہے۔ ان شکاروں میں شاہی ڈیرے خیمے، چھولداریاں، کھانے پینے کا مکمل سامان، مصاحبینِ بادشاہ، اربابِ نشاط، بیگماتِ شاہی اور اُن کی خواصین، مہریاں، پیش خدمتیں اور اُن سب کا ضروری سامان بھی ساتھ ہوتا تھا۔ ٹامٹین لکھتا ہے:۔

"سامانِ شکار میں پالو بارہ سنگے بھی تھے کہ جو شکار کر چھاپ بیٹھتے تھے۔ باز بھی تھے کیونکہ ابھی باز کے ذریعہ سے شکار کھیلنا پھر بھی منظور تھا اور چیتے بھی تھے جو خاص کر ہرن کے شکار کے واسطے تیار کئے گئے تھے۔ یہ سب کٹہروں میں بند گاڑیوں میں لدے چلے جاتے تھے اور انہیں کے ہمراہ اُن کے محافظ بھی تھے۔ شاہی حرم سرا بھی زمرۂ مسافران میں تھیں، جن میں خاص بیگماتِ شاہی اور بہت سی منظور کردگانِ شاہی، رنڈیاں، ڈومنیاں، خواصین، پیش خدمتیں، اور پہرہ دارنیاں۔ یہ سب بند سواریوں میں سوار ایک تیح کی فوج تھی۔ باڈی گارڈ کا رسالہ بھی مُغرق نیلگوں وردی سے سجا ہوا ساتھ تھا۔ ہاتھی بھی تھے جن میں سے بعض خیمے

وغیرہ سامانِ بار برداری لے جاتے تھے۔ اونٹ اور سانڈنیاں بھی تھیں جن میں سے بعض ہرکاروں کی سواری میں تھیں اور بعض بار برداری میں تھیں۔ گھوڑے بھی ریل پیل تھے۔ اور ان سب میں ہمارے جلوس کا اضافہ کرنا چاہیے جس میں ہاتھی، گھوڑے اور پالکیاں تھیں۔" [۱]

اب ہم معمولی شکار کی تفصیلات کو چھوڑ کر خاص خاص شکاروں کا ذکر کرتے ہیں آپ پرندوں کے شکار کا ایک غیر معمولی انداز ملاحظہ فرمائیے جس کی بابت نا ٹیئن لکھتا ہے کہ:

• بعد اس کے سدھائے ہوئے شکاری بازوں سے شکار کھیلنے کی نوبت آئی۔ معمولی باز کے شکار سے جو بعد کو کھیلا گیا یہ شکار بالکل مختلف اور خارج از عقل و قیاس تھا۔ ان سکھائے سدھائے ہوئے جانوروں سے ایسے ایسے کام لئے گئے تھے جو اُن کی سمجھ سے بہت بعید معلوم ہوتے تھے۔ ان بازوں کو شکار ایک خاص طور پر سکھایا گیا تھا یعنی پہلے تو ہزارہا جانوروں کو دانہ وغیرہ ڈال کے لوگ جھیل کے کنارے پر مجتمع کرتے تھے۔ اس وقت چار پانچ باز چھوڑے جاتے تھے۔ بندوقیں لے کر ہم میں سے کچھ لوگ تو جھیل پر آکے کھلے میدانوں میں کھڑے ہو جاتے تھے اور کچھ لوگ کشتیوں پر بیٹھے اور مخفی گوشوں میں کشتیاں دوڑاتے۔ اسی اثنا میں ہزارہا جانور پانی سے اُڑ کر ہوا میں بلند ہو جاتے اور باز نیچے اوپر سے ان جانوروں کو گھیر گھار کر ایک مقام پر قائم کر لیتے تھے۔ نہ اُوپر ہوا میں بلند ہونے دیتے نہ نیچے زمین پر اُترنے دیتے۔ اسی حالت میں بیچ ہوا میں ہزارہا جانوروں کو ہم لوگ اپنی بندوقوں کا نشانہ بنالیتے تھے۔ واقعی یہ سارا سامان عجیب دلچسپ ہوتا تھا۔" [۲]

اسی صورت سے پالو بارہ سنگوں کے ذریعہ بھی شکار کھیلا جاتا تھا جو اپنے سینگوں میں ہرنوں کو اُلجھا لیتے تھے اور پھر یا تو وہ بندوق کا نشانہ بن جاتے تھے یا رسیاں ڈال کر گرفتار کر لئے جاتے تھے۔ بہرحال اودھ میں شکار کی کثرت بھی تھی اور اس کے کھیلنے کا عام رواج بھی تھا۔

جانوروں کا پالنا اور لڑانا سیر و شکار کے علاوہ جانوروں کا پالنا اور لڑانا بھی شاہی دلچسپی کا ایک خاص شعبہ رہا ہے، جس کی ابتدا اودھ میں شجاع الدولہ سے ہوئی تھی۔ اُنہوں نے ۱۷۶۹ء میں فیض آباد کے مقام پر اپنا توش خانہ تیار کرایا تھا۔ اُن کے بعد آصف الدولہ نے بھی اس طرف خاص توجہ رکھی تھی اور پچھلے ذخیرے میں بہت سے جانوروں کا اپنے زمانے میں اضافہ کرایا تھا۔ ابوطالب کے بیان سے تو ہمیں یہاں تک پتا چلتا ہے کہ آصف الدولہ کے یہاں بارہ سو ہاتھی، دو تین ہزار گھوڑے، ایک ہزار کتے، تین لاکھ کبوتر اور لڑنے والے مرغ اور بہت سی اقسام کے سانپ جن میں سے بعض بعض جوڑا تو ایک ایک من گوشت روزانہ کھاتا تھا، اُنہوں نے پالے ہوئے تھے۔[۱] سعادت علی خاں نے اپنے عہد میں اگرچہ عام جانوروں مثلاً کبوتر اور مرغ وغیرہ کی تعداد میں بہت کمی کر دی تھی لیکن پھر بھی نادر الوجود جانوروں کی تعداد میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی اور جب غازی الدین حیدر کا دورِ حکومت آیا تو شاہی توش خانہ پھر اچھے جانوروں سے بھر گیا تھا۔ بشپ ہیبر لکھتا ہے کہ:

> "یہاں (لکھنؤ میں) ایک توش خانہ بھی ہے جس میں کثیر تعداد عجیب اور نادر جانوروں کی موجود ہے۔ (لیکن یہاں کا انتظام بیرک پور کے چڑیا گھر کے مقابلے میں اچھا نہیں ہے) اس توش خانے کے علاوہ دریائے گومتی کے اُس پار ایک محفوظ سبزہ زار میں بھی مختلف اقسام کی گائے، اونٹ، ہرن اور پانچ چھ ایسے زبردست گینڈے موجود ہیں کہ اُن سے بہتر میں نے اب تک کہیں نہیں دیکھے تھے۔ دریا کے اُسی جانب کبوتروں کا بھی ایک احاطہ ہے۔"[۲]

نائیٹن کے دورانِ قیام میں مذکورہ بالا توش خانے کے اندر متعدد قسم کے جانوروں کے علاوہ پندرہ بیس گینڈے اور تقریباً ڈیڑھ سو لڑائی کے ہاتھی بھی موجود تھے۔ جانوروں کے پالنے کا یہ انتظام واجد علی شاہ کے وقت تک برقرار رہا اور آج بھی اودھ کے بادشاہوں کی یہ یادگار یعنی زندہ عجائب گھر لکھنؤ میں خاصے اہتمام کے ساتھ قائم ہے۔ خود واجد علی شاہ نے بھی

تاج و تخت سے محروم ہو جانے کے باوجود اپنے اس شوق کو زندہ رکھا۔ چنانچہ مٹیا برج میں بھی انہوں نے اپنا ایک عمدہ "چڑیا گھر" تیار کرا لیا تھا جس کی تفصیلات مولانا شررؔ نے بھی اپنے مضامین میں قلمبند کی ہیں۔

جانوروں کے لڑانے کا شوق جو برِ صغیر میں مغلیہ عہد کی یادگار تھا اُس کا سلسلہ بھی قیامِ سلطنتِ اَوَدھ تک برقرار رہا۔ چنانچہ یہاں چھوٹے اور بڑے، خونخوار اور بے آزار ہر قسم کے جانور لڑائے جاتے تھے۔ چھوٹے پرندوں کی لڑائیاں تو اکثر کھانے کے بعد شاہی دسترخوان پر بھی نظر آجایا کرتی تھیں لیکن موذی جانور صرف چاند گنج اور مبارک منزل ہی میں لڑائے جاتے تھے۔ چاند گنج شہر سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر دریائے گومتی کے اُس پار واقع تھا۔ اس مقام پر ایک مختصر سی عمارت بنی ہوئی تھی جس کے گرد ایک میدان چھوڑ کر احاطہ بنا دیا گیا تھا۔ اس میدان کے علاوہ ایک اور احاطہ بھی کبھی کبھی حسبِ ضرورت استعمال کر لیا جاتا تھا۔ وہ تقریباً بیس گز مربع ہوگا۔ اس احاطے کے چاروں طرف دو منزلہ مکانات بنے ہوئے تھے جن کی نچلی منزل میں غلام گردش تھی اور بالاخانے میں برآمدے موجود تھے۔ مبارک منزل دریا کے کنارے واقع تھی جس کے نزدیک بڑے بڑے میدانوں کو محیط کیا گیا تھا۔ ان میدانوں کے ایک طرف دو منزلہ برآمدہ تھا جس میں بادشاہ سلامت اور اُن کے متوسلین تماشہ دیکھتے تھے۔ کبھی کبھی چٹان کی شکل کے برآمدے بنا کر اور اُن کے اُوپر بیٹھ کر بھی گھنے ہوئے سبزہ زاروں میں لڑائی کا منظر دیکھا جاتا تھا۔ ان لڑائیوں کا تذکرہ نائیٹین نے بڑی تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"دربارِ اَوَدھ کے معمولی کھیل تماشوں میں سکھائے ہوئے پرندوں اور درندوں کی لڑائی کا چرچا بہت تھا اور اسی غرض سے ہر قسم کے جانور پالے اور سکھائے سدھائے جاتے تھے۔ ان میں سب سے زیادہ تیتر کی لڑائی حیرت انگیز ہوتی تھی۔ جہاں اس جانور کو بڑھاوے دیئے گئے اور وہ جُٹ گیا۔ اور پنجوں اور چونچ سے حملہ کرنے اور روکنے لگا۔ پھر اس قدر پامردی اور جرات کے ساتھ لڑتا تھا کہ دیکھنے والے حیران و ششدر

رہ جاتے تھے۔ یہ لڑائیاں عموماً یوں ہوا کرتی تھیں کہ کھانے کے بعد میز بالکل صاف کر دی جاتی تھی اور جانور نشہ پانی سے تیار ہو کر حضوری میں باریاب ہوتے تھے۔ بادشاہ سلامت حسب دستور میز کے ایک جانب وسط میں اپنی زرنگار کرسی پر جلوہ افروز ہوتے تھے اور حکم دیتے تھے کہ ہاں لڑائی شروع کرو۔ حکم ہوتے ہی دو مرغ لاکر سامنے میز پر کھڑے کر دیئے جاتے تھے۔ لڑائی شروع ہوتی تھی اور یہ پہلوان جی توڑ کے اور جان پر کھیل کے لڑتے تھے۔ میز کے گرد جتنے لوگ کھڑے ہوتے تھے اُن سب کی نظریں اُنہیں پر جمی ہوئی ہوتی تھیں۔ یہ لوگ موقع موقع سے دونوں کو داد دیتے تھے۔ کبھی اس کی تعریف کرکے جی بڑھاتے تھے کبھی اُس کو بڑھاوا دے کر اور گرما دیتے تھے۔ اور تو اور خود بادشاہ سلامت بھی بے حد جوش میں ہوتے تھے۔ بالآخر لڑائی ختم ہوتی اور کچھ نُقل کا سامان کیا جاتا تھا۔ اس کے بعد پھر مرغ، تیتر یا بٹیر کا جوڑا چھوڑا جاتا تھا۔

بارہ سینگوں کی لڑائی اکثر فرح بخش کے احاطے میں ہوتی تھی اور بادشاہ اور اُن کے متوسلین برآمدے میں بیٹھ کر اس لڑائی کا تماشہ دیکھتے تھے۔ یہ بڑے سینگوں والے جانور جس چُستی و چالاکی سے ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتے تھے وہ قابلِ دید ہوتی تھی۔ وہ پُوقدی چال، وہ شاخدار سینگوں کا ہوا میں بل کھانا، وہ اُن کا دبے پاؤں گھات سے چلنا اور ایک عجیب ادا کے ساتھ پینترے بدلنا اور یہ چاہنا کہ ہم موقع سے ہو رہیں کچھ عجیب و دلکش سماں ہوتا تھا جس کا لطف بس دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ واقعی یہ نظارہ بہت خوش آئند ہوتا تھا۔

گینڈوں کی لڑائی یوں ہوتی تھی کہ ہاتھیوں کی طرح مخصوص موسم میں دو گینڈوں کو مقوی اور مُشتی چیزیں کھلا پلا کر تیار کرتے تھے اور یا تو احاطے کے اندر ایک ایک سمت مقابل سے چھوڑ دیتے تھے یا سبزہ زار میں آمنے سامنے کرکے ہنکا دیتے تھے اور نہایت ہوشیار

چابک سوار ہاتھوں میں نیزے لئے دونوں کو گزید کر دونوں طرف سے ایک دوسرے کے مقابل لا کھڑا کر دیتے تھے۔ جس وقت دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے تھے اُسی وقت اُن میں حملہ کرنے کی آمادگی پیدا ہو جاتی تھی۔ گینڈے اور تیندوے کی لڑائی بڑی جاندار اور گرماگرم ہوا کرتی تھی۔ بڑے جانور کا اپنے مضبوط اور مستقل سامانِ حفاظت سے اپنا بچاؤ کرنا، چھوٹے جانور کا دبے پاؤں اور بلی کی چال چل کے پھر جھپٹنا اور حملہ کرنا۔ ایک کی مُجگی ہوئی پیشانی اور تیز سینگ، دوسرے کے نکیلے دانت۔ ایک کے پاس بل کھائے ہوئے سینگ کا حفاظت کی غرض سے ہونا، دوسرے کے پاس گول گول سر، چمکتی ہوئی آنکھیں، اور آنکھوں میں خار اشگاف تارِ نظر اور پھر مزید براں خاردار پنجہ، یہ چیزیں ایسی تھیں جن پر سب کی نگاہیں جمی رہتیں اور بڑی دلچسپی سے جمی رہتیں۔

جب چیتے لڑائے جاتے تھے اور کئی روز کی بھوک اور پیاس کے تاؤ میں وہ احاطے میں داخل ہوتے تھے تو اُس وقت ایسا سنّاٹا اور سکوت ہر طرف طاری ہوتا تھا کہ اگر زمین پر سُوئی بھی گرے تو آواز سُنائی دے۔ کیونکہ انتظار اور اشتیاق خود مجسّم ہو کے اُس مقام پر آ جاتا اور نتیجہ کے دیکھنے اور سُننے کے واسطے ہر شخص چشم براہ اور گوش برآواز ہوتا تھا۔ جب کمانڈر انچیف افواجِ انگلشیہ (لارڈ کیمبرمیئر) لکھنؤ میں بادشاہ سے ملنے آئے تو اُنہیں دو چیتوں موسوم بہ "گُلرا" اور "ترائی والا" کی لڑائی دکھائی گئی۔ جس رمنے میں یہ لڑائی ہونے والی تھی وہاں پھول پتیوں اور رنگا رنگ آرائشوں سے بڑی سجاوٹ کی گئی تھی۔ باشندگانِ ہند کا مذاق آرائش و زیبائش میں تو ضرب المثل ہوتا ہی ہے۔ بس سمجھ لیجئے کہ اس سجاوٹ میں خوب خوب جوہر دکھائے گئے تھے۔ نشستگاہ کو مغرق و زرتار پردوں اور خوش رنگ جھنڈیوں، بیرقوں سے خوب سجایا گیا تھا۔ چترِ سُلطانی جو سنہری اور قرمزی رنگ کے بادلے سے منڈھا ہوا تھا تختِ شاہی پر سایہ فگن تھا اور اس کے دونوں پہلوؤں پر میں نہایت گراں بہا اور ممتاز قسم کی کرسیاں کمانڈر انچیف اور رزیڈینٹ کے واسطے

بچھائی گئی تھیں۔ بادشاہ سلامت اپنا تاج شاہی زیب سر کئے ہوئے تھے جو بالکل نیا بنا ہوا تھا۔ اس میں بکثرت جواہرات جڑے ہوئے تھے اور ہُما کے پَر کا سفید طُرّہ لگا ہوا تھا۔ اُن کے چہرے کی گندمی رنگت جس میں غضب کی صباحت اور ملاحت تھی، جواہرات کی تابش اور ہُما کے نازک پَر کی جنبش سے اور بھی خوشنما معلوم ہوتی تھی۔ اس موقع پر وہ مشرقی لباس جو نہایت زرق برق چینی کمخواب کا تھا پہنے ہوئے تھے۔ اس کپڑے میں اگرچہ ریشم بھی تھا مگر بالکل سیم وزر سے بنا ہوا معلوم ہوتا تھا اور اس کی آب وتاب اس غضب کی تھی کہ ہر جنبش پر جواہرات کے نہایت اچھے تراشے ہوئے نگینوں کا دھوکا ہوتا تھا۔ کمانڈرانچیف اپنی جرنیلی وردی میں اور رزیڈینٹ بالکل سادے لباس میں تھے۔ یہ سارا سماں ایسا تھا جو کبھی فراموش نہیں ہو سکتا۔

"گنگرا" اور "ترائی والے" کے کٹہرے صحن میں آمنے سامنے ایسے موقع سے رکھے گئے کہ ہم لوگ جو برآمدے میں تھے بخوبی دیکھ سکیں۔ چنانچہ جب یہ دونوں جانور نہایت جوش اور تیزی اور تُندی سے اپنے کٹہروں میں دیواروں سے ملے ہوئے گھومتے تھے تو ہم ان کی چمکیلی پیٹھوں کو دیکھتے تھے۔ اس درمیان میں جب کوئی شخص کٹہروں کے پاس سے ہو کے نکلتا تو جانور بڑے زور سے ہونکتے اور دانتوں کو پیس کے غُرّاتے تھے۔ دیر تک دونوں کٹہرے یُوں ہی رکھے رہے محض اس خیال سے کہ دونوں ایک دوسرے سے صورت آشنا ہو جائیں... اشارہ ہوا۔ چیتوں کے کٹہرے کھولے اور بانس کے ٹھاٹھر اُٹھا دیئے گئے۔ "ترائی والا" ایک ہی زقند بھر کر اپنے کٹہرے سے باہر نکل آیا اور اپنا جبڑا پھیلا کر اِدھر اُدھر اپنی دُم ہلانے لگا۔ اسی شان سے "گنگرا" بھی نکل کے میدان میں آکھڑا ہوا لیکن اُس کے انداز میں سلامت روی زیادہ تھی۔ ابھی دونوں پچاس فٹ کے فاصلے سے تھے۔ دونوں کے منہ کھلے ہوئے تھے، دُمیں ہلتی ہوئی تھیں اور دونوں ایک دُوسرے کو بغور دیکھ رہے تھے۔ بالآخر "گنگرا" چند قدم آگے بڑھا۔ اور اُس کا حریف اپنے پاؤں توڑ کے صحن میں جہاں کا تہاں کھڑا اور دشمن کی

طرف ٹکٹکی لگائے تنا رہ گیا۔ گویا ہر گھڑی جست مارنے اور زقند بھرنے کو تیار تھا۔ ٭گگراہ٭ بھی اس کو بغور دیکھتا ہوا آہستہ آہستہ ہوشیاری کے ساتھ قدم بڑھاتا اور سامنا چھوڑ کے ذرا ادھر کترا کے چلا اور قریب پہنچ گیا۔ اب ٭ترائی والا٭ بھی دوسری طرف سے کترا تا کنیاتا چلا۔ دونوں قریب پہنچ گئے۔ اُس وقت برآمدے میں جتنے تماشائی تھے سب دم بخود تھے اور ہر شخص کی نگاہ انہیں دونوں پر لگی تھی۔ جانوروں کے غیر معمولی طور پر طویل القامت ہونے کی وجہ سے ہر تماشائی پورے طور پر سیر دیکھ سکتا تھا کیونکہ یہ دونوں پہلوان بڑے عظیم الجثہ، قوی ہیکل اور خوبصورت تھے۔ ٭ترائی والے٭ کا رنگ ٭گگراہ٭ کی بہ نسبت کسی قدر کھلا ہوا تھا یعنی سیاہ دھاریوں میں زردی ذرا ہلکی تھی۔ اور دونوں جانور نہایت خوبصورت، دلیر اور بے پناہ تھے آخرکار آہستہ آہستہ بڑھتے بڑھتے ٭گگراہ٭ نے ایک جست کی کیونکہ پچھلی فتح مندیوں کی وجہ سے غالباً اُسے اپنی قوت پر زیادہ اعتماد تھا...٭ ترائی والا٭ بھی اس موقع پر غافل نہ تھا۔ جس عجلت کے ساتھ اُس کا حریف ہَوا میں بلند ہوا تھا بعینہٖ اُسی چالاکی کے ساتھ وہ بھی ٹانگ کر الگ کھڑا ہو گیا۔ دونوں کے حرکات ایسی پھرتی سے ہوئے کہ آنِ واحد میں اُدھر اُس نے جست کی اِدھر اِس نے ٭گگراہ٭ ہیچ و تاب کھا کر زمین پر آیا اور قبل اس کے کہ وہ دُم راست کرے یا اُس کو اپنے زمین پر آرہنے کا احساس ہو، دفعتہ ٭ترائی والا٭ اس پر آپڑا اور اُس کے پنجے اس کی گردن پر زور سے آپڑے اور مُنہ اُس کے گلے کے قریب پہنچ گیا۔ یہ بھی دم کے دم میں ہو گیا۔ ابھی ہم لوگ اچھی طرح یہ دیکھ بھی نہ چکے تھے کہ پھر ٭گگراہ٭ کی گھات چل گئی اور اس نے بڑے زور سے اور اپنی پوری قوت صرف کر کے ایک جست کی اور اُس کے پنجوں اور جبڑے سے اپنی گردن اور گلے کو چھڑا کے صاف الگ جا کھڑا ہوا۔ بلکہ اس زور میں گیا کہ اپنے ساتھ تھوڑی دُور تک ترائی والے کو بھی گھسیٹ لے گیا۔ لیکن اس کی گردن اور شانے پر خوں کے نشان ہو رہے تھے۔ اب حریف کی گرفت سے اپنے کو گلو خلاص کر کے اُس نے فوراً ایک سخت حملہ ٭ترائی والے٭ پر کیا۔ بالآخر اسی رد و بدل کے بعد لڑائی ختم ہو گئی اور دونوں شیر اپنے

اپنے کٹہروں میں بند کر دیے گئے۔" [۱]

بعض دُوسری دلچسپیاں

تفریحات کی ان تفصیلات میں ہم نے اب تک شاہی ذوق کا خاص خیال رکھا ہے۔ اب کچھ عوام کے متعلق بھی سُنیے۔ شاہی ذوق کے اثرات نے پہلے اُمرائے دربار اور پھر عام لوگوں کے مزاج میں بھی حسن، موسیقی اور رقص سے دلچسپی، سیر و شکار، جانوروں کی پرورش اور اُن کے لڑانے کا شوق پیدا کرا دیا تھا جس کی وجہ سے بادشاہ سے رعایا تک سب کا ایک ہی حال تھا۔ اگر بادشاہوں کی دسترس حسن و جمال کی پریوں اور رقص و سرود کی زُہرہ جبینوں تک تھی تو عوام بھی چوک نشینوں اور طوائفوں سے دل بہلا لیتے تھے۔ شاہی توشہ خانوں اور چڑیا گھروں میں اگر دُنیا کے نادر الوجود جانور موجود ہوتے تھے تو ان کے یہاں بھی ناز و نعم سے پلی ہوئی بٹیریں، اہتمام سے بنائی ہوئی کبوتروں کی نسلیں اور گرم پُر خاش مُرغ پالے جاتے تھے۔ جس طرح خاص خاص تقریبوں میں شاہی دربار کی طرف سے چراغاں، جلوس اور دعوتوں کا اہتمام ہوتا تھا اُسی طرح رعایا بھی اپنے بچوں کی شادیوں، تہواروں اور بعض دوسری تقریبوں میں دعوتیں دیتی، جلوس نکالتی، روشنی کرتی اور رقص و سرود کی محفلیں آراستہ کرتی تھی۔ دیہاتوں میں عام ہندوستانی کھیل تماشے آئے دن ہوتے رہتے تھے لیکن خاص تقریبوں میں وہ بھی رقص و سرود کی محفلوں، مجروں اور دعوتوں کے اہتمام میں کوئی کمی نہ کرتے تھے۔ مذہبی تہواروں، زیارت گاہوں اور عرسوں کے موقعوں پر ہزار طرح کے جشن منعقد ہوتے تھے۔ مثلاً لکھنؤ میں شاہ مینا کے مزار پر ہر نوچندی کو رقص و سرود کی محفلیں جمتی تھیں، کالی کے مندر میں ہر ہفتہ ایک میلہ ہوتا تھا جہاں شہر بھر کا اچھا خاصا اجتماع ہو جاتا تھا۔ آخری تاجدار اودھ نے بھی ۱۳ ذیقعد ۱۲۶۹ھ/۱۸۵۳ء کو ایک میلہ سلطانی ترتیب دیا تھا جو اُن کے جشن سالگرہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس میلے کے انعقاد کی وجہ بعض ہمعصر مؤرخین نے یہ قرار دی ہے کہ واجد علی شاہ کی چھٹی کے موقع پر اُن کی والدہ نے اُنھیں جوگیا لباس پہنایا تھا جس کی سالگرہ ہمیشہ اسی لباس میں ہوا کرتی تھی۔ بادشاہ نے اپنے زمانۂ حکومت میں اس تقریب کو وسعت دے کر ایک میلے کی صورت دے دی تھی لیکن صاحب افضل التواریخ

کا بیان ہے کہ اختر شناسوں نے بادشاہ سے عرض کیا تھا کہ زائچۂ ہمایوں میں جوگ کا جوگ ہے اس لئے رفع نحوست کے لئے آپ کو حالتِ فقیری اختیار کرنی چاہیئے۔ بادشاہ نے اُن کی رائے کے مطابق محفلِ جوگ مرتب کی، جوگیا لباس پہنا، اور قیصر باغ کو نمونۂ بہشت بنا دیا۔ اِس جشن کا تماشہ دیکھنے کی عام لوگوں کو بھی اجازت دے دی گئی تھی بشرطیکہ وہ لوگ بھی جوگیا لباس پہن کر قصرِ شاہی کے جشن میں شامل ہوں۔ ۱۲۷۱ھ ۵۵-۱۸۵۴ء کے ایک میلۂ سُلطانی کی چشم دید کیفیت کمال الدین حیدر نے اس طرح بیان کی ہے:۔

"روز پنجشنبہ ذیقعدہ ۱۲۷۱ھ مطابق جولائی ۱۸۵۵ء میلۂ سُلطانی موافقِ دستورِ انتظامِ سالِ گذشتہ درپیوستہ ہوا۔ ہزار ہا اہلِ شہر، بے تکرے، ملازم، بہ لباسِ رنگین، فقرا دبنے ہوئے داخلِ قیصر باغ ہوئے اور جتنا سامانِ جشن وعیش اور جلوس لوازمِ تکلفات تھا، حسب الحکم شاہی ہُوا۔ فی الحقیقت ایسی کیفیت خاص قابلِ دید ہے نہ شُنید۔ ۱۳ تاریخ میلے کا خاتمہ ہوا۔ پہلے دن صحبتِ حَالِ وقَالِ مشائخ بھی رُو بروئے بادشاہ ہوئی اور ہر سالک سالکِ طریقت اپنے جذبِ شوق سے اس مجمعِ عام میں ایک حال سے دوسرے حال میں ہوگیا۔" [۱]

غرض کہ میلۂ سُلطانی نہ صرف اُمرائے دربار بلکہ عام مخلوق کی بھی دلبستگی کا سامان مہیا کرتا تھا۔ مُدتوں پہلے سے عوام میں اس کے آنے کی تیاریاں شروع ہو جاتی تھیں اور ختم ہو جانے کے بعد کئی روز تک اس کی یاد میں دِل اُداس رہتا تھا۔ انتزاعِ سلطنت کے بعد جب یہ میلہ بالکل ختم ہوگیا تب بھی اس کی یاد بعض دِلوں کو گرماتی رہی چنانچہ امیر مینائی فرماتے ہیں ؎

امیر افسردہ ہو کر غنچۂ دل سُوکھ جاتا ہے　　وہ میلے ہم کو قیصر باغ کے جب یاد آتے ہیں

مختصر یہ کہ لکھنؤ میں یہ اُڈا ایسے ہی متعدد جشن اور میلے عوام کی دلچسپی کا سامان مہیا کرتے تھے۔ بعض زیارت گاہوں میں بھی اچھا خاصا مجمع ہو جاتا تھا، بالخصوص درگاہِ حضرت عباسؑ، پر روزانہ کی بھیڑ بھاڑ کے علاوہ جمعرات کے دِن خاص طور پر بہت اچھا اجتماع ہوتا تھا۔ محرم کی روشنی، ہولی،

دسہرہ اور بسنت کے جشن وغیرہ پر حکومت کی طرف سے لاکھوں روپے خرچ کئے جاتے تھے جس کی وجہ سے لکھنؤ ایسی دلچسپیوں کا ایک خاص مرکز بن گیا تھا چنانچہ سلیمن لکھتا ہے کہ "اس معمورہ یعنی لکھنؤ میں جلوس، تہواروں اور چراغاں کا ایک مستقل ہنگامہ رہتا ہے اور حکومت جو کچھ آمدنی ہوتی ہے۔ سب اِن پر صرف کر دیتی ہے۔"[۱]

اِن جشن و جلوس کے علاوہ ادبی اجتماع اور مشاعرے بھی شہری زندگی کا ایک خاص جزو تھے۔ ہر امیر غریب حسب لیاقت ادبی ذوق رکھتا تھا اور ہر با ذوق صاحبِ ثروت ہفتہ وار، پندرہ روزہ یا ماہانہ کسی مخصوص ادبی نشست کا اہتمام کرتا تھا جس میں شہر بھر کے شعرا اور سخن فہم جمع ہوتے تھے۔ اودھ میں ادبی ذوق کی نشر و اشاعت میں ان صحبتوں کا بھی خاص حصّہ ہے۔ فیض آباد اور لکھنؤ میں یوں تو ہر سال ہزاروں مشاعرے اور ادبی اجتماع ہوتے تھے، لیکن دربار کے علاوہ مخصوص صحبتیں نواب سالار جنگ، میرزا نوازش علی، میرزا محمد تقی خاں ہوسؔ، مرزا زین العابدین خاں، شہزادہ جہاندار شاہ، شہزادہ سلیمان شکوہ، نواب محبت خان، نواب مہدی علی خاں اور قمر الدین احمد خاں وغیرہ کے یہاں ہوتی تھیں۔

لکھنؤ کی عام دلچسپی کی ایک مخصوص چیز افیون نوشی اور داستان گوئی کی محفلیں بھی تھیں۔ جن کا سماں سرشار نے اس طرح کھینچا ہے:۔

"لکھنؤ سے بڑھ کر داستان گوئی کا چرچا اور کہیں کم ہوگا۔ بیس پچیس یارانِ صادق اور دوستانِ موافق شب کے وقت کہ پردہ دارِ عاشقاں ہے، ایک مقام پر جمع ہوئے۔ کوئی گنا چھیل رہا ہے، کوئی پونڈے پر چاقو تیز کر رہا ہے، جابجا پیالیوں میں افیون گھُل رہی ہے حقیقت تو یوں ہے کہ افیون کا گھولنا اور گنّے کا چھیلنا بھی لکھنؤ والوں ہی کا حصّہ ہے۔ کہیں چائے تیار ہو رہی، اور داستان گو صاحب بہ لحنِ داؤدی فرما رہے ہیں۔ "لیکن خونخوار ظلماتی کی دُخترِ بلند اختر ملکہ طاؤس، پری چہرہ، نہایت حسین، سحر میں زبردست، شرابِ حسن سے مست، اپنے قصر میں جلوہ فرما تھی کہ اس کو خبر گزری کہ قیدِ طلسم کُشا کی پردۂ ظلمات میں آتی ہے۔

ایک ایک فقرے پر سبحان اللہ اور واہ واہ کی تعریف ہوتی جاتی ہے اور داستان گو صاحب کا دماغ عرشِ بریں سے گزر کر لامکاں کی خبر لاتا ہے۔"

داستان گوئی ایک فی البدیہ فسانے کا نام ہے جس کا رواج تو صدیوں پہلے سے چلا آرہا تھا لیکن اُسے لکھنؤ کے اُمراء اور خوش حال لوگوں کی صحبتوں نے خاص طور پر مقبول بنا دیا تھا۔ داستان سُننے کا یہ شوق رفتہ رفتہ یہاں تک بڑھ گیا تھا کہ لکھنؤ کے کسی با مذاق امیر کی محفل داستان گو سے خالی نہ ہوتی تھی۔ یہ لوگ رزم و بزم، حُسن و عشق اور عیاری و مکاری وغیرہ کے فی البدیہ قصّے برجستہ تصنیف کرتے جاتے تھے اور اُنہیں زبانی سُنانے میں ایسا زبردست مَلکہ رکھتے تھے کہ جس کی بدولت لکھنؤ کی داستان گوئی نے ہندوستان میں بڑی شہرت پائی تھی۔ یہاں کے داستان گویوں میں میر انور، قاسم علی، انبا پرشاد رسا، امیر نواب، داروغہ غلام عباس، احمد حسین جاہ اور قمر خصوصیت کے ساتھ مشہور و معروف ہوئے۔

اسلحہ کا شوق

راجپوتوں کی آبادی کی کثرت کے باعث اودھ میں حربیت کا مذاق بہت پہلے سے چلا آرہا تھا۔ اُس میں شجاع الدولہ کی حربی بیداری نے ایک نئی روح پھونک دی تھی۔ یہ حربی مذاق ایک طویل مُدت تک قائم رہا جس کی وجہ سے اودھ کے علاقوں نے بہت اچھے سپاہی پیدا کئے۔ اسی حربی صلاحیت کی بنا پر اودھ کے تعلقہ دار اور زمیندار ہمیشہ ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتے تھے۔ جب مُلک کا یہ جذبہ دارالسلطنت کی پُر تکلف شہری زندگی میں داخل ہوا تو بانکپن اور تکلف کے امتزاج سے ایک ظاہری آرائش اور نمائش کی چیز بن گیا۔ اب تلوار سپاہی کی جان ہونے کے بجائے صرف اشراف کا بناؤ اور رئیسوں کی شان ہو کر رہ گئی۔ بہر حال اس ذوقِ نمائش کی وجہ سے خاصی نمایاں تعداد میں شہری آبادی غرقِ سلاح نظر آتی تھی، اور اسلحہ کا شوق لکھنؤ کی زندگی کا ایک نمایاں جزو معلوم ہوتا تھا۔ یہاں کے عوام کو ہتھیار بند اور بانکی وضع قطع میں دیکھ کر غیر ملکی سیاحوں کو بڑی حیرت ہوتی تھی۔ بشپ ہیبر لکھتا ہے کہ:-

"میں یہ دیکھ کر سخت متعجب ہوا کہ تقریباً تمام آبادی ہتھیاروں سے لدی ہوئی تھی۔ ہتھیار بند لوگوں کی اس ہیئت کو دیکھ کر اگرچہ اُن کے شہری پولیس سے متعلق ہونے کا دھوکا ہوتا تھا لیکن یہ منظر شہر کی رونق میں اضافہ کر رہا۔ علماء ایسے فضلائے شہر جو اپنی صورتوں سے مُلا معلوم ہوتے تھے اور اپنی پالکیوں کے اندر تسبیں پڑھتے جا رہے تھے۔ اُن کے ہمراہ بھی دو تین خدمتگار ڈھال اور تلوار لگائے ہوئے چل رہے تھے۔ زیادہ مخصوص لوگ جو اپنے ہاتھیوں پر سوار تھے۔ اُن کے ساتھ بھی ایک سواری ڈھالوں، نیزوں اور بندوقوں کی موجود تھی جو اُس سواری سے کچھ ہی کم درجہ کی ہوگی۔ جیسی کہ ہمارے ہمراہ تھی۔ حد یہ تھی کہ نچلے طبقے کے وہ لوگ بھی جو سڑک پر ٹہل رہے تھے یا دکانوں کے دروازوں پر کھڑے تھے ایک ہاتھ میں ننگی شمشیر لئے اور کندے پر ڈھال رکھے ہوئے تھے۔" [۱]

لکھنؤ کے اِس مخصوص پہلو کی تصویر ناٹین نے ذرا اور وضاحت کے ساتھ پیش کی ہے :۔

"ڈریسڈن، ماسکو، قاہرہ جس سے چاہیے آپ لکھنؤ کو مشابہ قرار دیجئے مگر میرے نزدیک لکھنؤ کی ایسی عجائب روزگار چیزیں اُن مقامات میں سے کہیں نظر نہ آئیں گی۔ اولاً لکھنؤ کے ایسے ہتھیار بند آدمی اُن شہروں میں کہیں نہ دکھائی دیں گے۔ ماسکو کے باشندے صرف چھُری باندھتے ہیں اور قاہرہ کے لوگوں کے ہاتھ میں کچھ ہتھیار کبھی کبھی دکھائی دیتے ہیں۔ بر خلاف اس کے لکھنؤ کے باشندے بالعموم اور بچے بنے نظر آئیں گے۔ ان کے پاس ڈھال، تلوار، اور بندوق یا پستول ضرور ہوگی۔ حتیٰ کہ وہ لوگ جو کاروبار روزمرہ کرتے ہیں وہ بھی تلوار تو ضرور باندھتے ہیں اور کچھ گرد حضرات جب سیر گشت کو نکلتے ہیں تو چاہے کیسی ہی ذلیل پوشاک کیوں نہ پہنے ہوں مگر تپنچے کی جوڑی اور ڈھال دونوں لگائے ہوں گے۔ بھینسے کی کھال کی منڈھی ہوئی ڈھال جس میں پیتل کے پھول لگے ہوتے ہیں اکثر بائیں جانب کاندھے پر پڑی ہوتی ہے۔ بڑی بڑی مونچھوں والے مہیب صورت راجپوت اور پٹھان اور سیاہ داڑھی والے مسلمان ڈھال تلوار سے لیس تنتے نظر آتے ہیں اور اہلِ لکھنؤ کی پندارِ خودی و خود پسندی

اور جوشِ نبرد آزمائی کو بخوبی عیاں کرتے ہیں۔ یہ امر کہ کیوں اہلِ لکھنؤ بالعموم سپاہیانہ وضع رکھتے ہیں، تعجب خیز نہیں ہو سکتا اس لئے کہ کمپنی کے فوجی محکمے میں اودھ ہی کے پرورش یافتہ بکثرت ہوتے ہیں اور احاطۂ بنگالہ کی فوج تمام تر یہیں کے باشندوں سے مملو ہے۔ باشندگانِ لکھنؤ میں اسلحہ کا شوق بچپنے ہی سے پیدا کرایا جاتا ہے۔ تیر اور برچھے یہاں کے لڑکوں کے معمولی کھلونے ہیں اور جس طرح پر انگریزی دائیاں بالعموم بچوں کے ہاتھوں میں جھنجھنے دے دیتی ہیں اُسی طرح یہاں چھوٹے چھوٹے تمنچے اور کاٹھ کی تلواریں کھیلنے کو پکڑا دی جاتی ہیں۔ اس شہر کے گلی کوچے میری نظروں میں بالکل انوکھے معلوم ہوئے۔ گویا کہ عالمِ رویا میں میرا گذر دفعتہً کسی ایسے عجیب مُلک میں ہُوا ہے جہاں کے خاص و عام پہلوان ہی پیدا ہوتے ہیں، جن کے بُشرے سے جنگجوئی ٹپکتی ہے اور جن کا تذکرہ میں نے لڑکپن میں قصّوں اور کہانیوں کی کتابوں میں پڑھا تھا۔" [۱]

مذہب اودھ کی آبادی کا کثیر حصّہ ہندو مذہب کا پیرو تھا، باقی لوگ مسلمان تھے جن میں اکثریت سُنّی فرقے کی تھی۔ لیکن اس نئے حکمران خاندان کا مذہب چونکہ شیعیت تھا اس لئے دربار اور شہر میں شیعی رسم و رواج اور شیعی اندازِ زندگی کے فروغ پا جانے کے بہت امکانات پیدا ہو گئے تھے۔ سلطنتِ دہلی کی مرکزی حیثیت کمزور ہونے سے پہلے شمالی ہندوستان میں شیعہ شخصی قانون اور شیعہ فقہ کے رواج کا پتا نہیں چلتا۔ اُس وقت تک شیعہ عقیدہ و رجحان رکھنے والوں کو بھی نمازِ جمعہ و جماعت، نکاح و طلاق، تجہیز و تدفین اور قانونِ وراثت وغیرہ میں فقہ حنفی کی قانوناً اور رواجاً پیروی کرنی پڑتی تھی۔ اس لئے شیعی رسم و رواج سارے ہندوستان کی طرح اودھ کے آغازِ حکومت میں بھی کچھ نمایاں نہ تھے۔ چنانچہ پہلے دو صوبہ داروں یعنی برہان الملک اور صفدر جنگ کے عقیدۂ تشیع کے باوجود فقہ جعفریہ کی ترویج اور شیعہ نظامِ معاشرت و تمدن کی تشکیل کے آثار موجود نہ تھے۔ پُورب کے علاقے میں جون پور، مانک پور، کوڑہ جہان آباد، بلگرام، سندیلہ، کاکوری، غازی پور، نصیر آباد، جائس، گوپامئو، چندا اور، چریاکوٹ، گھوسی، صفی پور، زرولی،

کچھوچھا، سہالی، کچند، قنوج، دلیوہ، مسولی اور خیر آباد وغیرہ قصبات میں علم و دانش کے جو مراکز تھے اُن میں علومِ دینیہ یعنی تفسیر، حدیث اور فقہ وغیرہ کی تعلیم سُنّی نقطۂ نظر سے دی جاتی تھی۔ اِن چھوٹے چھوٹے شہروں اور قصبات کے علاوہ خاص لکھنؤ میں بھی محلۂ فرنگی محل کے اندر دینی تعلیم کا ایک نامی و گرامی مدرسہ قائم تھا جس کی بنیاد مُلّا قطب الدین انصاری کی نسل نے ڈالی تھی جو خود بھی بہت بڑے عالم اور صُوفی تھے۔ مُلّا صاحب اپنے وطن سہالی میں جو لکھنؤ سے بتیس میل کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا قصبہ تھا، درس و تدریس، عبادات اور تصنیف و تالیف میں مصروف تھے کہ بعض مناقشات کی وجہ سے موضع پنیتی پور کے عثمانی شیخ زادوں نے سنہ ۱۱۰۳ھ/۱۶۹۱-۲ء میں بزمانۂ اورنگ زیب مُلّا صاحب کے گھر پر چڑھائی کر کے اُنھیں قتل کر دیا تھا۔ مُلّا صاحب کے ایک صاحبزادے محمد سعید اس حادثے کے متعلق محضر تیار کر کے اورنگ زیب عالمگیر کی خدمت میں دکن پہنچے اور وہاں سے ایک فرمان کے ذریعہ اُنہوں نے اپنے خاندان کے قاتلوں سے قصاص لینے اور اُن کے خان ومان کو برباد کرانے کا انتظام کیا۔ پھر ایک دوسرے فرمان کے ذریعہ جو سنہ ۱۱۰۵ھ/۱۶۹۳-۴ء میں جاری ہوا تھا، اُنہوں نے لکھنؤ میں دو مکان اپنے خاندان کی سکونت کے لئے حاصل کئے تھے۔ یہ مکانات جس محلّے میں واقع تھے اُسے اِس مناسبت سے فرنگی محل کہتے تھے کہ یہاں ایک فرانسیسی نے بسلسلۂ تجارت ایک کوٹھی تعمیر کرائی تھی۔ غرض سنہ ۱۱۰۵ھ/۱۶۹۳-۴ء سے یہ خاندان سہالی سے لکھنؤ آگیا تھا اور اپنے خاندانی مشغلۂ درس و تدریس میں مصروف ہو گیا تھا۔ مُلّا قطب الدین کے چار بیٹے۔ مُلّا اسعد، مُلّا سعید، مُلّا نظام الدین اور مُلّا رضا تھے، جن کی مختلف شاخوں نے بعض جیّد صُوفی اور جیّد عالم پیدا کئے۔ لیکن تدریسی خصوصیات کے باعث مُلّا نظام الدین کا نام بہت مشہور ہے جن سے درسِ نظامیہ کی ترتیب و ترویج منسوب ہے۔ ان بُزرگ کی عمر اپنے والد کی ہلاکت کے وقت چودہ سال تھی۔ اُس زمانے میں آپ شرحِ مُلّا جامی پڑھتے تھے۔ لکھنؤ آکر تکمیلِ علم کی۔ اسی سلسلے میں کچھ عرصہ دیوا بھی جا کر رہے اور بعض ابتدائی کُتب پڑھیں۔ پھر جائس میں

مُلّا علی مُحلّی سے درس لیا۔ مولانا امان اللہ بنارسی سے "امُورِ عامہ" پڑھی اور مُلّا غلام علی نقشبند گورکھپوری سے آخری کتابیں لکھنؤ ہی میں پڑھیں۔ مُلّا نظام الدین نے ۹ جمادی الاوّل ۱۱۶۸ھ میں انتقال کیا اور شرحِ منارہ حاشیۂ شمسِ بازغہ، حاشیہ حاشیہ قدیمہ، شرحِ عقائدِ جلالیہ، شرح مُسلم، شرح تحریر الاصول، حاشیۂ صدرا وغیرہ تصانیف یادگار چھوڑیں۔ مُلّا صاحب نے چالیس سال کی عمر میں شاہ عبدالرزاق بانسوی کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ اس کے بعد آپ پر تصوّف کا رنگ غالب رہا۔ اُن کے دبستانِ فکر نے تصوّف کی بھی قدر کی اور منقولات کے ساتھ ساتھ معقولات پر بھی زور دیا چنانچہ منطق اور فقہ میں فلسفہ کی موشگافیاں داخل کر دیں [۱]

مُلّا نظام الدین نے درسِ نظامیہ کے نام سے جو نصاب مرتب کیا تھا اُس کی تفصیل مولانا ابوالحسنات ندوی نے "ہندوستان کی قدیم اسلامی درس گاہیں" میں بھی بیان کی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس نصاب میں اوّل صَرف و نحو، منطق و حکمت، ریاضی، فقہ و اصولِ فقہ، علمِ تفسیر و حدیث، علمِ کلام اور بلاغت سے متعلق مخصوص کتابیں شامل تھیں لیکن پھر بعد میں عربی ادب، فرائض، علمِ مناظرہ اور اصولِ حدیث کا اضافہ کر دیا گیا تھا۔ اس نصاب میں علوم عقلیہ اور فنونِ نقلیہ کا جو امتزاج تھا وہ ایک خاص اندازِ نظر رکھنے والے مُلّاؤں کو پسند نہ تھا چنانچہ مناظر احسن گیلانی تحریر فرماتے ہیں کہ :۔

"آج جس نصاب کا نام "نصابِ نظامیہ" ہے اس کے متعلق معقولاتی کتابوں کی کثرت کی عام شکایت ہے۔ اس نظام کے بانی کا تعلیمی سلسلہ دراصل مُلّا فتح اللہ شیرازی پر منتہی ہوتا ہے۔" [۲]

مقصودِ بیان یہ ہے کہ یہ علمی ادارہ تصوّف، معقولات اور منقولات کے امتزاج و اتصال کی وجہ سے ایک معتدل مزاج معاشرے کی تعمیر کر رہا تھا۔ جب لکھنؤ میں ایک ایسے شیعہ خانوادے کی حکومت قائم ہوئی جو ایران سے ہندوستان میں نَو وارد گھرانے کی حیثیت سے داخل ہو کر اپنے ہمراہ شیعیت کے تازہ عناصر لایا تھا، لیکن جیسا کہ ہم صفحاتِ ماسبق

میں بیان کر چکے ہیں، اِس خانوادے کے ابتدائی دو حکمرانوں کو یہاں دلجمعی سے بیٹھ کر کوئی نیا تہذیبی مرکز بنانے کا موقع نہیں مِل سکا تھا۔ اس کام کی بُنیاد تیسرے نواب یعنی شجاع الدولہ کے ہاتھوں فیض آباد میں رکھی گئی لیکن اُن کی عُمر نے وفا نہ کی اور محض دس سال کی نمود و نمائش کے بعد فیض آباد کا زوال شروع ہو گیا۔ اب لکھنؤ نیا تہذیبی مرکز بنا جہاں فرنگی محل کے عُلماء تقریباً پچھتّر سال سے علم و دانش کی راہبری کر رہے تھے۔ اس ادارے کے علماء میں مولوی ظہور اللہ، مولوی ولی اللہ اور مولوی نعمت اللہ تعلیم و تدریس میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے۔ اُن کے علاوہ مولوی عبدالکیم، مولوی عبدالحلیم، مولوی عبدالحیٔ، مولوی محمد ابراہیم، مولوی سعد اللہ، مولوی تراب علی، مولوی واجد علی وغیرہ علوم نقلی و عقلی کے جامع تھے [۱] ان سب عُلماء نے صرف و نحو، معانی و بیان، ادب و شعر، عروضِ عربی، ہیئت، فقہ، اصولِ فقہ، کلام، عقائد، منطق، فلسفۂ الہیات، طبیعات وغیرہ میں لکھنؤ کا علمی پایہ بہت بلند کر دیا تھا۔ لیکن آصف الدولہ کے آغازِ حکومت تک شیعی عقیدے کی ترویج اور شیعہ مسلک کی تعلیم و تربیت کا کوئی معقول انتظام نہ تھا۔

یہ بات عام طور پر سبھی لوگ جانتے ہیں کہ شیعہ مسلک، اسلام ہی کے ایک مخصوص فرقے کا نام ہے جس کے بنیادی عقائد وہی ہیں جو جمیعِ مُسلمین کے ہیں لیکن چند باتوں میں وہ اپنی انفرادی حیثیت رکھتا ہے اور بعض اسلامی تصورات میں اِس عقیدے کے ماننے والوں کا نقطۂ نظر عام مسلمانوں سے کچھ باتوں میں مختلف ہے مثلاً جانشینیِ رسولؐ، خلافت و امامت، رویتِ باریٰ، عدلِ خداوندی، عصمتِ انبیاؑ، جبر و اختیار اور عقل و نقل کے توازن میں بہت واضح اختلاف پایا جاتا ہے۔ ہمیں اس اختلاف سے کوئی غرض نہیں ہے لیکن ہم اس مقام پر شیعیت کا تصوّر واضح کرنے کے لئے اُن کے عقیدے کی بنیادی باتیں بیان کئے دیتے ہیں:

۱۔ اللہ:۔ واجب الوجود ہے اور اُس کے علاوہ کُل اشیائے کائنات ممکن الوجود ہیں۔

۲۔ نبوّت:۔ اللہ نے ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء ہدایت کے لئے بھیجے جن میں اوّل ابوالبشر یعنی حضرتِ آدمؑ اور آخر حضرت محمد مصطفےٰ صلعم تھے۔

۳- **دین وشریعت:-** (ا) اللہ کا دین ایک ہے جس کے اصول ہر زمانے میں ایک ہی رہتے ہیں۔ جب لوگ احکامِ الٰہی میں تصرّف کر لیتے ہیں تو شریعت بدل جاتی ہے لیکن اصولِ دین نہیں بدلتے۔

(ب) پانچ انبیاؑ صاحبِ شریعت ہوئے ہیں۔ یعنی نوحؑ، ابراہیمؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ، حضرت محمد مصطفیٰؐ۔

۴- **ملائکہ:-** فرشتے نوری ہیں اور وہ معصوم ہوتے ہیں۔ ہر وقت تسبیح وتہلیل میں مصروف رہنا اُن کا مشغلہ ہے۔

۵- **کُتبِ آسمانی:-** (ا) توریت، زبور، انجیل اور قرآن خدا کی نازل کی ہوئی کتابیں ہیں۔ لیکن موجودہ صورت میں توریت اور انجیل محرّف ہیں یعنی ان میں تحریف ہوگئی ہے۔ قرآن حرف بہ حرف خدا کا کلام ہے۔

(ب) حضرت علی علیہ السلام کو قرآن کا پورا پورا علم تھا اور اُن کے بعد اُن کی نسل میں ائمہ طاہرین کلامِ پاک کے اسرار ورموز سے واقف تھے۔

(ج) قرآن موافقِ تنزیل حضرت علیؑ نے جمع کیا تھا جو نسلاً بعد نسلٍ ائمہؑ کے پاس محفوظ رہا اور اب بارھویں امامؑ کے پاس ہے۔

۶- **امامت:-** (ا) حضرت رسولِ خدا کے بعد بارہ امام سلسلہ وار اُن کے جانشین ہوئے۔

(ب) تمام ائمہ معصوم اور منصوص من اللہ ہیں۔ اُنہوں نے بھی رسولِ مقبولؐ کی طرح دُنیا کے کسی مدرسے میں تعلیم نہیں پائی۔

ایک امام نے خود دوسرے امام کو اسرارِ خدا اور رموزِ کائنات سکھائے ہیں۔

(ج) امامت ریاستِ عامہ ہے۔ رسولؐ کے قائم مقام کی حیثیت سے امام کا کام قوانینِ شرعیہ کو قائم کرنا اور حفاظتِ حدودِ دین کرنا ہے۔

(د) امامت کے لئے وہی شرائط ہیں جو نبوّت کے لئے یعنی امام بطنِ مادر ہی سے امام ہوتا ہے۔ کوئی ظالم عہدۂ امامت پر فائز نہیں ہو سکتا۔ امام اپنے صفاتِ حسنہ میں اپنے عہد کے تمام لوگوں سے فائق ہوتا ہے۔

(ہ) امام خدا کی حجّت ہوتا ہے اور زمین کبھی حجّتِ خدا سے خالی نہیں رہتی۔

(و) حضرت علیؑ امامِ اوّل اور رسولِ خدا کے خلیفۂ بلافصل تھے اور رسولِ مقبولؐ نے :۔

"آپ کی خلافت کا اعلان سب سے پہلے دعوتِ ذوالعشیرہ میں کیا تھا۔ اور آخر میں یومِ غدیر ہزارہا مسلمانوں کے مجمع میں اور اپنی وفات کے وقت اس کے متعلق تحریر کرنا چاہتے تھے مگر لوگوں نے قلم و دوات نہ دیا اور حضرت کی یہ خواہش پوری نہ ہوئی۔" [۱]

۷۔ اَزواجِ رسولؐ اُمّہاتِ مومنین ہیں۔

۸۔ وہ تمام اصحابِ رسولؐ واجب الاحترام ہیں جو آخر وقت تک ایمان پر قائم رہے اور جنہوں نے مرتے وقت تک احکامِ خدا و رسولؐ کی خلاف ورزی نہیں کی۔

۹۔ اہلبیتِ رسولؐ :۔ (و) حضرت علیؑ، حضرت فاطمہ، امام حسنؑ، امام حسینؑ اور نو امام جو اولادِ امام حسینؑ سے تھے اہلبیتِ رسولؐ ہیں۔ ان کے علاوہ کوئی اور اہلبیتؑ میں

داخل نہیں۔ یہی آلِ رسولؐ، ذریتِ رسولؐ اور ذو القربےٰ بھی کہلاتے ہیں۔

(ب) اہلبیتِ رسولؐ پانچ چیزوں میں رسولؐ کے شریک ہیں یعنی صلوات، وجوبِ مودّت، طہارت، اطاعت، تحریمِ صدقہ۔

(ج) اہلبیتِ رسولؐ قیامت تک قرآن کے ساتھ ہیں۔ اور اُمّت کی ہدایت کے لئے صرف قرآن کافی نہیں بلکہ اہلبیتؑ سے تمسک بھی ضروری ہے۔

(حاشیہ: سنی سے بقول شیعہ روایات۔ امام وقت اور دلیل ایک کبھی نہ رہا۔ بعض کہا گیا کہ ... سنا ہوں کہ امام نے اپنی ہی کے خلاف اپنے شیعوں کی تقیہ پر ...)

۱۰۔ حضرتِ امام مہدیؑ جو رسولؐ کے بارہویں جانشین ہیں اور اولادِ امام حسینؑ سے ہیں، بحکمِ خدا غائب ہیں۔ اور جب تک اُس کی مشیّت ہے وہ غائب رہیں گے۔ قربِ قیامت میں آپ کا ظہور ہوگا۔ اور اُس وقت آپ زمین کو عدل وداد سے بھر دیں گے۔ آپ تمام ادیانِ باطلہ کو نیست و نابود کر کے ہر طرف دینِ اسلام پھیلا دیں گے۔[1]

۱۱۔ جہاد:۔ (ا) کفار، مشرکین اور منافقین سے جہاد واجب ہے بشرطیکہ کوئی معصوم یا امام اُس کا حکم دے۔

(حاشیہ: اسلے خلاف ازادی ... دین ... فی سبیل اللہ ... کی ہر جگہ پر ایک ... اسلام کی تعلیم کی رو سے جائز ہے)

(ب) امامِ زمانہ چونکہ عالمِ غیبت میں ہیں اس لئے فی زمانہ جہاد ساقط ہے۔

(ج) کسی قوم و ملک پر جارحانہ حملہ کرنا جائز نہیں البتہ مدافعت کے لئے جنگ کی جاسکتی ہے۔

۱۲۔ رجعت:۔ قیامتِ صغریٰ میں جو قیامتِ کبریٰ سے پہلے ہوگی کچھ لوگ زندہ کئے جائیں گے۔ وہی زمانہ حضرتِ حجّت کے ظہور کا ہوگا۔

(حاشیہ: [illegible])

۱۳۔ معادِ جسمانی:۔ تمام مُردے زندہ کئے جائیں گے اور اپنے اعمال کے لحاظ سے جزا و سزا پائیں گے۔

۱۴۔ فنائے عالم وحشرِ خلق:۔ ایک دن تمام دُنیا کا نظام درہم وبرہم ہوکر فنا ہوجائے گا اور سوائے ذاتِ باری کے کوئی باقی نہیں رہے گا۔

۱۵۔ سکراتِ موت:۔ مومن کی جاں کنی کے وقت حضرت رسولِ خدا اور حضراتِ ائمہؑ تشریف لاتے ہیں اور موت کی سختی اُس پر سہل ہوجاتی ہے۔

۱۶۔ قبر کے اندر:۔ (ا) مُردہ اجسام میں پھر سے روح ڈالی جاتی ہے اور سوال و جواب ہوتے ہیں۔ عقائدِ حقّہ کی جو تلقین قبر میں کی جاتی ہے، مُردہ اُس کو سنتا ہے اور منکر ونکیر کے سوالوں کا جواب دیتا ہے۔

(ب) قبر میں گنہگاروں پر عذاب ہوتا ہے اور مومنوں پر رحمت کے دروازے کھُلتے ہیں۔

۱۷۔ عالمِ برزخ:۔ (ا) انسان کے مرنے کے بعد اُس کی روح عالمِ برزخ میں چلی جاتی ہے۔

(ب) انبیاء اور ائمہ کی ارواح اپنے اصلی جسم میں رہتی ہیں، اور زمین کے ہر حصّے میں جہاں چاہیں جاسکتی ہیں۔

۱۸۔ جنّت ودوزخ:۔ اعمالِ حسنہ کی جزا کے لئے اللہ نے جنّت بنائی اور اعمالِ بد کی سزا کے لئے دوزخ پیدا کیا۔

۱۹۔ اعراف:۔ جنّت اور دوزخ کے درمیان ایک جگہ ہوگی جس کا نام اعراف ہے۔

۲۰۔ حسابِ اعمال:۔ روزِ قیامت بندوں کے اعمالِ نیک وبد کا حساب ہوگا۔

۲۱۔ شفاعتِ محمدؐ وآلِ محمدؐ:۔ روزِ قیامت محمدؐ وآلِ محمدؐ گنہگار مومنین کی شفاعت کریں گے اور خدا اُن کے گناہ معاف کردے گا۔

۲۲۔ عزاداری:۔ امام حسینؑ کی عزاداری مقدس ومحترم ہے۔ جو شخص غمِ حسینؑ کا احترام کرے گا اُس پر جنّت واجب ہے۔

۲۳۔ **نیاز و فاتحہ:۔** حضرات چہاردہ معصومینؑ اور دیگر بزرگانِ دین کی نذر و نیاز کرنا باعثِ ثواب ہے۔

۲۴۔ **زیارت:۔** انبیاء، ائمہ اور اولیاء کی قبور کی زیارت کرنا کارِ ثواب ہے۔ اس سے ایمان میں قوت پیدا ہوتی ہے۔ [۱]

نواب آصف الدولہ اور اُن کے وزیر یعنی سرفراز الدولہ حسن رضا خاں نے لکھنؤ میں شیعہ عقیدے کو درباری مذہب کی حیثیت دے دی تھی۔ عدالتوں میں بیشتر مفتی اگرچہ غازی الدین حیدر کے عہد تک عُلمائے اہلِ سُنّت ہی سے تھے لیکن حسن رضا خاں نے ایک شیعہ عالم مرزا محمد عسکری کو پانچ سو روپے مشاہرے پر مفتی دربار مقرر کر دیا تھا اور اُنہیں سے احکام شرعیہ حاصل کئے جاتے تھے۔ مولانائے موصوف شیعوں کے اخباری فرقے سے تعلق رکھتے تھے یعنی اصولی شیعہ نہیں تھے۔ اس لئے اُنہیں نمازِ جمعہ و جماعت سے کوئی سروکار نہ تھا۔ جب مولانا دلدار علی نصیر آبادی اجازۂ اجتہاد عراق سے لے کر لکھنؤ آئے تو دربار میں اُن کی بہت تعظیم و تکریم ہوئی۔ [۲]

قصبۂ جائس اور اُس کے نزدیک نصیر آباد (ضلع رائے بریلی) میں نقوی سادات کا ایک خاندان قدیم زمانے سے آباد چلا آ رہا تھا۔ اُسی گھرانے میں بمقام نصیر آباد مولوی دلدار علی ۱۱۶۶ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ اُنہوں نے اپنے وقت کے بعض معروف عُلماء سے علوم عقلی کی تعلیم حاصل کر کے شاہجہاں پور اور دہلی وغیرہ کی سیاحت اختیار کی تھی اور پھر وہ بزمانۂ آصف الدولہ لکھنؤ آکر وزیرِ اودھ سرفراز الدولہ سے ملے تھے۔ نواب حسن رضا خاں نے اُنہیں پانچ ہزار روپے دے کر مزید تعلیم کے لئے نجف اشرف بھیج دیا تھا۔ اُنہوں نے پانچ سال عراق میں مقیم رہ کر علومِ اہلبیتؑ کی تکمیل کی تھی۔ جب وہ واپس آکر لکھنؤ میں اقامت گزیں ہو گئے تو اُنہوں نے درس و تدریس، تصنیف و تبلیغ اور رُشد و ہدایت کا سلسلہ شروع کیا۔ تذکرۃ العُلماءؒ اور آئینۂ حق نما وغیرہ کتابوں سے پتا چلتا ہے کہ مولانا دلدار علی نے شیعہ فرقے کی اوّل نمازِ ظہرین بجماعت

۱۴ رجب ۱۲۰۰ھ (۱۲ مئی ۱۷۸۶ء) کو نواب حسن رضا خاں کے مکان میں پڑھائی تھی۔ اس نماز میں مُلّا محمد علی فیض آبادی اور شیخ اکبر علی چشتی مودودی نے بھی شرکت کی تھی۔ تقریباً دو ہفتے بعد یعنی ۲۷ رجب ۱۲۰۰ھ (۲۶ مئی ۱۷۸۶ء) کو اُنہوں نے نمازِ جُمعہ بھی با جماعت ادا کی۔ کہتے ہیں کہ لکھنؤ بلکہ شمالی ہندوستان میں شیعہ فرقے کی یہ پہلی نمازِ جُمعہ وجماعت تھی۔ مولانا نے نماز کے بعد موعظہ فرمانے کا بھی سلسلہ شروع کیا۔ لکھنؤ میں اُس وقت تک شیعہ فقرا، صُوفیہ مثلاً شاہ باسط، شاہ نور علی، شاہ حسن، شاہ حسین وغیرہ بہت مقبول تھے اور اُنہوں نے عوام کو حال وقال اور حاضرات وغیرہ کی بدعت پر لگا رکھا تھا اس لئے مولانا دلدار علی نے اُن کے خلاف اپنے خُطبات میں بہت زور دیا۔ [۱] اُن کا ایسا ہی ایک وعظ سُن کر آصف الدولہ نے بھنگ پینے سے جس کے وہ عادی تھے توبہ کر لی تھی۔

تصوّف کا شیعیت کا کیا مقام ہے؟ اس سلسلے میں عُلمائے عراق نے اپنا نُقطۂ نظر واضح نہیں کیا تھا البتہ علاّمہ محسن کاشانی نے تفسیرِ صافی میں سماع کو جائز ٹھہرایا تھا۔ قاضی نُور اللہ شوستری نے بھی اپنی تحریروں میں اکابر صوفیہ کی ستائش کی تھی اور اُن کے اقوال کے اپنی خوش عقیدگی کے باعث روشن پہلو سامنے رکھے تھے۔ مُدعا یہ کہ لکھنؤ کے تہذیبی عروج کے وقت تک مذہبِ شیعہ اور تصوّف میں کوئی حدِ فاصل نہیں تھی۔ پیری، مُریدی، عُرس، قوّالی، قبورِ صوفیا پر چادریں، پنکھے اور بیرقیں چڑھانا، منّتیں مانگنا وغیرہ شیعوں کے عمل میں بھی داخل تھا۔ مولانا دلدار علی نے ان رسوم پر اپنے خطبات میں ضربِ کاری لگائی اور "شہابِ ثاقب" کے نام سے ایک کتاب لکھ کر صوفیاء کے فلسفے اور اقوال و اعمال پر کڑی تنقید کی۔ اِس جہادِ زبان وقلم کے باعث اودھ کا شیعہ معاشرہ ایسی بدعتوں سے پاک ہو گیا جن کا تذکرہ علاّمہ غلام حسنین کنتوری نے ان الفاظ میں کیا ہے:

"تمہارے گھروں میں جو چبوترے بھنگ نوشی کے تھے اُن پر سجّادے بچھوا دیے۔ تمہاری نذر و نیاز میں جو شیخ سدو کا بکرا، شیخ فرید کی شیرینی، بابا شکر گنج کا کونڈا، شاہ مدار

کی کندوری، ستید سالار کی بیرق جاری بھتی۔ اب عملِ گوسفند اور جناب عباس کی حاضری اور علم و تعزیے بنام شہدائے کربلا جاری کرائے؟

مولانا دلدار علی نے سرفراز الدولہ کو مشورہ دے کر تقریباً ڈیڑھ لاکھ روپے کی کتابیں مختلف مذاہب سے متعلق خرید کرائیں اور پھر ایک مجلسِ درس و تدریس قائم کی۔ انہوں نے اپنے شاگردوں کی تربیت کر کے انہیں جید عالم بنا دیا۔ ان سب نے مل کر تحریر و تقریر کے ذریعہ تبلیغ دین کا کام سرانجام دیا۔ دلدار علی صاحب نے خود جو کتابیں تصنیف کیں ان میں توحید، عدل، نبوت، امامت اور قیامت پر علیحدہ علیحدہ مستقل کتابوں کے علاوہ حسب ذیل تصنیفات بھی قابلِ قدر ہیں:۔

۱۔ مراۃ العقول:۔ پانچ جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس میں اپنے عقیدے کے علاوہ تمام دیگر مذاہب کی تردید کی ہے۔

۲۔ شہابِ ثاقب:۔ جس کا اوپر تذکرہ ہو چکا ہے۔ تردیدِ فلسفہ و اعمال و اقوالِ تصوف میں ہے۔

۳۔ صوارم الالٰھیات:۔ یہ کتاب تحفۂ اثنا عشریۂ عبدالعزیز محدث دہلوی کے باب الٰہیات کی تردید میں ہے۔

۴۔ حسام الاسلام:۔ تحفۂ اثنا عشریۂ عبدالعزیز دہلوی کے باب نبوت کی تردید میں ہے۔

۵۔ رسالۂ غیبت:۔ عبدالعزیز محدث دہلوی کے اقوال درباب غیبت کی تردید میں ہے۔

۶۔ منتہی الافکار:۔ اصولِ فقہ میں ہے۔

۷۔ اساس الاصول:۔ شیعوں کے اخباری فرقے کی رد میں یہ کتاب تصنیف کی گئی تھی۔

۸۔ آثار الاحزان:۔ واقعاتِ کربلا سے متعلق معتبر روایات اس میں جمع کر دی ہیں۔

مولانا دلدار علی کے تبحرِ علمی کی ستائش میں سیکڑوں علماء کی تحریریں موجود ہیں جن میں سے چند اقتباسات یہاں درج کرنے ضروری نظر آتے ہیں مثلاً عراق کے نامور عالم اور فقیہہ شیخ محمد حسن نجفی مؤلف جواہر الکلام لکھتے ہیں:۔

"مراۃ العقول" والملقب بہ عماد الاسلام، جس کے مصنف ہیں اسلام کے رکنِ اعظم اور

خلقِ خدا پر خدا کی حجت جنہوں نے عقول کو اپنی موشگافیوں سے حیران کر دیا اور عقلی شبہوں کو اپنی نظر و فکر کے ستاروں سے روشن کر دیا. جن کے انواعِ علوم کی حدیں متعین کرنے سے اجناس و فصول قاصر ہیں اور جنہوں نے تحریر کی مشکل شکلوں کو اپنے بیان کے منطوق و مفہوم کے ذریعہ سے واضح کیا. تمام خلقِ خدا کے مرکز اور عقولِ عشرہ کے مدِ مقابل گیارہویں عقل۔"

(منقول از ظلِ ممدمرتبہ مفتی محمد عباس شوشتری)

علامہ شیخ احمد یمنی کا بیان ہے ؛

"آپ کی مہارت علم اصول میں جعفری. آپ کا احاطہ فروعِ مسائل میں یوسفی. آپ کی درایت فہمِ حدیث میں باقری. آپ کی تحریرِ تفسیر میں حقائق کی پردہ دَر اور دقیق نکتوں کو واضح کرنے والی ہے. کون آپ کی ہمسری کر سکتا ہے ؟ اگر علامہ حلی آپ کو دیکھتے تو آپ کی اقتدا کرتے ، اور اگر مجلسی اور مفید آپ کے مفید مجالسِ درس میں حاضر ہوتے تو بحار الانوار کو آپ کے دریائے علم کے پہلو میں حقیر سمجھتے . اللہ اکبر ! کس قدر علوم و فنون میں آپ کا حصہ بلند اور مقام رفیع ہے۔"

(منقول از ظلِ ممدمرتبہ مفتی محمد عباس شوشتری)

اودھ کے دو ابتدائی حکمران جن میں سے ایک صوبہ دار اور دوسرا نواب وزیر تھا اپنے شیعی عقیدے کے باوجود اس مسلک کی ترویج اپنی قلمرو میں نہیں کر سکے تھے لیکن تیسرا حکمران شجاع الدولہ جو سیاسی طور پر زیادہ قوی اور خود مختار تھا. اپنے عقیدے کے اظہار اور مذہبی رسوم کی پابندی میں زیادہ بے باک تھا چنانچہ تاریخ بر صغیر ہمیں بتاتی ہے کہ شجاع الدولہ جب احمد شاہ ابدالی کے ساتھ انوپ شہر کے مقام پر خیمہ زن تھے تو ماہ اگست ۱۷۶۰ء میں عشرۂ محرم آگیا. ان ایام میں سے کسی ایک دن نواب وزیر اپنے ہمراہیوں کے ساتھ سیاہ ماتمی لباس پہنے ، برہنہ سر اور برہنہ پا ہو کر اپنے اور اپنے رفیقوں کے ہاتھوں میں علم لئے ہوئے نکلے . وہ سب غمِ حسین

میں مرثیے پڑھتے اور ماتم کرتے ہوئے ایک جلوس کی شکل میں جا رہے تھے۔ [1]

عزاداری کے اس رجحان کو مولانا دلدار علی نے بہت تقویت پہنچائی۔ انہوں نے غیر شرعی افعال و اعمال کو درست کیا اور سامانِ عزا میں سے اُن چیزوں کو خارج کر دیا جو وقارِ غم کے منافی تھیں۔ چنانچہ شہنائی، روشن چوکی اور ماہی مراتب کو جلوسِ عزا میں شامل کرنے سے منع کیا۔ جانوروں کی تصاویر اور اُن کے مجسّموں کو استعمال کرنے سے روکا۔ بانک اور پٹے کے کرتبوں کو خلافِ متانت و وقار ٹھہرایا۔ جنگی باجے کی اجازت دی، مہندی، علم، تعزیوں اور ذوالجناح کی شمولیت سے شانِ جلوس بڑھا دی۔

مولانا دلدار علی نے کوئی درباری عہدہ اپنے لئے پسند نہیں کیا۔ اُن کی کفالت کے لئے ایک ہزار روپے ماہوار کی وہ جائیداد کافی تھی جو انہیں بہو بیگم یعنی والدۂ آصف الدولہ نے بطور معافی دی تھی۔ انہوں نے تقریباً پینتیس سال خدمتِ مذہب اور تبلیغِ دین میں صرف کر کے ۱۹ رجب ۱۲۳۵ھ (۲ مئی ۱۸۲۰ء) کو بعہدِ غازی الدین حیدر انتقال کیا۔ وہ اپنی وفات کے بعد غفراں مآب کے خطاب سے یاد کئے گئے۔ انہوں نے کثیر تعداد میں اپنے شاگرد تبلیغِ دین و مذہب کے لئے چھوڑے۔ اُن کے پانچ بیٹے یعنی سید محمد، سید علی، سید حسن، سید مہدی اور سید حسین تھے۔ ان میں سے سید مہدی تو اپنے والد کی زندگی ہی میں اپنے فضل و کمال کے جوہر دکھا کر تیئس ۲۳ سال کی عمر میں انتقال کر گئے تھے۔ ایک اور صاحبزادے سید علی جو ۱۲۰۰ھ/۱۷۸۶ء میں پیدا ہوئے تھے اور ۱۲۵۹ھ/۱۸۴۳ء میں عراق میں وفات پا گئے انہوں نے تفسیرِ قرآن سب سے پہلے اردو میں لکھی تھی۔ وہ ہجرت کر کے عتباتِ عالیات چلے گئے تھے، اس لئے اپنے ملک میں اُن کی شہرت زیادہ نہیں ہوئی۔ غفراں مآب کے تیسرے بیٹے سید حسن جو قائم اللیل اور صائم النہار تھے اُن کے اعضا کثرتِ عبادت کی وجہ سے کمزور و ضعیف ہو گئے تھے۔ انہوں نے بھی ۱۲۵۹ھ/۱۸۴۳ء میں وفات پائی۔

غفراں مآب کے دو بیٹے یعنی سید محمد اور سید حسین زیادہ معروف و نامور ہوئے۔ ان میں سے پہلے بزرگ جو اپنے باپ کے بڑے بیٹے تھے اپنی زندگی میں سلطان العلماء اور قبلۂ کعبہ

[illegible] لاہور نومبر ۱۹۷۶ [illegible]

کہلاتے تھے اور مرنے کے بعد اُنہیں رضواں مآب کہہ کر خطاب کیا گیا۔ امجد علی شاہ نے محکمۂ شرعیہ قائم کر کے اُنہیں عدلیہ، پولیس، آبکاری، تعلیم اور امورِ خیر کا نگرانِ اعلیٰ مقرر کر دیا تھا۔ غفراں مآب کے سب سے چھوٹے بیٹے سید حسین تھے جو سید العلماء، میرن صاحب، چھوٹے قبلہ اور علیین مکان کے خطاب سے مشہور ہوئے۔

ان دونوں بھائیوں کے اوصافِ علم و فضل اور زہد و اتقا میں دفتر کے دفتر بھرے ہوئے ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ مفتی محمد عباس کی دو کتابوں یعنی "اوراق الذہب" اور "اطباق الذہب" سے ان حضرات کے محاسن اور فضل و کمال پر بہت اچھی روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً اوراق الذہب میں سلطان العلماء سید محمد صاحب کے متعلق تحریر ہوا ہے:۔

"آپ حکمتِ الٰہیہ جاننے والوں کے مقتدا اور مجتہدین کے نقطۂ آخر ہیں۔ ان کی نشو و نما کے ساتھ دین نے نشو و نما پائی اور ان کی سر بلندی کے ساتھ ساتھ دینِ الٰہی سر بلند ہوا۔ خدا نے ان کے چہرہ میں حسن، کلام میں نمک اور الفاظ میں فصاحت عطا کی ہے۔ ان کی صحبتیں بہشت ہیں جہاں لغو اور غیر مشروع باتوں کا گذر نہیں۔ ان کی عادت میں حسنِ اخلاق و مزاح ہے۔ تلخ کلامی کرنے والوں کو معاف کر دیتے ہیں لیکن جب مقدمات کے فیصلے کے لئے اجلاس فرماتے ہیں تو کوئی شخص دم نہیں مار سکتا۔ ان میں سختی اور نرمی دونوں جوہر خدا نے ودیعت کئے ہیں۔ ان میں تنِ تنہا قیام قہر میں وہ ہیبت ہے جو بادشاہوں کو فوج و لشکر کے ساتھ بھی میسّر نہیں۔"

مختصر یہ کہ غفراں مآب کے پانچ بیٹے اور تیرہ پوتے مسندِ علم و فضل پر متمکن رہے۔ اُن کے پوتوں میں سے آٹھ اپنے عہد کے مجتہدِ اعظم ہوئے ہیں۔ اس گھرانے نے اتنے مجتہد پیدا کئے کہ اس کا نام ہی خاندانِ اجتہاد قرار پایا گیا تھا۔ لکھنؤ میں اس خاندان کے علاوہ مفتی محمد عباس شوستری اور مفتی محمد قلی کے گھرانوں نے بھی اپنے علم و فضل کے باعث بہت شہرت پائی تھی۔ خصوصیت کے ساتھ مولانا حامد حسین ابنِ مفتی محمد قلی اپنی کتاب عبقات الانوار کی

وجہ سے بہت مشہور ہوئے۔ آپ نے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی کتاب تحفۂ اثنا عشریہ کا نہایت تفصیل کے ساتھ جواب قلمبند کیا اور تردیدِ مذہب اہلسنت میں بہت ضخیم کتابیں یادگار چھوڑیں۔ ان علمار کے علاوہ مولانا احمد علی محمد آبادی، مولانا سید محمد ہادی، مولانا میر محمد علی، شیخ علی اطہر، مرزا محمد علی اور مولوی مشرف علی نے بھی بہت سی علمی و مذہبی خدمات سرانجام دیں، اور لکھنؤ میں شیعہ اندازِ فکر کے ساتھ اسلامی نظامِ معاشرت و تمدن کا اعلیٰ نمونہ پیش کر دیا۔

اودھ کے حکمرانوں میں شجاع الدولہ سے واجد علی شاہ تک آٹھ بادشاہ ہوئے ہیں۔ ان میں سے کوئی شخص بھی مذہبی خلوص سے بیگانہ نہ تھا۔ حد یہ ہے کہ غازی الدین حیدر اور نصیرالدین حیدر جیسے گم شدگانِ ہوش بھی مذہبی رسوم کے ادا کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتے تھے۔ چنانچہ صاحب "وقائع دلپذیر" نے غازی الدین حیدر، بادشاہ بیگم اور نصیرالدین حیدر کے مذہبی رُجحان کو بڑی وضاحت و تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اسی مذہبی احساس کی وجہ سے غازی الدین حیدر نے اپنی دونوں عیسائی بیویوں کو خود ہی کلمہ پڑھا کر مسلمان کر لیا تھا۔ اور اُن کے بیٹے نصیرالدین حیدر کے مذہبی شغف کے متعلق نائیٹن لکھتا ہے کہ:۔

"محرم آگیا اور کامل چالیس دن تک ہم لوگ دربار سے الگ تھلگ رہے۔ کبھی کبھار دربارِ صبح گاہی میں اتفاقاً بادشاہ کی زیارت ہو جاتی تھی۔ عزاداری کی وجہ سے ناچ رنگ اور انگریزی دعوتیں یکقلم بند تھیں۔ وجہ یہ تھی کہ بادشاہ نے اپنی تخت نشینی سے پیشتر منت مانی تھی کہ اگر مجھے تختِ شاہی نصیب ہوگا تو میں بجائے عشرہ کے اربعین تک عزاداری کیا کروں گا۔ چنانچہ وہ اس عہد پر سختی سے قائم ہیں۔" [۱]

نصیرالدین حیدر کے بعد محمد علی شاہ سریر آرائے سلطنت ہوئے تو اس انہماک میں کوئی فرق نہیں آیا بلکہ جذبۂ خدمتِ دین میں کچھ اور مفید کام سرانجام پائے مثلاً حاجیوں اور کربلا کے زائروں کے آرام کے خیال سے بمبئی میں ایک سرائے تعمیر کرائی گئی۔ کربلا میں حضرت عباسؑ کے مزار کا دروازہ ٹوٹ گیا تھا اُسے دوبارہ تعمیر کرایا گیا۔ کربلائے معلّیٰ ہی میں بے نوا مسافرین

کے لیے وظائف مقرر کیے۔ لکھنؤ میں حسین آباد اور جامع مسجد انہیں کے احساسِ عقیدت کی یادگاریں ہیں۔

محمد علی شاہ کے بعد جب اُن کے صاحبزادے امجد علی شاہ کا زمانہ آیا تو بقول شخصے حکومت ہی سلطان العلماء اور سید العلماء کے ہاتھ میں آگئی تھی۔ بادشاہ خود بھی مجتہد العصر کی رائے یا ایماء کے بغیر کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ دربار میں مجتہدین کا اثر بڑھ جانے سے ایک یہ فائدہ بھی ہوا کہ وہ لغویات جنہیں مذہبی رسوم کا نام دے کر بادشاہ بیگم نے اختراع کیا تھا۔ یک قلم موقوف ہوگئیں۔

امجد علی شاہ کے بعد اُن کے بیٹے واجد علی شاہ حکمران ہوئے جو اپنے زمانۂ ولیعہدی میں خصوصیت کے ساتھ رنگین مزاج تھے لیکن بادشاہ بننے کے بعد وہ نہایت دیندار اور صالح انسان کی حیثیت سے سامنے آئے۔ چنانچہ رجب علی بیگ سرورؔ "سرورِ سلطانی" ترجمۂ شمشیر خانی میں رقمطراز ہیں:۔

"بادشاہِ شب زندہ دار اِس کمسنی میں مشغولِ روزہ و نماز ہے۔" [۱]

اور امان علی سحرؔ شہادت دیتے ہیں کہ،

یہ دل ہیں جو حضرت غلامِ علیؑ — وظیفہ ہے دن رات نامِ علیؑ
زبانِ مبارک پہ ہے یہ سخن — دَمِ عیسوی ہے دَمِ پنجتنؑ
ادا دل سے کرتے ہیں فرضِ خُدا — کہ ہوتی نہیں پنجگانہ قضا
خواصوں کو یہ حکم حضرت کا ہے — کہ وقتِ سحر وقتِ غفلت کا ہے
اگر استراحت میں پاؤ مجھے — تو پانی چھڑک کر جگاؤ مجھے
اُسی طرح ہے مجتہد کو ثبات — اُسی طرح پاتے ہیں خُمس و زکات

اِس احساسِ مذہبی کے باوجود حکمرانوں کی طرف سے بے تعصبی اور رواداری میں کبھی کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں ہوا۔ بعض لوگ جو غیر ذمّہ دارانہ طور پر لکھ دیتے ہیں کہ لکھنؤ

کے نوابین نے عوام کو بجبر شیعہ بنا لیا تھا۔ وہ اصل میں تاریخی حقائق کی طرف سے آنکھیں بند کرکے صرف اپنے جذبات کی تخئیلی تصویریں سامنے رکھتے ہیں۔ اُن کے بیانات کے برخلاف تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ لکھنؤ کے دربار میں بیشتر علمائے اہلسنت بالخصوص حضرات فرنگی محل مسندِ قضا و افتاء پر متمکن رہے چنانچہ ہم لکھنؤ کے شعبۂ عدلیہ میں مفتی غلام حضرت مولوی محمد مُبین، محمد نصیر خان، مولوی سدن اور مولوی ظہور الدین کے نام گزشتہ صفحات میں درج کر چکے ہیں۔ یہ تمام لوگ حنفی العقیدہ تھے۔ اِن کے علاوہ ہندوؤں میں راجہ ٹکیت رائے، جھاؤلال راجہ کُندن اور مفتی دیا شنکر کے نام بھی ذمہ دار عہدوں پر نظر آتے ہیں۔ مختصر یہ کہ تقریباً سوا سو سال اودھ کا انتظام اس حکمران خاندان کے ہاتھ میں رہا اور اس طویل مدت میں کوئی شیعہ سُنی تصادم ظہور میں نہیں آیا۔ ہندو مُسلم فساد بھی ہنومان گڑھی عرف اختر نگر میں صرف ایک بار ہوا اور اُس میں حکومت نے ہندوؤں کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا۔ اودھ کی حکومت نے جہاں شیعہ معبدگاہوں پر نظرِ التفات رکھی وہاں سید سالار کا مزار (واقع بہرائچ) اور سلون کی درگاہ، اُس کے سجادہ نشین اور زائرین بھی اُس کی اعانت و امداد سے محروم نہیں رہے۔ ہندو بیراگیوں، فقیروں اور معبد گاہوں پر بھی نظرِ عنایت رہی اور دھرم شالاؤں، پاٹھ شالاؤں اور مندروں وغیرہ کی امداد کے لئے قطعاتِ زمین عطا ہوئے۔ ہندوؤں کے تقسیم وراثت وغیرہ کے مقدمات کا اُنہیں کے مذہبی قوانین کے مطابق فیصلہ صادر کرایا گیا۔ ہندوؤں کو ملازمتوں میں خاص عہدے بھی دیئے گئے خصوصاً محکمۂ مالیات عموماً اُنہیں کے ہاتھ میں رہا۔ دربار نے ہندو تہواروں مثلاً ہولی، دیوالی، بسنت اور دسہرہ کے موقعوں پر بھی ہر سال کئی کئی لاکھ روپے صرف کئے۔

شیعیت کو چونکہ بادشاہ کے مذہب کی حیثیت حاصل تھی اس لئے اس عقیدے کے رسم و رواج کو بلاشبہ خاص عروج حاصل ہوا۔ مسلمانوں کے تمام فرقے اپنی وضع قطع اور مذہبی رسوم میں ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہوتے لیکن محرم کی تقاریب شیعوں میں امتیازِ خصوصی رکھتی ہیں۔ اس لئے تمام اودھ بالخصوص لکھنؤ میں عزاداریٔ حسینؑ کو خاص فروغ حاصل ہوا۔

اس شہر میں مختلف حکمرانوں نے اپنے اپنے عہدِ حکومت میں مختلف عمارتیں بنظرِ ثوابِ دارین بنوائیں، اوقاف قائم کیے اور امورِ خیر پر لاکھوں روپے صرف کیے چنانچہ عاشور خانۂ آصفی، حسین آباد، شاہِ نجف، درگاہِ حضرت عباسؑ اور ان کے علاوہ متعدد کربلائیں اور ائمۂ معصومین کے روضوں کی شبیہیں آج بھی اپنی عظمتِ دیرینہ کی داستانیں دُہرانے کے لئے باقی ہیں۔ لکھنؤ کے محرّم کی تفصیلات کے لئے ہمارے پاس دو غیر ملکیوں یعنی مسز حسن علی اور ڈاکٹر ولیم نائیٹن کی چشم دید شہادتیں موجود ہیں جن سے امداد لے کر ہم محرّم کی تقریبات کی بعض جھلکیاں پیش کر سکتے ہیں۔

لکھنؤ کا محرّم

مسز حسن علی محرّم کے متعلق لکھتی ہیں کہ ہندوستان کی مسلمان آبادی ہر سال اسلام کی عظمتِ دیرینہ کی یاد میں یہ سنجیدہ مظاہرہ اپنے اوپر فرض سمجھتی ہے۔ اس تقریب کا آغاز چاند رات سے ہو جاتا ہے اور محرّم کا پہلا دن (چاند رات) مجھے ہمیشہ شدّت کے ساتھ ایک غیر آباد گاؤں کی یاد دلاتا ہے کیونکہ ایک گنجان ہندوستانی شہر کے پیہم شور اور ہنگاموں کے مقابلے میں یہ گہری خاموشی اور سنجیدہ سکوت یورپی لوگوں کے لئے خاص طور پر جاذبِ توجہ ہوتا ہے [۱] نائیٹن بھی لکھتا ہے کہ:-

" محرّم کا چاند نظر آتے ہی لکھنؤ کے باشندے دُنیا کے مخمصوں سے بے نیاز ہو جاتے ہیں اور یکم محرّم کو اکثر مسلمانانِ لکھنؤ غمگین نظر آنے لگتے ہیں۔ گویا تمام دُنیا کے عیش و راحت اور کاروبارِ زندگی سے دفعتہً محروم کر دیئے گئے۔ گلیاں سُنسان نظر آنے لگتی ہیں اور ہر شخص خانہ نشین ہو کر اپنے خاندان والوں کے ساتھ سوگوار ہو جاتا ہے۔ دوسری تاریخ کو گلیوں میں پھر بھیڑ دکھائی دینے لگتی ہے اور لوگ ماتمی لباس پہنے ہوئے تعزیوں کے جلوس کے ساتھ چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ جگہ جگہ پر تعزیے دکھائی دینے لگتے ہیں اور اُن کے ساتھ خلقت کا مجمع بھی ہوتا ہے۔ تعزیے اُن مزاراتِ مقدّسہ کی شبیہ ہوتے ہیں جو کربلا میں دریائے فرات کے ساحل پر واقع ہیں۔ انہیں امام باڑوں یا اُمراء کے دولت کدوں میں رکھا جاتا ہے۔ شاہی تعزیہ

جو سبز بلور کا ڈھلا ہوا ہے اور جس پر سنہرا ملمّا ہو رہا ہے، غازی الدین حیدر کے عہد میں انگلستان سے بن کر آیا تھا۔

امام باڑہ محض محرّم کرنے کی غرض سے پیشتر تیار کرایا جاتا ہے اور جو خاندان اُسے بنواتا ہے اُس کے سرگروہ عموماً اُسی میں مدفون ہوا کرتے ہیں چنانچہ شاہی امام باڑے کی بھی یہی حالت ہے۔ محرّم کے زمانے میں امام باڑے کے اندر تعزیے مکّۂ معظّمہ کے رُخ پر رکھے جاتے ہیں۔ شاہی تعزیے پر ایک سبز مخمل کا شامیانہ تنا رہتا ہے جس کے حاشیے پر زردوزی ہوتی ہے۔ سامنے کی طرف ایک منبر بیانِ شہادت پڑھنے کی غرض سے رکھ دیا جاتا ہے جس پر ذاکر اس طرح کھڑے ہوتے ہیں کہ اُن کا رُخ قبلہ کی جانب اور پُشت تعزیے کی طرف ہوتی ہے۔

اِس زمانے میں امام باڑوں میں روشنی کی بہتات ہوتی ہے، جس کے اندر کارچوبی کام کا سامان اس طرح جگمگاتا ہے کہ انسان کی نظر چُندھیا جاتی ہے۔ عَلَموں کے طلائی اور نقرئی پنجوں کی چمک، بھاری بھاری ٹیکوں کی آرائش، زردوزی کام پر گنگا جمنی جھالروں کی زیبائش، در و دیوار کو روشن کر دیتی ہے جس سے سارا امام باڑہ پُرنور ہو جاتا ہے اور رات میں دن کا سماں نظر آنے لگتا ہے۔ پھر اِس پُر کیف حالت میں اُونچے شملوں اور بازیب داڑھیوں کے ساتھ آدمیوں کا شائستگی اور سکوت سے چلنا، اُن کی مغموم صُورتوں سے رنج و غم کا ٹپکنا، یہ سب ایسا سماں پیش کرتا ہے کہ مسز سیّد حسن علی کا یہ قول صحیح معلوم ہوتا ہے کہ "اُن چیزوں کو دیکھ کر الف لیلیٰ کے طلسمی ایوانات میری آنکھوں میں پھر گئے"۔

اَیامِ محرّم میں تعزیوں کے گرد بڑی بڑی سُرخ و سبز رنگ کی شمعیں رات بھر جلا کرتی ہیں اور شب و روز میں دو مرتبہ امام باڑوں میں مجلسِ عزا منعقد ہوا کرتی ہے جس میں رات کی مجلس زیادہ بارونق ہوتی ہے۔ کیونکہ اُس وقت مجمع بہت اچھا ہوتا ہے۔ بادشاہ سلامت ماتمی لباس پہنے اور سر پہ پَروں کا تاج رکھے ذاکر کے رُوبرو بیٹھتے ہیں۔ اُن کے پیچھے اُن کے مصاحبین اور عزیز و اقارب ہوتے ہیں جو دو دو آدمیوں کی ایک قطار بنائے، گردن جُھکائے،

نیچی نظر کئے، اور غمگین صورت کے ساتھ امام باڑے میں داخل ہوئے تھے۔ جھاڑ، فانوس اور شمعوں کی تیز روشنی میں اس وقت کا سماں اور عالم سکوت قابلِ دید ہوتا ہے۔ اس سکوت کو ذاکر کی پُر درد آواز توڑتی ہے اور سامعین بالکل سکوت کے اندر سراپا مغموم بنے ہمہ تن گوش رہتے ہیں۔ اس وقت روشنی کی تاب و تابش میں بڑی بڑی پگڑیوں کی شان اور امام باڑے کے ساز و سامان کی چمک دمک، علموں کے زرنگار ٹیکوں کی تڑپ عجب لطف دکھاتی ہے۔ کیونکہ ہر طرف ایک آگ سی لگی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ ذاکر جس وقت واقعاتِ شہادت بیان کرتا ہے تو عجب انداز سے آنکھوں کو گردش میں لاتا ہے۔ پڑھتے ہی پڑھتے اُس کی آواز میں زور پیدا ہو جاتا ہے اور آنکھوں سے جوش ٹپکنے لگتا ہے۔ سامعین پہلے تو مغموم صورت بنائے ساکت و صامت بیٹھے رہتے ہیں لیکن رفتہ رفتہ اُن کے دل میں گداز پیدا ہونے لگتا ہے اور پھر سب کے سب گریہ و بکا میں محو ہو جاتے ہیں۔ جب ذاکر مجلس کی یہ حالت دیکھتا ہے تو وہ اور زیادہ بلند آواز سے "واویلا" "وامصیبتا" کی صدا بلند کرتا ہے اور اسی درمیان میں خاص خاص مواقع پر بعض سامعین کی زبان سے "حسنؑ حسینؑ" کا نعرہ نکل جاتا ہے۔ آخرکار سب لوگ سینہ کوبی کرنے لگتے ہیں۔ یہ ماتم پہلے تو آہستہ آہستہ ہوتا ہے پھر زور زور سے "حسنؑ حسینؑ" کی آواز اور ماتم کا شور بلند ہوتا ہے جس سے سارا امام باڑہ گونج اُٹھتا ہے۔ دس منٹ تک یہی حالت رہتی ہے جس کے بعد ذاکر منبر پر بیٹھ جاتا ہے اور مجمع پر ایک سکوت طاری ہو جاتا ہے۔ اس محنتِ شاقہ کے بعد شربت کا دَور چلتا ہے اور بادشاہ اور اُن کے اعزہ و اقربا حُقّہ سے شوق فرماتے ہیں۔ کچھ دوسرے لوگ اپنے اپنے بٹوؤں سے گوٹا (دھنیہ) وغیرہ نکال کر چباتے ہیں۔ خاتمۂ مجلس پر اُردو زبان اور عام بول چال میں مرثیہ خوانی شروع ہوتی ہے جس سے عوام زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ مرثیہ ختم ہونے پر سارا مجمع کھڑے ہو کر دروازۂ ائمہ پر درود و سلام بھیجتا ہے۔

تمام محرّم امام باڑے میں روزانہ اسی طرح کی مجالس منعقد ہوتی ہیں جن میں بادشاہ (نصیر الدین حیدر) بے حد دلچسپی لیتے ہیں۔ اُنہوں نے اپنی شاہزادگی کے زمانے میں یہ

منّت مانی تھی کہ اگر میں بادشاہ ہو جاؤں تو محرّم کی تقریب دس دن (عشرے) کے بجائے چالیس دن (اربعین) تک مناؤں گا۔ اب اُس کی تکمیل کی جاتی ہے۔ چنانچہ اِن دنوں میں بادشاہ اپنے اعزّہ یا احباب ہی کے مجمع میں رہتے ہیں۔ وہ شراب نہیں پیتے، دعوتیں نہیں دیتے۔ اور عیش و عشرت کے جن سامانوں کے بڑے دلدادہ ہیں اُن کو ترک کر دیتے ہیں۔ اسی طرح انگریزی مذاق کی جتنی باتیں اُنہیں مرغوب ہیں اُن سب کو چھوڑ دیتے ہیں۔

بیگماتِ شاہی کے امام باڑے محل کے اندر علیٰحدہ علیٰحدہ ہیں اور وہاں کی مجلسوں میں خواتین ہی نعت خوانی اور مرثیہ خوانی کیا کرتی ہیں۔ میں نے بہ تحقیق سُنا ہے کہ اِن مجلسوں میں ماتم اور آہ و بُکا زیادہ زور شور کے ساتھ ہوتا ہے.....

شیعہ لوگ صرف امام باڑوں میں جاکر اور مجالسِ عزا میں شریک ہوکر ہی سیّد الشہدا کا غم نہیں مناتے بلکہ وہ زمانۂ عزا میں اپنے نفس پر بھی جبر کرتے ہیں۔ وہ معمولی لکڑی کی چارپائیوں یا چٹائیوں پر سوتے اور سادہ غذائیں کھاتے ہیں۔ گرم سالن اور مزیدار پلاؤ چھوڑ کر جَو کی روٹی، اُبلے چاول، اور دال پر اکتفا کرتے ہیں۔ عورتیں بھی اپنے زیورات بڑھا کر سامانِ آرائش کو بالائے طاق رکھ دیتی ہیں۔

باشندگانِ لکھنؤ کا اعتقاد ہے کہ لکھنؤ میں امام حسینؑ کے علم کا پنجہ موجود ہے جسے ایک غریب زائر مُلکِ شام سے لایا تھا۔ یہ نہایت ہی متبرّک یادگار سمجھی جاتی ہے۔ جس مکان میں یہ تبرّک محفوظ ہے، وہ "درگاہ" کے نام سے موسوم ہے۔ محرّم کی پانچویں تاریخ کو وہاں بڑے جلوس کے ساتھ تمام لکھنؤ کے علم چڑھتے ہیں۔ ایوانِ شاہی سے "درگاہ" پورے پانچ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس کی عمارت بہت شاندار ہے۔ عمارت کے وسط میں ایک چبوترہ ہے جس کے چاروں طرف چھوٹے بڑے علم استادہ ہیں جن کے پٹکوں اور پھریروں پر نہایت نفیس معرکے بنے ہوئے ہیں۔ چبوترے کے بیچوں بیچ وہ علم نصب ہے جس نے مکان کو زیارت گاہ بنا رکھا ہے۔

پانچویں تاریخ کو تمام باشندگانِ لکھنؤ چھوٹے چھوٹے عَلَم ہاتھوں میں لئے سیاہ لباس پہنے جُوق در جُوق درگاہ کی طرف جاتے نظر آتے ہیں، شاہی امام باڑے سے جو علم درگاہ کو جاتے ہیں اُن کے جلوس کا جاہ وحشم قابلِ دید ہوتا ہے۔ اس جلوس میں سب سے آگے چھ سات ہاتھی ہوتے ہیں جن پر زر تار جھولیں اور پاکھریں پڑی ہوتی ہیں، نُقرئی اور طلائی ہودے اور عماریاں کسی ہوتی ہیں اور نقرئی گھنٹے اور ہیکلیں لٹکتی رہتی ہیں۔ ان کے سوار اپنے ہاتھوں میں زر تار عَلَم لئے ہوتے ہیں۔ ہاتھیوں کے پیچھے فوج کا ایک دستہ ہوتا ہے۔ اُس کے بعد مرثیہ خوانوں کی جماعت کے ساتھ ایک شخص جو خاص طور پر مغموم معلوم ہوتا ہے، ایک بڑا سیاہ عَلَم لئے ہوئے چلتا ہے جس کے سرے پر ایک اُلٹی کمان میں دو ننگی تلواریں لٹکتی رہتی ہیں۔ اس کے پیچھے خود بادشاہ اپنے مصاحبین اور عزیز واقارب کے حلقے میں چلتے ہیں جن کے ساتھ کچھ زعمائے ملّت اور علمائے مقرب بھی ہوتے ہیں۔ ان کے پیچھے دُلدُل کی سواری رہتی ہے۔ یہ ایک سفید عربی گھوڑا ہوتا ہے جو صرف اسی مقصد کے لئے سدھایا جاتا ہے۔ اس کی ٹانگیں اور پہلو سرخ رنگے ہوئے اور بدن پر جو چادر ہوتی ہے اس میں تیر نصب کئے ہوتے ہیں۔ یہ گویا اُس اذیت ومُصیبت کی یادگار ہے جو اصل گھوڑے اور اُس کے سوار پر گذری ہے۔ گھوڑے کی پُشت پر ایک سُنہرا زین کسا ہوتا ہے جو اُس کے نقرئی رنگ پر بہت زیب دیتا ہے۔

دُلدُل کا ساز ویراق سب ٹھوس سونے کا ہوتا ہے اور اُس کی زین پر ایک عربی عمامہ، ایک کمان اور تیروں سے بھرا ہوا ترکش بندھا ہوتا ہے۔ اُس کے ہمراہ چند خادم زرق برق لباس پہنے، ہاتھوں میں مگس رانی کے لئے چنور لئے ہوتے ہیں۔ دُلدُل کے بعد فوج کے پیدل اور سوار دستوں اور تماشائیوں کا ایک ہجوم ہوتا ہے۔

عَلَم چڑھانے کا یہ طریقہ ہے کہ پہلے تمام عَلَم ایک دروازے سے داخل ہوتے ہیں اور درگاہ کے مخصوص عَلَم کے سامنے لاکر اُس سے مَس کر دیئے جاتے ہیں۔ پھر دُوسرے دروازے سے واپس ہو جاتے ہیں۔ دن بھر یہی سلسلہ رہتا ہے اور خلقت کا انبوہ اِس رُسم کو ادا

کرنے کے لئے برابر آتا رہتا ہے۔ یہاں علم چڑھنے کی تعداد کا اندازہ اس سے کر لیجئے کہ جب میں لکھنؤ میں مقیم تھا تو ایک سال سُنا کہ اب کی بار پچاس ہزار علم "درگاہ" میں چڑھائے گئے ہیں۔

محرّم کی ساتویں تاریخ کو تقریبِ شادی کی یادگار میں ایک جلوس بڑے تزک و احتشام سے نکالا جاتا ہے جسے "مہندی" سے تعبیر کرتے ہیں۔ واقعاتِ کربلا کے ذیل میں ایک روایت یہ مشہور ہے کہ شبِ عاشور میں حضرتِ امام حسینؑ نے اپنی عزیز بیٹی فاطمہ کبریٰ کی شادی اپنے بھتیجے حضرتِ قاسمؑ کے ساتھ کر دی تھی۔ یہ مہندی اُسی تقریبِ شادی کی یادگار ہوتی ہے۔ اس میں شادی دسترت کے بڑے بڑے سامان جمع کئے جاتے ہیں۔ عزیزوں کی مہندیاں عموماً اُمرائے شہر کے امام باڑوں میں اور وزیرِ اعظم کی "مہندی" شاہی امام باڑے میں چڑھتی ہے۔ ان عظیم الشان مہندیوں کی آمد کے سبب ساتویں تاریخ کو تمام امام باڑے غیر معمولی طور پر سجائے جاتے ہیں اور ان میں خصوصیت کے ساتھ روشنی کا انتظام ہوتا ہے۔ جب روشنی اور سجاوٹ کا کام مکمل ہو جاتا ہے تو سرِ شام ہی سے ہجومِ خلائق بے روک ٹوک امام باڑوں کی رونق دیکھنے کے لئے آنے لگتا ہے۔ اس ہجوم میں سے کچھ لوگ تو رنگا رنگ جھاڑ فانوس کی ضیاباریاں دیکھنے لگتے ہیں جن میں سینکڑوں شمعیں روشن ہوتی ہیں (کیونکہ مجھے خوب یاد ہے کہ جب میں نے ایک مرتبہ شمار کیا تھا تو ایک جھاڑ میں سَو کنول لگے ہوئے نِکلے تھے) اور بعض لوگ امام کے مزارِ پُر انوار کی آرائش و زیبائش دیکھنے میں محو ہو جاتے ہیں۔ مزارِ مُبارک کے سامنے ایک طرف تو ایک بڑے شیر کی شبیہہ رکھی ہوتی ہے اور دوسری طرف دو مچھلیاں جن کے سَر باہم ملے ہوئے اور ایک دوسرے کی طرف جھکے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہاں ایک سمت طلائی و نقرئی علموں کے جوا ہر نگار پٹکے ہوا میں لہلہاتے ہیں جن کے نزدیک دُرِ کعبہ، قبۂ مبارک، خیمہ و خرگاہِ حسینؑ وغیرہ کی چاندی کی شبیہیں اور واقعۂ کربلا کے نقرئی نقشے ایک چاندی کی میز پر رکھے ہوتے ہیں جنہیں دیکھ کر رقیق القلب حضرات پر رقت طاری ہو جاتی ہے۔ دوسری سمت دیواروں

میں طرح طرح کے نفیس و نادر اور عجیب ساخت کے ہتھیار لٹکے ہوتے ہیں جن کے دیکھنے سے جنگ آزما لوگوں کے دلوں میں ولولہ پیدا ہوتا ہے۔ جب باہر سے توپوں کی آواز سُنائی دیتی ہے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ اب جلوسِ شادی کے تحت امام باڑے کے نزدیک آ گئے۔ اس آواز کے سُنتے ہی شاہی نقیب اور چوبدار امام باڑے اور اُس کے راستے سے عوام کو ہٹانے کے لئے آ جاتے ہیں اور اُنہیں باہر نکال کر اُس طرف کا پھاٹک بند کر دیتے ہیں۔ اُس وقت امام باڑے میں ایک سناٹا ہوتا ہے اور باہر کا مربع صحن جس میں ہر طرف روشنی ہوتی ہے چشم منتظر بنا نظر آتا ہے۔ بالآخر مہندی کا جلوس داخل ہوتا ہے جس کے ہاتھی، اُونٹ اور گھوڑے تو پھاٹک کے باہر چھوڑ دیئے جاتے ہیں لیکن سپاہی، جلوس بردار اور باجے والے سب امام باڑے کے صحن میں آ جاتے ہیں۔ اُن کی وجہ سے ایسا مجمع ہو جاتا ہے کہ تِل رکھنے کی جگہ باقی نہیں رہتی اور تمام پچہ کاری کا فرش نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ یہ لوگ داہنے بائیں پرا جما کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور بیچ میں راستہ چھوڑ دیتے ہیں جس پر سے مہندی کا سامان آنا شروع ہوتا ہے۔ اوّل نقرئی کشتیوں میں مٹھائیاں، خشک میوے اور پھولوں کے ہار ہوتے ہیں۔ پھر مسہری اور کچھ گلدستے جنہیں زرق برق لباس پہنے ہوئے ملازمین اپنے ہاتھوں اور سروں پر لئے ہوتے ہیں۔ اس سامان کے اندر پہنچتے ہی نہایت عمدہ آتشبازی چھوٹنے لگتی ہے۔ اس کے پیچھے پیچھے دُلہن کی نقرئی پالکی ہوتی ہے جس پر سے روپے اور چاندی کے دُوسرے سکے نچھاور ہوتے جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی کچھ چمکدار وردی والے مشعلچی ہوتے ہیں اور مشعلوں کی روشنی میں قرنا اور نفیری بجاتے والوں کی چوکیاں ہوتی ہیں۔ یہ تمام تبرکات مزارِ مُبارک کے قریب رکھ دیئے جاتے ہیں۔ ابھی یہ تمام سامان اچھی طرح امام باڑے میں پہنچنے بھی نہیں پاتا کہ عزاداروں کی ایک جماعت جس کے سر جھکے ہوئے، چہرے اُترے ہوئے اور لباس ماتمی ہوتا ہے امام باڑے میں داخل ہوتی ہے۔ چونکہ حضرت قاسمؑ کی شادی اور شہادت ایک ہی دن واقع ہوئی تھی اس لئے سامانِ عروسی کے دوش بدوش سامانِ غم بھی ہوتا ہے۔ اب چند

خادم حضرت قاسمؑ کا تابوت کندھوں پر اُٹھا کر لاتے ہیں جن کے ساتھ ایک جماعت ماتم کناں ہوتی ہے۔ کبھی تابوت کے ہمراہ ایک گھوڑا بھی ہوتا ہے جس پر حضرت قاسمؑ کا زرہ بکتر، عمامہ، کمان، خنجر اور تیروں سے بھرا ہوا ترکش بھی ہوتا ہے۔ گھوڑے پر چتر کا سایہ ہوتا ہے جو نشانِ شاہی سمجھا جاتا ہے۔ گھوڑا امام باڑے کے دالان میں اس شان و شوکت اور شائستگی کے ساتھ مزارِ مقدس کا طواف کرتا ہے کہ جی چاہتا ہے بس دیکھا ہی کرے۔ طواف کے بعد گھوڑے کو مزار کے بازو کھڑا کر دیا جاتا ہے اور اُس پر سونے چاندی کے پھول نچھاور کیے جاتے ہیں۔ اس رسم کے خاتمے پر امام باڑے میں مجلسِ عزا منعقد ہوتی ہے۔

یہ سب رسمیں امامِ مظلوم کی شہادت تک کے واقعات پیش کرتی ہیں۔ ابھی اُن کا جنازہ اُٹھنے کے اور تجہیز و تکفین ہونے کی رسوم باقی ہیں۔ جنازہ اُٹھنے میں بھی بہت کچھ اہتمام کیا جاتا ہے۔ ضریحِ مبارک کی نقل منگا کر ذی مقدور خاندانوں نے بہت پہلے سے کچھ کربلائیں شہر کے باہر تعمیر کرا رکھی ہیں۔ مخلوق کے بے شمار گروہ کچھ برائے تماشہ اور کچھ بعض مذہبی رسوم کی ادائی کے ارادے سے علی الصباح وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ ان لوگوں کے ساتھ دفن کرنے اور کھانے پینے کا بہت سا سامان ہوتا ہے۔ اب مختلف حلقوں میں تعزیے کربلا کی سمت جانے شروع ہو جاتے ہیں۔ چونکہ امام حسینؑ کی شہادت میں فوجی حیثیت غالب تھی اس لئے ہر طرح سے کوشش کی جاتی ہے کہ ان رسوم میں فوجی شان اور جنگی آن بان قائم رہے۔ چنانچہ جلوس میں سب سے آگے کچھ بیرقیں ہوتی ہیں جن کے پرچم ہواؤں میں لہراتے ہیں، باجا ہوتا ہے جو رزمیہ انداز سے بجتا ہے، کچھ ہتھیار بند ہوتے ہیں جو بندوقیں اور پستولیں داغتے، ڈھالیں ہلاتے اور تلواریں چمکاتے چلتے ہیں۔ اِس سب سامان کو دیکھ کر میدانِ جنگ کا تصوّر قائم ہو جاتا ہے۔ اُمرا کے تعزیوں کے پیچھے عزیبوں کے تعزیے بھی ہوتے ہیں۔ ان تعزیوں کے ہر جلوس کا قرینہ قریب قریب ایک ہی ہوتا ہے یعنی سب سے پہلے ہاتھیوں کے اُوپر کچھ علم ہوتے ہیں جن کو ہودج میں بیٹھے ہوئے سوار پکڑے رہتے ہیں۔ اِن عَلَموں کے سِروں پر

پنجے اور پنجوں کے نیچے لانبے پٹکے لگے ہوئے ہیں۔ اگر کسی کو اپنا تعزیہ دھوم سے اُٹھانا مقصود ہوتا ہے تو اُس کے جلوس میں بجائے ایک دو کے پانچ چھ ہاتھیوں پر علَم ہوتے ہیں ہاتھیوں کے پیچھے باجے والوں کی متعدد چوکیاں ہوتی ہیں جو نوحوں کی دُھنیں بجاتی ہوئیں چلتی ہیں۔ اِن کے بعد ایک شخص لانبی چھڑ میں اُلٹی کمان لگائے ہوتا ہے۔ اُس کمان کے دونوں سروں پر دو ننگی شمشیریں آویزاں ہوتی ہیں۔ وزن کی زیادتی کی وجہ سے اس شخص کو کچھ دوسرے لوگ سنبھالے ہوتے ہیں۔ اِن کے پیچھے دُلدُل کی سواری ہوتی ہے جس کے دائیں بائیں دو آدمی لگام تھامے ہوئے، چار اشخاص چنور ہلاتے ہوئے، ایک افسر نشانِ شاہی یعنی آفتابہ لیے آگے آگے اور ایک شخص چتر لگائے ہوئے اُس کے ساتھ چلتا ہے۔ دُلدُل کے زین پر سنہری کام کا بیش بہا عمامہ، تلوار، پرتلا، کمان، ترکش اور دیگر اسلحہ ہوتے ہیں۔ گھوڑے کے پیچھے اکثر صاحبِ عزا بحیثیت سرگروہ ماتم داران ہوتا ہے۔ پھر کچھ لوگ نقرئی و طلائی انگیٹھیاں لئے ہوتے ہیں جن میں چاندی کے توڑے پڑے رہتے ہیں اور اندر لوبان سُلگتا رہتا ہے۔ صاحبِ عزا اور اُس کے احباب کے ہمراہ مرثیہ خوانوں کی ایک جماعت ہوتی ہے۔ یہ سب ننگے سر ننگے پاؤں اور غمگین صورت میں ہوتے ہیں۔ اکثر ان کے سروں پر گرد یا بھوسا بھی پڑا رہتا ہے۔ ان کے پیچھے ضریح ہوتی ہے جس کے اوپر سبز مخمل کا کارچوبی شامیانہ تنا رہتا ہے۔ یہ ضریح بانسوں پر رکھی ہوتی ہے اور کچھ لوگ اسے اپنے کاندھوں پر اُٹھائے ہوتے ہیں۔ پھر اس کے بعد حضرت قاسمؑ کا تابوت اور حضرت کبریٰؑ کی بند پالکی اور اس کے ساتھ تحائف اور سامانِ عروسی کی بہت سی کشتیاں ہوتی ہیں۔ سب سے آخر میں اونٹوں اور ہاتھیوں پر امام تشنہ کام کے رفقاء کا جنگی سامان اس طرح بار دکھایا جاتا ہے جیسے اُنہوں نے مدینے سے کربلا کا سفر کرتے وقت بار کیا ہوگا۔ کچھ اُونٹوں یا ہاتھیوں پر غلّہ، روٹی اور روپے پیسے وغیرہ رہتے ہیں جن پر معتبر آدمیوں کا تقرر ہوتا ہے۔ عام طور پر ہر طبقے کے لوگ بلا امتیازِ مذہب و ملّت اس خیرات کے کم سے کم حصے کو بے حد اعتقاد کے ساتھ بدقّت حاصل کرتے ہیں۔ مسلمان عورتوں کے عقیدے کے

مطابق یہ روٹی جو تعزیے کے ساتھ ہوتی ہے ایک تبرّک سمجھی جاتی ہے۔ چونکہ شہر کے مختلف راستوں سے یہ تعزیے برابر گزرتے رہتے ہیں اس وجہ سے تمام گلی کوچے، توپ، بندوق اور پستول کی صداؤں اور حسن حسینؑ کی آوازوں سے گونجتے رہتے ہیں۔ جب تعزیے کربلا پہنچ جاتے ہیں تو انہیں معمولی طور پر دفن کر دیا جاتا ہے۔" [۱]

فنون

فنِ تعمیر ایچ۔ جی۔ کین (H. G. Keene) لکھنؤ کے فنِ تعمیر پر رائے زنی کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "اس شہر کی عمارات کو آگرہ، دلی اور دکن کے کھنڈر دیکھنے سے قبل دیکھنا چاہیئے۔ جب یہ عمارات وجود میں آئی تھیں تو ہندوستانی فنِ تعمیر بہت انحطاط پذیر تھا۔ ہندو صناع اپنی پُر تحمل محنت اور قدیم موروثی تصورات کے ساتھ نظرانداز ہو گئے تھے۔ پتھر آسانی سے دستیاب نہ تھا اس لئے اینٹ اور چونے کا پلاستر استعمال کرنا پڑتا تھا۔ کم علم یورپی انجینئر اندازِ تعمیر کی تجویز و تکمیل کرتے تھے۔ لیکن بایں ہمہ یہ بات تسلیم کرنی پڑے گی کہ یہ عمارات اپنی بے جا انفرادیت کے داغ سے خواہ کتنی ہی بدنما کیوں نہ ہوں لیکن نہ صرف ان کی زبردست وسعت و کشادگی بلکہ کثرت بھی اپنے بیش قیمت ہونے کا اظہار کرتی ہے۔ مغربی تفصیلات کو مشرقی مقاصد سے امتزاج دینے کی کوشش چاہے ہمیشہ کامیاب نہ رہے لیکن ہر وقت ایک اتفاقیہ اثر پیدا کرنے کی صلاحیت ضرور رکھتی ہے جو معنی خیز بھی ہے اور ایک امتزاجی لطافت سے بھی خالی نہیں ہے۔" [۲]

کین کی یہ رائے سعادت علی خان کے زمانے سے بننے والی عمارتوں پر تو صادق آسکتی ہے لیکن آصف الدولہ کی عمارات بالخصوص امام باڑہ، اُس کے متصل مسجدِ آصفی اور رومی دروازے کے لئے کسی طرح مناسب نہیں معلوم ہوتی۔ اگرچہ اودھ میں عمارتی پتھر نایاب تھا

اور تمام عمارت اینٹ اور چونے سے تیار کرائی پڑتی تھی۔ لیکن ان عمارات کی کشادگی، پائداری دل ربا عظمت اور شکوہ نے انہیں دُنیا کی بارعب عمارتوں میں شمار کئے جانے کے قابل بنا دیا ہے۔ آصف الدولہ کی یہ عمارات ذاتی ضروریات کے بجائے عام مفاد کے پیش نظر بنائی گئی تھیں۔ اِس لئے اِن میں پائداری اور عظمت و شکوہ کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ یہ یورپی اثرات سے بالکل بیگانہ ہیں۔ اِن کا نقشہ کفایت اللہ نے تیار کیا تھا جو دہلی کا رہنے والا تھا۔ یہ بات درست ہے کہ یہ عمارات مُغلیہ عہد کی پُر شکوہ تعمیرات کا مقابلہ نہیں کر سکتیں لیکن پھر بھی اپنے پیمانے کی وسعت اور صلابت کے اعتبار سے ایشیائی ہیں۔ اِن میں خوشنمائی اور شان و شوکت کے علاوہ فنِ تعمیر کا کمال بھی نظر آتا ہے جو یقیناً قابلِ ستائش ہے۔ عاشور خانۂ آصفی کی لداؤ کی چھت اپنے طول و عرض اور وسعت و کشادگی کے لحاظ سے بے مثل ہے۔ اتنی وسیع چھت اس اسلوبِ ساخت کے ساتھ شاید ہی دُنیا میں کہیں مِل سکے گی۔ اِس کی بھُول بھلیّاں اور تہ خانے بھی ایسے نادر ہیں کہ جن کا مثل آگرہ اور دہلی میں بھی کہیں موجود نہیں ہے۔ آصف الدولہ کی بنوائی ہوئی اِن تینوں عمارتوں کی مضبوطی بھی یقیناً قابلِ تعریف ہے۔ برسہا برس کی کس مپرسی کے علاوہ غدر کے زمانے میں امام باڑہ اور رومی دروازہ انگریزی افواج کا مرکز بنے رہے اور بڑی بے دردی سے ان کو استعمال کیا گیا لیکن اِس کے باوجود آج تک جب کہ اِن کو بنے ہوئے ڈیڑھ سو سال سے زائد ہو چکے ہیں، کوئی اینٹ بھی اپنی جگہ سے نہیں سَرکی۔

نواب آصف الدولہ کے بعد اَودھ کے فنِ تعمیر کا مذاق بالکل بدل گیا تھا اور اب وہ زمانہ شروع ہو گیا تھا کہ جب یورپی اندازِ تعمیر کی تقلید میں عمارتیں بلحاظِ صلابت کمزور اور بلحاظِ ضرورت مفید تر بنائی جانے لگی تھیں۔ اس تبدیلیٔ مذاق و انداز کا ذمہ دار اَودھ میں دوعملی حکومت، سعادت علی خاں کی جزرسی، اور انگریزی اثرات کی افراط کو ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ سب سے پہلے تو نواب نے جنرل مارٹین کی کوٹھی کو جسے اب چھتر منزل کہتے ہیں پچاس ہزار روپے میں خرید کر اُس کا نام فرح بخش رکھا۔ پھر ٹیڑھی کوٹھی شہزادہ سلیمان شکوہ سے لے لی اور دلآرام، دِلکشا، حیات بخش

وغیرہ کوٹھیاں اور لال بارہ دری، خورشید منزل، اور منور بخش وغیرہ عمارتیں خود تعمیر کرائیں۔ ان سب میں قدیم ہندوستانی وضع ترک کرکے یورپ کے اندازِ تعمیر کی تقلید کی گئی تھی۔ اس کوشش امتزاج رنگ میں نہ یہ عمارات ہندوستانی ہیں اور نہ خالص یورپی۔ بلکہ ان میں دونوں خصوصیات کا ایک ملا جلا انداز پیدا ہوگیا جو اپنی کمزوریوں کے باوجود حسن و زیبائش سے خالی نہیں ہے۔

ہندوستانی اور یورپی مذاقِ تعمیر کے امتزاج کا ایک اور دلکش نمونہ کونسٹین شیا (کوٹھی جنرل مارٹین) ہے جس کی وسعت بے تکان ہے اور جس کے بعض حصص کو دیکھ کر نائٹین کو مارسلیز کے باغات یاد آگئے تھے۔ اس عمارت کے صحن اور فوارے یورپی انداز پر بنائے گئے ہیں لیکن گنبد اور مناروں میں ایشائی وضع قائم رکھی گئی ہے کمروں میں فرانسیسی سٹائل موجود ہے لیکن برآمدے اور دریچے قطعی ہندوستانی رنگِ تعمیر میں ڈھلے ہوئے ہیں۔

غازی الدین حیدر نے فرح بخش کی عمارت گرا کر اس کی بنیادوں پر چھتر منزل تعمیر کرائی تھی۔ علاوہ ازیں اس عہد میں مبارک منزل، شاہ منزل، ولائتی محل، شاہِ نجف اور مقابر سعادت علی خان و مرشد زادی تعمیر ہوئے۔ ان میں سے سکنائی عمارات میں تو اسی مغربی طرز کا غلبہ ہے چنانچہ اگر چھتر منزل کے دروازوں کی محرابیں اور سنہری چھتریاں الگ کردی جائیں تو اس پر ہندوستانی عمارت ہونے کا اطلاق مشکل ہی سے ہوسکے گا۔ لیکن شاہِ نجف اور مقابرِ مذکورہ کی تعمیر میں مذہبی احساس نے مغربی انداز کی بدعت شامل نہیں ہونے دی۔ ان میں سے مذکور الصدر عمارت جو حضرت علیؑ کے مزارِ مقدس کی نقل بتائی جاتی ہے، ۱۲۳۲ھ ۱۸۱۶-۱۷ء میں تیار ہوئی تھی۔ اس کا گنبد مسطح ہے اور اس میں بہت معمولی فنِ تعمیر صرف کیا گیا ہے، لیکن بہ حیثیت مجموعی یہ عمارت یقیناً شاندار ہے۔ اس کی تفصیل مسز سید حسن علی نے ۱۸۲۵ء کے واقعات کے ذیل میں اس طرح بیان کی ہے :-

"امام باڑے کے بیرونی صحن میں داخلہ ایک خوشنما پھاٹک کے ذریعے ہوتا ہے جو خشت اور مسالے سے بنایا گیا ہے اور جس پر استرکاری کرکے ایسی جلا کردی گئی ہے کہ وہ بعینہٖ

سنگِ مرمر کا معلوم ہوتا ہے۔ پھاٹک کے برابر ہر طرف اور دونوں بازوؤں میں آفت زدگان وخانماں برباد غریب غربا کے قیام کے لئے مختلف درجے بنے ہوئے ہیں جن کی پچھلی دیواریں امام باڑے کی حد بندی کرتی ہیں۔ اصل روضہ پھاٹک ہی سے نظر آجاتا ہے اور چوکور عمارت معلوم ہوتی ہے جس پر گنبدی چھت بنی ہوئی ہے۔ روضہ کے اندر سنگِ سیاہ اور سنگِ مرمر کے چوکونے شطرنجی فرش بنائے گئے ہیں اور اندرونی جانب دیواروں اور قبہ میں نفیس منبّت کام (یعنی اُبھرے ہوئے گل بوٹے) بناکر اُس کو مُطلّا کردیا ہے۔ عمارت کے بیرونی جانب بھی گنبددار کارنسوں (Cornice) پر نہایت خوشنما مُنبّت کاری کی گئی ہے۔ اور اُس پر بھی سونے کے پانی کی تحریریں موجود ہیں۔ گنبد کی چوٹی کی آرائش ایک بڑے سائز کے تاج سے کی گئی ہے جو خالص چاندی کا بنا ہوا ہے لیکن اُس پر سونے کا ملمع کردیا گیا ہے۔" [1]

نصیرالدین حیدر نے جو عمارات بھی تعمیر کرائی تھیں اُن میں خالص ذاتی ضرورت مدِ نظر رکھی تھی۔ عام مفادات کی تسکین کو ملحوظ رکھ کر کوئی عمارت اُن کے عہد میں نہ بن سکی۔ "اردونگر" کی کربلا کا مقصدِ تعمیر بھی اپنی آخری آرام گاہ کی حیثیت سے تھا اور یہ بھی ادھوری ہی رہ گئی۔ سابقہ عمارتوں میں سے چھتر منزل میں شاہی بیگمات، قیصر پسند میں اُن کی منظورِ نظر خواتین، شاہ منزل میں اُن کے جانور اور فرحت بخش، حضور باغ، چھہٹ، نواب گنج وغیرہ عمارات اُن کی ذاتی سکونت کے لئے مخصوص تھیں۔ اس عہد میں جو چند کوٹھیاں تعمیر ہوئی تھیں وہ بھی یورپی ذوق ہی کی تسکین کرسکتی تھیں۔ اور انہیں بادشاہ نے اپنے نجی استعمال کے لئے ہی بنوایا تھا۔ ان میں سے "تارا والی کوٹھی" جو اب امپیریل بنک کے استعمال میں ہے، اُس میں بہت دنوں تک شاہی رصدگاہ قائم رہی۔

محمد علی شاہ کے عہد سے فنِ تعمیر میں پھر ایک تبدیلی نظر آتی ہے چنانچہ حسین آباد، جامع مسجد اور ست کھنڈا وغیرہ میں حسن وزیبائی کا زیادہ خیال رکھا ہے اور انگریزی انداز کی سادگی اور احساسِ ضرورت کو تعمیر کی جمالیت پر قربان کردیا ہے۔ اِن کی نقش کاریاں انگریزی اصلیت پسندی

کے بجائے لکھنوی نزاکت و تخئیلیت کی آئینہ دار ہیں۔ محمد علی شاہ نے جس جامع مسجد کی بُنیاد ڈالی تھی اُس کے مقصدِ تعمیر ہیں یہ بات بھی ملحوظ رکھی تھی کہ یہ اپنی شان و شوکت میں مسجدِ آصفی سے بڑھ جائے لیکن اس کے بانی کی حیات نے وفانہ کی اور پھر اس کی تکمیل اُن کی بیگم یعنی ملکہ جہان نے کرائی۔ اس کے ساتھ ایک امام باڑہ بھی تعمیر کرایا جارہا تھا جو مکمل نہ ہو سکا۔ اس مسجد کی گلکاریوں کی تفصیل، ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ تصدق حسین نے اپنے ایک مقالے میں اس طرح بیان کی ہے:۔

مسجد کے اندرونی جانب آگے پیچھے دو عریض و طویل دالان ہیں جن کی چھتوں کو کئی حصوں میں تقسیم کر کے قالب دار بنایا گیا ہے۔ پیش امام کے کھڑے ہونے کی محراب کے دونوں جانب بارہ اماموں کے اسمائے مقدس منقوش ہیں اور کل دروں کے اوپر اور چھتوں میں ایسی نفیس اور دل آویز مُنبّت گلکاری کی گئی ہے جو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ الفاظ اس کی خوبصورتی کو بیان کرنے سے قاصر ہیں۔ کہیں پر انگور کی بیلیں بنی ہیں، کوئی چھت پھانکوں دار خربوزے کے مثل بنائی گئی ہے۔ کسی چھت میں پلیٹیں بنائی گئی ہیں جن کے مُتن میں بہت نفیس کام بنایا گیا ہے۔ اگلے دالان کی چھت میں ایک قاب بنا کر اُس کے کنارے کنارے لیمو، نارنگی، شریفے، آم، خربوزے، اناس و انگور وغیرہ کے پھلوں اور شاخوں کے گلدستے اصل سے بالکل مُشابہ کر کے بنائے گئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ مسجد اپنی صنّاعی و خوشنمائی کے لحاظ سے مسجدِ آصفی پر فوق لے گئی ہے اور اس کے رنگوں کے تال میل، گُل بوٹوں اور گلکاریوں کی دلفریبی اور سحر کاری کے آگے مسجدِ آصفی بالکل نہیں جچتی۔[۲]

واجد علی شاہی عہد کے مذاقِ تعمیر کا سب سے نمایاں نمونہ قیصر باغ ہے جس کے پیمانے کی وسعت میں ایشیائی رُوح موجود ہے لیکن تعمیر میں تخئیلیت کے بجائے ضرورت اور سادگی کا پہلو نمایاں رکھا گیا ہے۔ یہ سلسلۂ عمارات ۱۸۴۸ء میں شروع کیا گیا تھا اور ۱۸۵۰ء میں اس کی تکمیل ہوئی تھی۔ اِس پر اسّی لاکھ روپے صرف ہوئے تھے۔ یہ ایک وسیع ترین صحن کے گرد مستطیل نما

دومنزلی عمارتوں کا سلسلہ تھا جس میں پتھر کے بجائے پلاسٹر استعمال ہوا تھا۔ کین (Keene) کا خیال ہے کہ "اس عمارت میں اطالوی اور افریقی (Moorish) طرزِ تعمیر کا امتزاج اس انداز سے ہوا ہے کہ بجائے لطافت کے ایک امتزاجی کیفیت زیادہ واضح رہتی ہے؛ عمارتی عظمت کے اعتبار سے قیصر باغ کا دروازہ بھی جس کی تصویر لکھنؤ البم میں موجود ہے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس تمام عمارت کو اگر مقصدِ تعمیر کے پیشِ نظر دیکھا جائے تو اب بھی مفید اور دلچسپ نظر آتی ہے، اگرچہ اس کے وہ بہترین حصے جو چینی بازار کے اندر واقع تھے اور جہاں خود بادشاہ رہتے تھے کھنڈر ہو چکے ہیں لیکن یہ عمارت آج بھی زبانِ حال سے کہہ رہی ہے کہ اسے جانِ عالم نے اپنی منظورِ نظر خواتین کی سکونت کے لئے تعمیر کیا تھا۔

مصوّری

سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے ساتھ ساتھ ہندوستانی مصوری کا بھی انحطاط شروع ہوگیا تھا۔ شاہجہان کے بعد اوّل تو اچھے مصوّر ہی پیدا نہ ہوسکے اور جو کچھ رہے سہے موجود تھے وہ دورِ انحطاط میں اِدھر اُدھر منتشر ہوگئے تھے۔ ان خانماں بربادوں میں سے کچھ ماہرین دربارِ فیض آباد کے حصے میں بھی آگئے تھے جنہوں نے اودھ آرٹ کی بنیاد ڈالی تھی۔ بعض کتابوں سے اُن کے کمالات کے نمونوں کا پتہ چلتا ہے لیکن وہ اگلے نوابوں کے محلات کی رونق بڑھا کر ایسے لاپتا ہوگئے کہ اب اُن کا سُراغ لگانا بہت مشکل ہے۔ بہرحال اودھ کے قدیم مصوّر انہیں فن کاروں کے شاگرد تھے جو تصاویر میں سفیدے اور سونے کا کام بہت لطافت کے ساتھ کرتے تھے۔ سلطنتِ اودھ چونکہ ہوش سنبھالتے ہی انگریزی سیاست کی برتری کے نیچے دب گئی تھی اس لئے یورپی مصوّروں کو اُس کے دربار میں خاص مقام حاصل رہا۔ آصف الدولہ کے عہد میں زوفنی سب سے پہلا یورپی مصوّر تھا جو اس دربار سے وابستہ ہوا تھا۔ زوفنی نے آصف الدولہ، کلاڈ مارٹین (Claud Martin) اور بعض دوسرے اُمراء کی شبیہیں بنائی تھیں جن میں سے مارٹین کی اصلی تصویر کلکتہ "مارٹینیر" میں اب تک موجود ہے۔ زوفنی کی دو تصویریں جو یورپ تک مشہور ہیں اور جن کی نقلیں اب بھی کہیں کہیں نظر آجاتی ہیں، اُن میں سے ایک میں "مرزا حیدر بیگ کا بہ سلسلۂ سفارت لارڈ کارنوالس کے پاس جانا ہے اور دوسری تصویر "مرغ بازی" سے متعلق ہے۔ مؤخر الذکر تصویر کو مسٹر پارکس نے ۱۴ر جنوری ۱۸۳۱ء کو شاہی محل میں دیکھا تھا۔ اس تصویر کی رنگین پلیٹ پر ایک نقل

امیر الدولہ لائبریری، لکھنؤ میں اب بھی موجود ہے۔

زوفینی کے بعد سعادت علی خان نے مسٹر ہوم کو مدراس سے بُلا کر ایک ہزار روپے ماہوار پر ملازم رکھا تھا۔ یہ بھی ایک لاجواب شبیہہ نگار تھا جس کی توصیف بشپ ہیبر نے ان الفاظ میں کی ہے:۔

"وہ شاہِ اودھ کے لئے حقیقت میں ایک بہترین فن کار ہے جو لندن کے ایک معروف سرجن کا بھائی اور ایک شریف و متین ضعیف شخص ہے۔ وہ لارڈ کارنوالس کے ابتدائے عہد میں شبیہہ نگاری کی مشق کے لئے مدراس چلا گیا تھا۔ اُسے سعادت علی خاں نے اپنے مرنے سے کچھ زمانہ پیشتر لکھنؤ بُلا لیا تھا اور تب ہی سے بادشاہ نے اُسے ایک مقررہ مشاہرے پر یہاں روک لیا ہے۔ تنخواہ کے علاوہ اُسے اپنے نجی کاروبار سے بھی کچھ آمدنی ہو جاتی ہے۔ اُس کا مذاق نہایت سُتھرا، مصوّری بہت نفیس اور مُو قلم نہایت تیز رفتار ہے۔" [۱]

مسٹر ہوم اگرچہ مناظر کی تصاویر بہت کم بناتے تھے اور اُن کا زیادہ تر کام شبیہہ نگاری سے متعلق تھا لیکن سلیمین نے اپنی یادداشت میں اُن کی ایک تصویر کا ذکر کیا ہے جس میں ایک شکار گاہ کا منظر پیش کیا تھا۔ اُس میں سعادت علی خان کے عقب میں راجہ بختاور سنگھ شکار کھیلنے کے انداز سے کھڑے ہوئے تھے۔ مسٹر ہوم کی ایک اور تصویر جس میں سعادت علی خان کو لپے قدمیں پیش کیا تھا زیادہ مشہور ہے۔

مسٹر ہوم کے ایک صاحبزادے جو اسی نام سے مشہور تھے کمپنی کی فوج میں ملازم تھے لیکن اُنہیں مصوّری میں بھی کمال حاصل تھا۔ غازی الدین حیدر نے اُنہیں لکھنؤ بلا کر اپنے مصاحبین میں داخل کر لیا تھا۔ وہ بھی شبیہہ نگاری کے ماہر تھے چنانچہ اُنہوں نے غازی الدین حیدر اور اُن کے متوسلین کی بہت سی تصویریں یادگار چھوڑی تھیں۔ مسز رابرٹس نے اپنی کتاب "سین اینڈ کیریکٹر آف ہندوستان" میں ان باپ بیٹوں کی مصوّری کی بہت ستائش کی ہے۔

نصیر الدین حیدر کے عہد میں بھی ایک مشہور جرمن مصوّر "چارلس مانٹر" دربارِ اودھ میں ملازم تھا جس کا ذکر نائٹین نے ایک مصاحب بادشاہ کی حیثیت سے کیا ہے۔ وہ مصوّری اور

نواگری دونوں قسم کی خدمات انجام دیتا تھا۔ اُس نے بادشاہ اور اُمرائے شاہی کی بعض تصاویر بنائی تھیں لیکن اُس کی ایک تصویر بعنوان "مشرقی حُسن" جس میں ایک فرضی بیگم کی خیالی تصویر کھینچی گئی تھی زیادہ مشہور ہوئی۔ آخری تاجدارِ اَودھ کے عہد میں "بیچی" ایک یورپین مصوّر موجود تھا۔ اُس نے بھی ایک بیگم کی خیالی تصویر بنائی تھی جو ۱۸۵۱ء میں لندن کی ایک نمائش میں بہت پسند کی گئی تھی۔

اس تفصیل سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ آصف الدولہ سے واجد علی شاہ تک اَودھ کی مصوری میں ایک نہ ایک یورپین مصوّر کا ہاتھ ضرور شامل رہا ہے۔ قیاس کہتا ہے کہ ان لوگوں کی موجودگی نے ہندوستانی مصوری کو ضرور متاثر کیا ہوگا۔ لیکن آج ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے مصوروں میں اُس تاثر کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔ اس کی پہلی وجہ تو یہ ہے شاید مُلکی اور غیر مُلکی زبانوں اور ماحول کا فرق انہیں ایک دوسرے سے قریب نہ لا سکا۔ دوسرے اُس زمانے کے یورپی لوگ اپنا ہُنر دیسی لوگوں کو سکھانے میں خاصے بخیل واقع ہوئے تھے۔ علاوہ ازیں ان یورپی لوگوں کی تصویریں صرف دربارِ شاہی تک ہی محدود رہتی تھیں اور عام لوگ ان کے کمالات کے نظارے سے محروم رہتے تھے۔ اس لئے ہندوستانی مصوری میں یورپین انداز کا امتزاج نہ پیدا ہو سکا تھا۔ ہمارے مصوّر ہی دہلی، جے پور اور کانگڑہ اندازِ فن کی تصویریں پیش کرتے رہے۔ جن میں سونا چڑھانے، سفیدہ بھرنے اور رنگ دینے کے کمالات موجود تھے۔ اَودھ کا معروف مصوّر ٹھاکر داس تھا جو روغنی اور آبی تصاویر کے علاوہ ہندوستانی روایات کی تمثیلی تصویریں بنانے کا بھی ماہر تھا۔ اُس نے راگ اور راگنیوں کی بھی تصویریں بنائی تھیں جو غازی الدین حیدر کے عہد میں بہت مقبول تھیں۔ بعض کتابوں میں اس کے کمال کی دلیل میں ایک یہ روایت بھی بیان کی گئی ہے کہ ایک مرتبہ کسی رزیڈینٹ نے غازی الدین حیدر سے ہندوستانی مصوری کی تحقیر کی جسے سُن کر بادشاہ نے ٹھاکر داس کو حکم دیا کہ ایک سرکاری نوٹ کی ہوبہو نقل بنائے۔ ٹھاکر داس نہ انگریزی جانتا تھا اور نہ مشین سے کام کرتا تھا لیکن اُس نے ایسی مکمل نقل پیش کی کہ رزیڈینٹ بھی نقلی نوٹ

کر اصلی میں شناخت کرنے پر مجبور ہوا اور بادشاہ نے مسکرا کر اس جعلی نوٹ کو پھاڑ کر جلا دیا۔ ٹھاکر داس کے علاوہ محمد علی" مانی رقم" نے بھی لکھنؤ میں بڑا عروج پایا تھا۔ اس نے محمد علی شاہ کے دربارِ تخت نشینی کی جو تصویر کھینچی تھی، اس نے بہت شہرت حاصل کی تھی۔ "یہ مصور پرواز کے گھٹاؤ بڑھاؤ اور اندھیرے اُجالے کے امتیازات دکھانے میں بہت کمال رکھتا تھا۔" مانی رقم کے بیٹے فضل علی معروف بہ بہزاد رقم نے واجد علی شاہ کے عہد میں مقبولیت حاصل کی تھی۔ چنانچہ وہ بھی شاہی دربار سے وابستہ ہو گیا تھا۔ اس نے خاندانِ شاہی، بعض محلات اور زنانہ مناظر کی بہت سی لاجواب تصاویر بنائی تھیں۔" بہزاد رقم کے علاوہ بیچو بیگ، صاحب رائے، کاظم حسین خان، درگا پرشاد، کاشی رام اور میر محمد علی بھی اودھ کے قابلِ ذکر مصور ہوئے ہیں جن کے نادرات اب بھی کبھی کبھی دیکھنے میں آجاتے ہیں۔ میر محمد علی نے میر انیس کی ایک مجلس کی تصویر بھی بنائی تھی اس تصویر میں میر انیس کے ہاتھ میں جو مرثیہ ہے اُس پر یہ مصرعہ بھی نظر آتا ہے۔ ع

برہم ہے مرقع چمنستانِ جہاں کا

اودھ کی مصوری کے نمونے یا اُن کی نقلیں لکھنؤ میوزیم، شاہ نجف، امیر الدولہ لائبریری اور بعض تعلقہ دارانِ اودھ کے مکانوں میں نظر آجاتی ہیں جنہیں دیکھ کر اس عہد کے موضوعاتِ تصویر اور اسلوبِ قلمکاری کا بہت کچھ اندازہ ہو جاتا ہے۔ اِن تصاویر میں پس منظر کے طور پر آسمان اور اس پر رنگ رنگ کی بدلیاں دکھائی جاتی تھیں۔ عموماً کسی پرندے کی پرواز کا اہتمام بھی ہوتا تھا، زمین پر ایک برجیوں دار دیوار پھولوں سے مزین رکھی جاتی تھی۔ تصاویر کے عام موضوعات بادشاہ اور امرائے دولت کی شبیہیں، شاہی عمارات کے نقشے، جلسہ و جلوس، محلات اور دربار کے مناظر، کسی امیر کے خانگی مشاغل، رقص و سرود کی محفلیں، ساون کی بہاریں، میدانِ جنگ کے سین، گھمسان کی لڑائیاں، سیر و شکار کی دلچسپیاں، جنگلات میں جانوروں کے جھرمٹ وغیرہ ہوتے تھے۔ یہ تصویریں کاغذ اور کرمیچ یعنی ولائتی ٹاٹ کے علاوہ شیشہ، ابرق، اخروٹ، ہاتھی دانت اور ظروف پر بھی بنائی جاتی تھیں۔ ایسی ہی ایک تصویر کے متعلق نائیٹن لکھتا ہے کہ:-

• بڑے کمرے میں ایک میز پر پورا نمونہ محلاتِ شاہی کا بنا ہوا رکھا تھا جس میں پورے محل کے ہر ہر جزو کا نہایت باریک بینی اور دیدہ ریزی کے ساتھ چربہ اتارا گیا تھا اور رنگ ایسے ٹھیک دیئے گئے تھے کہ گویا ہو بہو تصویر کھینچ دی تھی ۔ یہ بات تو ہندوستانی فنکاروں کا حصہ ہے ۔ اسی نقشے میں اس بارہ دری کی نقل جو ایک اخروٹ سے بڑی نہ تھی اس خوبی سے اُتاری تھی کہ اس کی جزئی سجاوٹ تفصیل وار مع کمروں کے دکھائی گئی تھی ۔ کوئی چیز چھوڑی نہ تھی ۔ [۱]

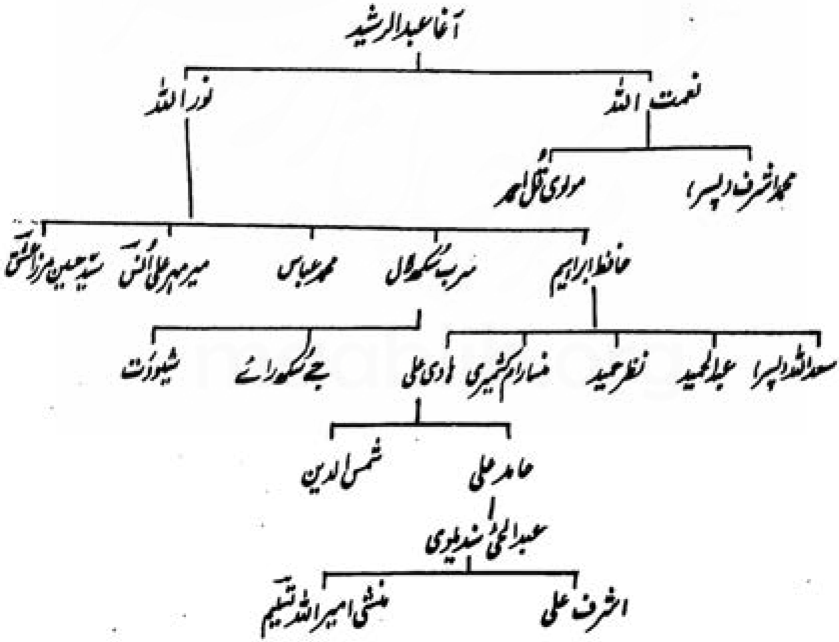
فوٹوگرافی بھی اگرچہ مصوری ہی کے شعبے سے تعلق رکھتی ہے لیکن کیمرے کی آئینہ داری کو وہ درجہ حاصل نہیں ہے جو موقلم کی صناعی اور دیدہ ریزی کو حاصل ہے ۔ بہر حال واجد علی شاہ کے ایامِ سلطنت میں ایک فوجی انگریز کے ذریعہ سے یہ فن بھی لکھنؤ پہنچ گیا تھا ۔ اس ذیل میں سب سے پہلے چھوٹے خان نے قیصر باغ اور حسین آباد کی تصویریں بنا کر شہرت پائی تھی پھر مشکور الدولہ اور آخر میں داروغہ عباس علی نے اس میں نام پیدا کیا ۔ عباس علی کی تین مصوّر کتابیں قابلِ ذکر ہیں جن میں اُن کی فوٹوگرافی کا کمال محفوظ ہے ۔ پہلی کتاب " لکھنؤ البم " ہے جس میں یہاں کی پچاس مخصوص عمارات کی تصاویر مع تشریح دی گئی ہیں ۔ دوسری کتاب " حسینانِ لکھنؤ " کے نام سے شائع ہوئی تھی جس میں چوک نشینوں کے پچاس فوٹو موجود ہیں اور آخری کتاب چار سو تعلقہ دارانِ اودھ کی تصاویر پر مشتمل ہے ۔

خطاطی

ابوالفضل نے آئینِ اکبری میں لکھا ہے کہ تصویر کشی بہترین قسم کی خطاطی ہے اس لئے مصوری کے ساتھ اِس کا ذکر بھی ضروری ہے ۔ اوّلین عہدِ مُغلیہ میں خطاطی نے ہندوستان میں بڑی ترقی کی تھی جس کی تفصیل آئینِ اکبری میں موجود ہے ۔ یہ سلسلۂ فن دِلّی کے زوال تک پوری آب و تاب کے ساتھ چلتا رہا ۔ اُس کے بعد اودھ میں بھی بہت سے نامور خطاط پیدا ہوئے جو عموماً آغا عبدالرشید دَیلمی کے دبستان سے تعلق رکھتے تھے ۔ آغا عبدالرشید جو خود نستعلیق کے بڑے ماہر تھے وہ میر عماد الحسنی کے بھانجے اور شاگرد تھے ۔ محمد شاہ کے عہد میں ایران سے

لاہور آکر مقیم ہو گئے تھے اور یہیں سے اُنہوں نے سیکڑوں شاگرد بنا کر اقصائے ہند میں پھیلا دیئے تھے۔ اُن کے دبستان کے تین ماہر خطاط یعنی حافظ نور اللہ، قاضی نعمت اللہ اور عباد اللہ بیگ لکھنؤ کے حصے میں بھی آئے تھے لیکن ان لوگوں کی آمد کا زمانہ آصف الدولہ کا عہد ہے اور اودھ شجاع الدولہ کے وقت ہی میں کئی لاجواب خطاط پیدا کر چکا تھا۔ چنانچہ جواہر علی خاں (خواجہ سرا) کے متوسلین میں محمد خلیل ایک کامل خوشنویس فیض آباد میں مقیم تھا جو بقولِ فیض بخش اٹھارہ ۱۸ مختلف خطوط میں لکھ سکتا تھا۔ خُدا نے اُسے اپنی انگشت پر وہ قدرت عطا کی تھی کہ جب وہ ماضی و حال کے ماہرین مثل میر علی، امیر عماد، حداد اور یاقوت رقم خاں وغیرہ کا خط دیکھتا تھا تو اُس کی نقل اس کمال کے ساتھ پیش کر دیتا تھا کہ ماہرین بھی اصل و نقل میں تمیز کرنے سے قاصر رہ جاتے تھے۔ محمد خلیل کے شاگرد تھوڑی سی محنت کے بعد اپنے زمانے کے لاجواب فن کار ہو گئے تھے [1]

محمد خلیل کے متعلق ابھی تک یہ تحقیق نہیں ہو سکی کہ وہ خطاطی کے کس دبستان سے تعلق رکھتا تھا لیکن اودھ کی ابتدائی خوش نویسی میں اُس کا مقام بہت بلند تھا۔ اُس کے بعد لکھنؤ میں آغا رشید کے شاگردوں کا سلسلہ شروع ہوا جس کی تفصیل یہ ہے:



آغا عبدالرشید کے شاگردوں میں سے نعمت اللہ شاہزادوں کے خط کی اصلاح پر متعین تھے اور نور اللہ درباری ضروریات کی تکمیل کرتے تھے۔ اُس وقت لکھنؤ میں تصویر کی پُشت پر سنہری بیل اور مداخل کے ساتھ ساتھ قطعات لکھنے کا خاص رواج تھا جو عموماً وَصلی کی افشانی زمین پر ہوتا تھا۔ چنانچہ آصف الدولہ کے عہد کی بعض تصویروں میں ان ماہرین کے لکھے ہوئے قطعات موجود تھے جو اب بڑی حد تک ناپید ہیں۔ لیکن بعض شائقینِ فن کے پاس ان لوگوں کے خط کے نمونے اور ان کے لکھے ہوئے بعض قطعے اب بھی مل جاتے ہیں چنانچہ ہم نے نعمت اللہ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی مفردات کی ایک تختی شیخ ممتاز حسین جونپوری کے پاس دیکھی تھی اور نور اللہ کے خط کا نمونہ تو مسجدِ آصفی کے کنویں اور درمیانے دروازے کی پیشانی پر لکھے ہوئے قطعات کی صورت میں اب بھی موجود ہے۔

نور اللہ کے شاگردوں میں حافظ ابراہیم، محمد عباس، مُنشی سرب سُکھ، میر اُنس اور میر عشق نے اپنے حُسنِ رقم کے لحاظ سے بہت نام پیدا کیا تھا۔ چنانچہ ان حضرات کے لکھے ہوئے قطعات اور مراثی کو ہندوستان بھر میں حُسنِ تحریر کی وجہ سے شہرت حاصل ہوئی تھی۔ حافظ ابراہیم نے محتشم کاشی کا جز مرثیہ لکھ کر ۱۲۳۵ھ ہجری میں معتمدالدولہ مختار الملک نواب سید محمد کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ وہ شیخ ممتاز حسین کے پاس اب بھی موجود ہے۔ اس کے ایک صفحہ کی نقل سید اسرار حسین کی کتاب "ہنر مندانِ اودھ" میں بھی شامل ہے۔

قاضی نعمت اللہ نے بھی دو مخصوص شاگرد مولوی محمد اشرف اور مولوی تل احمد چھوڑے تھے جو لکھنؤ میں بہت مقبول ہوئے تھے۔ لیکن ان خوشنویسوں کے علاوہ منشی کالکا پرشاد نحیف اور منشی کالکا پرشاد مرجد دو ہندو خطاط بھی مشہور ہوئے تھے۔ مُنشی کالکا پرشاد نحیف کے فن نے آصف الدولہ سے محمد علی شاہ تک کا زمانہ پایا تھا۔ انہیں نواب سعادت علی خاں نے اپنا میر منشی مقرر کر دیا تھا۔ اس عہدہ پر یہ غازی الدین حیدر کی تخت نشینی سے دو سال بعد تک متعین رہے۔ ان کی تحریریں اب بھی لکھنؤ میں کہیں کہیں نظر آجاتی ہیں۔ عہدِ واجدی میں

جو خوشنویس شاہی خطابات سے سرفراز ہوئے وہ جواہر رقم خاں، یاقوت رقم خاں، اور گوہر رقم خاں وغیرہ تھے۔ ان شاہی متوسلین کے علاوہ اور بھی درجنوں خوشنویس لکھنؤ اور اس کے قرب و جوار میں پیدا ہوئے۔ اُن میں سے مشہور مسلمان خطّاط تو حافظ ابوالحسن، میر کرم علی، حافظ مسعود، عنایت اللہ، میر امام علی، میر جلال الدین، حکیم محمد حسین، میر زین العابدین، میر مہدی، شاہ وارث علی، محمد مُراد، محمد صالح، محمد مومن، شرف الدین، میر سیّد علی، مرزا جعفر، محمد اکبر، محمد موسیٰ، لال خان، مرزا احمد طباطبائی، روشن الدولہ وزیر، غلام علی، مرزا حاتم بیگ، علامہ تفضل حسین خاں، تجمل حسین خاں پسر تفضل حسین خاں، حیات علی، غلام مجتبیٰ، امام الدین، ابوالبرکات خاں، اور رونق علی وغیرہ تھے۔ ان کے علاوہ ہندو حضرات میں کنور پریم کشور، راجہ آنندرام، لچھمن سنگھ، پنڈت لچھمی نرائن، رائے سُدھ رائے، شنکر ناتھ اور راجہ اُمید سنگھ وغیرہ نے شہرت پائی۔ ان سب ماہرین کے دم سے لکھنؤ میں خوشنویسی کا ایسا مذاق پیدا ہو گیا تھا کہ جب اس شہر میں لیتھو کا کام شروع ہوا تو یہاں خوشنویسوں کی کوئی کمی نہ تھی لیکن اعلیٰ خطّاط چونکہ کتابت کو اپنے کسرِ شان خیال کرتے تھے اس لئے وہ مطابع کے پاس نہیں گئے۔ اور صرف قطعات لکھ کر دربار اور اس کے اُمراء کی نوازشوں ہی کو وسیلۂ معاش بنائے رہے البتہ نو عمر و نو مشق مُبتدیوں نے اِس بارِ کتابت کو سنبھالا اور خوب سنبھالا۔

نستعلیق کے ساتھ یہاں خطِ نسخ کے بھی بعض ماہرین پیدا ہوئے۔ محمد خلیل جن کا تذکرہ ہم اُوپر کر چکے ہیں نسخ میں بھی اعلیٰ پایہ رکھتے تھے اور اس شعبہ میں اُن کا خط، یاقوت رقم اور حداد کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ ان کے بعد منشی ہادی علی جو طغرا نگاری میں کمال رکھتے تھے دِلّی سے ترکِ سکونت کر کے یہاں آ بسے تھے۔ انہیں کے ہمعصر میر بندہ علی مرتعش تھے جو رعشۂ دست کے باوجود اس فن میں نظیر نہیں رکھتے تھے۔

عروجِ دِلّی کی قدیم خوشنویسی کے مقابلے میں لکھنؤ کی خطاطی کو کوئی خاص مقام حاصل نہیں تھا اور بقول مولانا شرر "نسخ کے جیسے جیسے باکمال دولتِ مغلیہ سے پہلے ہندوستان میں گذر

پیچھے ہیں۔ اُن کے عشرِ عشیر درجے کو بھی یہ لوگ نہیں پا سکتے بلکہ نسخ کا کمال ان دنوں مٹ چکا تھا۔ نستعلیق کے متعلق اس قدر البتہ کہا جا سکتا ہے کہ حافظ نور اللہ اور حافظ ابراہیم کے ہاتھ کے قطعات جس ذوق و شوق سے سارے ہندوستان میں مقبول ہوئے اور کسی خوش نویس کے شاید نہ ہو سکے ہوں گے۔" [۱] اس پر اتنا اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ اس فن کے جاننے والے اور دستگاہ رکھنے والے جتنی بڑی تعداد میں لکھنؤ میں موجود تھے اُتنے اُس وقت ہندوستان کے کسی اور شہر میں نہیں تھے۔ اس کے علاوہ اُس عہد کی لکھنوی روشِ خطاطی میں دلّی سے یہ فرق نمایاں نظر آتا تھا کہ دلّی کے خوشنویس عام طور پر تحریر کے حُسن اور زیبائش کا زیادہ خیال رکھتے تھے اس لئے اُن کی تحریر ہر شخص کو خوبصورت نظر آتی تھی لیکن اس کے برخلاف لکھنؤ والے فن کی پابندیوں کو زیادہ ملحوظ رکھتے تھے۔ چنانچہ اُن کی تحریر فن کے جاننے والوں کے لئے تو مرغوب و مستحسن ہوتی تھی لیکن ایک عامی کی نگاہ کو اُس میں وہ امتیازی دیدہ زیبی اور جاذبیت نظر نہ آتی تھی جو دلّی والوں کی خطاطی میں موجود تھی۔

موسیقی

موسیقی کا شوق بھی شاہانِ اودھ میں شجاع الدولہ ہی کے وقت سے چلا آرہا ہے چنانچہ ہم تاریخ میں دیکھتے ہیں کہ شجاع نے منیر الدولہ کی دعوت کے موقع پر جو جلسے کئے تھے اُن میں رقص و موسیقی کا خاص اہتمام کیا گیا تھا۔ اسی طرح جنگِ رُہیلہ کی فتح کے بعد بھی شجاع الدولہ کے خیام میں رقص و موسیقی کی محفلیں منعقد کی گئی تھیں اور اربابِ نشاط پر ہزاروں روپے صرف کئے گئے تھے۔ ایک معاصر کا بیان ہے کہ شجاع الدولہ موسیقی کے شوقین ہونے کے علاوہ خود بھی اس فن کے بہت بڑے ماہر تھے۔ اس لئے اُن کے عہد میں نغمہ نوازی ترقی پر تھی اور ہندوستان بھر کے مُطرب و رقاص فیض آباد میں جمع ہو گئے تھے جن میں تان سین کے دبستانِ موسیقی کے ماہرین بھی شامل تھے۔ ان باہر سے آنے والوں کے علاوہ اجودھیا، بنارس اور جون پور کے وہ فنکار بھی تھے جو اسی علاقے کی حدودِ سلطنت میں پیدا ہوئے تھے، اور کلاسکی رقص و موسیقی میں کمال رکھتے تھے۔ اِن سب کے باہمی ربط اور اتصال اور اشتراک

سے اودھ میں موسیقی کی ایک نئی شان اور تازگی پیدا ہوگئی تھی جو آصف الدولہ کے عہد میں کچھ اور زیادہ عروج پاگئی تھی چنانچہ انہیں نواب وزیر کی ہمت افزائی کی وجہ سے فنِ موسیقی کی وہ لاجواب کتاب تصنیف ہوئی جو "اصول النغمات الآصفیہ" کہلاتی ہے۔ اس زمانہ میں نواب سالار جنگ علمِ موسیقی کے ماہر سمجھے جاتے تھے اور اُن کے علاوہ بعض طوائفوں مثلاً بڑی مصری منّد رجان، نجبن، سلار، کریم بخش، رادھا اور مِتھو وغیرہ بھی گانے میں طاق سمجھی جاتی تھیں۔ [۱] فرمانروایانِ سابق کی طرح سعادت علی خان بھی سرود و نغمہ کے شائق تھے۔ کہتے ہیں کہ وہ جس کمرے میں کاغذات ملاحظہ فرماتے تھے اُس میں ایک طرف طوائفوں اور رقاصوں کی چوکی بھی ہوتی تھی۔ چنانچہ جب نواب ملاحظۂ کاغذات سے اُکتا جاتے تھے تو رقص و موسیقی کے ملاحظے سے اپنے دل و دماغ کو تازہ کر لیتے تھے۔ اُنہوں نے پرکاش نامی ایک باکمال شخص کو جو بقول نجم الغنی لکھنؤ میں اپنے فن والوں سے گوئے سبقت لے گیا تھا وہ تماشے اور کوڑی پر رقص کرتا تھا اور کوئی دقیقہ علمِ موسیقی کا اُس سے فروگذاشت نہیں ہوتا تھا [۲] نواب نے بیش قرار تنخواہ پر اُسے ملازم رکھ لیا تھا۔ غازی الدین حیدر کے عہد میں اس فن نے اور بھی زیادہ ترقی کی تھی۔ اس زمانے میں لکھنؤ میں ایک زبردست موسیقی دان حیدری خان کے فن نے بہت شہرت پائی تھی۔ اُس کے علاوہ رجب علی اور فضل علی ڈُو درباری قوّال اور سہرو بائی طوائف (جو دکن سے آکر شاہی ملازمین میں شامل ہوگئی تھی) اس فن کے ماہر تھے۔ چھجّو خان اور غلام رسول خان ڈو اور قوّالوں نے بھی اس عہد میں بڑا نام پیدا کیا تھا اور "شوری" بھی جسے ٹپّے کا موجد مانا گیا ہے وہ بھی اسی زمانے میں مشہور ہوا تھا۔ نصیر الدین حیدر کا عہد شروع ہوا تو یہ زمانہ بھی اس فن کے ماہرین سے خالی نہ رہا اور خود جہاں پناہ اس کا اتنا شوق رکھتے تھے کہ ہر روز رات کے کھانے کے بعد جو جلسے اور تماشے منعقد ہوتے تھے۔ اُن میں نغمہ و سرود کو خصوصیت کے ساتھ جگہ دی جاتی تھی۔ بادشاہ موصوف مُغنّیوں کے یہاں تک قدردان تھے کہ بقول نائٹین ایک کشمیری گائن کو پہلی رات کو گانے کی تقریب میں ایک ہزار روپے انعام دیا اور دوسری رات کو دو ہزار روپے عنایت

فرمائے۔ نصیر الدین حیدر کے بعد محمد علی شاہ اور امجد علی شاہ کے تقدس اور ثقاہت کی وجہ سے فنِ موسیقی کو دربار میں بار نہیں مل سکا تھا لیکن ولیعہد بہادر مرزا واجد علی اس فن کی سرپرستی فرماتے رہے تھے۔ واجد علی شاہ نے اپنے درباری مغنی قطب علی خان کے متعلق تاریخ پری خانہ میں لکھا ہے کہ "وہ فنِ موسیقی اس قدر جانتا تھا کہ نائک بیجو، نائک گوپال اور تان سین وقت تھا۔ میں نے ستار بازی میں اپنا اُستاد مقرر کیا اور اُس سے یہ فن اس قدر حاصل کیا کہ محفلیں اور مجلسیں حیران ہو گئیں۔ ہنسنے میں لوگ رو دیتے اور رونے میں ہنس دیتے تھے:" اس کے بعد آگے چل کر وہ نتھو خان، غلام نبی، گھمن اور غلام حیدر کے متعلق لکھتے ہیں کہ "انہوں نے مجرا کرنا اور سرود بجانا شروع کیا اور چلمن کے پیچھے میں ستار بجانے میں مشغول تھا۔ واقعی اُس وقت ایسا سماں بندھا کہ در و دیوار، انجم و ماہ متحیر تھے۔ اُن کا گانا اس قدر پُر تاثیر تھا کہ میں نے اپنا منہ چلمن پر رکھ دیا۔" [۱] ان فن کاروں کے علاوہ ثابت علی اور چھجو "دو مشہور سازندے چھوٹے خان طبلہ باز اور غلام رضا، محمد حسن خان، حیدر علی، نثار علی، اور خواجہ بخش خاں بھی ولیعہد کے ملازم تھے۔ واجد علی شاہ کے عہد میں دربار کے باہر بھی بڑے بڑے باکمال موسیقی دان موجود تھے جن میں پیار خاں، جعفر خاں، حیدر خاں، باسط خاں اور محمد علی خاں تو خاص تان سین کے خاندان ہی سے تھے۔ ان میں سے پیار خاں درباری گویّوں یعنی انیس الدولہ اور مصاحب الدولہ کا اُستاد تھا اور باسط خاں نے واجد علی شاہ کو علمِ موسیقی سکھایا گیا تھا۔ واجد علی شاہ نے علمِ موسیقی کو شوق اور ریاضت کے ساتھ سیکھا تھا اور انہیں اس فن میں بقول پروفیسر اسد اللہ خان کو کب اساتذہ کا درجہ حاصل تھا [۲] اُنہوں نے علمِ موسیقی پر تین کتابیں "ناجو" "بنی" اور "دُلہن" تصنیف کی تھیں جن میں سے بنی زیادہ مشہور ہے۔ یہ کتاب مطبع سُلطانی مٹیا بُرج سے شائع ہوئی تھی۔ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی نے اپنے ایک طویل مقالے میں اس کتاب کی تفصیلات دی ہیں [۳] اس کتاب کے پہلے باب کا نام "راگ مالا" ہے جو متعدد فصلوں میں منقسم ہے۔ ہر ایک فصل میں کسی ایک راگ کی تفصیل یعنی اُس راگ کا نام، خواص، بول اور گانے کا وقت وغیرہ دیا ہے۔ اس میں راگ اور

راگنیوں کے جو بول دیئے ہیں وہ خود بادشاہ کی تصنیف سے ہیں۔ ان بولوں کے علاوہ بھی واجد علی شاہ نے بہت سی ٹھمریاں اور دادرے تصنیف کئے تھے اور بقول سید اسرار حسین وہی شاعر جو مثل بادشاہ کے موسیقی اور شاعری دونوں میں کمال رکھتا ہو ایسے دادرے اور ٹھمریاں کہہ سکتا ہے [۱] واجد علی شاہ کی توجہ سے لکھنؤ میں موسیقی کا بڑا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ وہ خود پری خانہ میں لکھتے ہیں کہ:

"بادشاہوں نے رسم قدیم کے موافق اپنے نظر کردوں کو ہر فن کی تعلیم دلائی ہے اور اُسے درجۂ کمال تک پہنچانے میں بہت کوشش کی ہے۔ منجملہ ان کے بادشاہ دہلی محمد شاہ اور ابراہیم عادل شاہ سلطانِ بیجاپور وغیرہ شاہانِ سلف نے اکثر جمیل و شکیل عورتوں کو علم موسیقی کی تعلیم دلوا کر گائن کے لفظ سے ملقب کیا ہے لہٰذا ما بدولت و اقبال نے سابقین کا پابند ہو کر اکثر زہرہ جبینانِ ماہ تمثال کو فنِ موسیقی کی تعلیم کا حکم دیا۔۔۔ بہت تھوڑے عرصہ میں ان پری پیکروں حور نژادوں نے اس فن میں ایسی مہارت پیدا کر لی کہ اگر اس فن کے اچھے جاننے والے مثلِ تان سین وغیرہ کے اس وقت ہوتے تو اپنے کئے کو ناکردہ سمجھتے۔ ایک روز چودہ تاریخ جب چاند درجۂ کمال پر تھا میں نے اس فن کے کاملوں کے حاضر ہونے کا حکم دیا جب محفل جمع ہو گئی تو ان سیم تنوں میں سے ہر ایک نے ناچ گا کر لوبی فلک کو سرشار کر دیا۔ کسی کی مجال نہ تھی جو ان مہوشوں کی کسی حرکت پر نکتہ چینی کرے یا کوئی سقم ظاہر کرے۔ ان سب میں خصوصاً سلطان پری نے اپنے کمال کا ایسا اظہار کیا کہ غش کی نوبت پہنچی۔ سب اہلِ کمال نے متفق ہو کر کہا کہ یہ علم موسیقی نہیں سحر سامری ہے۔" [۲]

لکھنؤ کی موسیقی میں واجد علی شاہ کے اثر سے تغزل کا عنصر زیادہ بڑھ گیا تھا اور ہلکی پھلکی چیزیں جن میں برہ اور جدائی کی کیفیات کا اظہار ہوتا تھا اور جو عورتوں کی آواز میں سحر کا کام کرتی تھیں زیادہ مقبول ہو گئیں تھیں۔ پروفیسر اسد اللہ خان کوکب کا خیال ہے کہ موسیقی کے مذاق میں تنزل محمد شاہ رنگیلے ہی کے عہد سے شروع ہو گیا تھا۔ جب کہ میاں سارنگ نے خیال کو تصنیف کیا تھا [۳]

ممکن ہے کہ لکھنؤ کے متعلق بھی کہا جائے کہ یہاں موسیقی اپنی کلاسکی گمبھیرتا کے مقابلے میں کم وزن رہ گئی تھی لیکن کلاسکی سنگیت چونکہ صرف شاہی درباروں میں موجود تھا اور عوام کی معاشرت سے اُسے کوئی تعلق نہ تھا اس لئے جب لکھنؤ میں موسیقی کے غنائی پہلو پر توجہ ہوئی اور اس طرح کے بول حسین عورتوں کی آوازوں میں سنائی دینے لگے ؎

گوری تیرے نینا کاجل بِن کارے

تو کلاسکی موسیقی کی اجنبیت کم ہوئی اور عوام نے محسوس کیا کہ ہم ایک ایسی چیز سُن رہے ہیں جو ہماری معاشرت سے قریب تر ہے۔ اس زمانہ میں بقول پروفیسر کوکب:۔

"کھماج، بھیرویں، سیندورا، تلک کامود، پیلو وغیرہ چھوٹی چھوٹی مزہ دار راگنیاں اہلِ مذاق کے تفنّن کے لئے منتخب کی گئیں اور یہی چیزیں بادشاہ کو بالطبع مرغوب تھیں۔ یہ راگنیاں لکھنؤ کی قدردان سوسائٹی کے مذاق میں یہاں تک سرایت کر گئیں کہ آج سارے ہندوستان میں لکھنؤ کے سفیدے خربوزوں کی طرح لکھنؤ کی بھیرویں بھی مشہور ہو گئی اور سچ یہ ہے کہ بھیرویں لکھنؤ ہی کا حصّہ ہے۔ ایسی بھیرویں ہندوستان کے کسی حصّے میں نہیں گائی جاتی۔ سوز خوانوں نے بھی انہیں عام پسند و عام فہم راگنیوں کو زیادہ رواج دیا جو مذہب کی سفارش سے گھر کی بیٹھنے والی عورتوں تک کے گلے میں اُتر گئیں، یہاں تک کہ اُن کی نوحہ خوانی سُن کر بڑے بڑے باکمال گویّے نقشِ حیرت بن گئے"۔ [۱]

غرض کہ درباری پسندیدگی کی وجہ سے موسیقی عوام میں اس قدر مقبول ہو گئی تھی کہ خاص خاص تقاریب تو خیر کبھی بھی نغمہ و سرود سے خالی نہ رہتی تھیں لیکن اکثر رؤسا کے یہاں روزانہ ہی ایسے مجرے ہوا کرتے تھے جو اُن کے اور اُن کے دوستوں کے تفننِ طبع کا کام دیتے تھے۔ اس عام چرچے کی وجہ سے لکھنؤ میں موسیقی کے ماہرین کی بڑی قدر تھی اور عوام میں بھی اس کا اتنا ذوق پیدا ہو گیا تھا کہ اودھ کے لوگ دُھنوں، راگنیوں اور راگوں کو خوب پہچانتے تھے اور اُن کے محاسن و معائب کا خاص شعور رکھتے تھے۔

مطابع مولانا عبدالحلیم شررؔ نے "مشرقی تمدن کا آخری نمونہ" میں لکھنؤ کے مطابع کے سلسلے میں لکھا ہے کہ بہ عہدِ غازی الدین حیدر آرسل نام ایک یورپین نے آکر لوگوں کو مطبع کا خیال دلایا اور جب اہلِ علم مشتاق ہوئے تو اُس نے پہلا مطبع لکھنؤ میں کھولا۔ اُس نے پریس اور تمام سامان یہیں تیار کر کے چھاپنا شروع کیا اور زاد المعاد، ہفت قلزم اور تاج اللغات (جو بہت سی جلدوں میں تھی) چھاپ کے پبلک کے سامنے پیش کیں۔ اُس سے سیکھ کے اور لوگوں نے بھی مطبعے جاری کرنا شروع کئے جن میں سب سے پہلا مطبع غالباً حاجی حرمین شریفین کا تھا [۱]

مولانا شررؔ نے یہ تفصیل ایک تو بغیر کسی ہمعصر شہادت کے حوالے کے بیان کی ہے اور دوسرے اس میں مطابع کی شاہی سرپرستی کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا حالانکہ یہ ابتدائی مطابع صرف بادشاہ ہی کی کوشش اور توجہ سے قائم ہوئے تھے۔ اس سلسلے میں ہمارے پاس ایک معتبر شہادت اسپرنگر کی موجود ہے۔ وہ شاہِ اودھ کے کتب خانوں کی فہرست کے دیباچہ میں لکھنؤ کے مطابع کے متعلق لکھتا ہے کہ:-

"غازی الدین حیدر نے صرفِ کثیر کے بعد فنِ طباعت (TYPOGRAPHY) کی بنیاد ڈالی۔ اس مطبع کی شائع کی ہوئی کتابوں میں سے "ہفت قلزم" نے تو ہندوستان سے کہیں زیادہ یورپ میں شہرت پائی۔ اس لُغت کے علاوہ مندرجہ ذیل کتابیں بھی لکھنؤ میں ٹائپ ہی کے حروف میں طبع ہوئی تھیں۔

۱.	المناقبِ حیدریہ	عربی زبان میں غازی الدین حیدر کی مدح مصنفہ احمد شیروانی (۱۲۳۶ھ)
۲.	محامدِ حیدری	فارسی نظم و نثر میں غازی الدین حیدر کی مدح مصنفہ اختر (۱۲۳۶ھ)
۳.	گلدستۂ محبت	فارسی نظم و نثر میں غازی الدین حیدر اور لارڈ ہیسٹنگز کی ملاقات کی تفصیل مؤلفہ اختر (۱۲۳۹ھ)

۴۔ پنج سُورہ کلام پاک کے پانچ سُورے جو وظیفہ کے طور پر بعد نماز پڑھے جاتے ہیں۔ یہ طُغرا کی طرز میں لکھے گئے تھے۔

۵۔ تاج اللغات ایک عربی لُغت جس کی تشریح فارسی زبان میں کی گئی ہے۔ یہ بڑے سائز کی سات جلدوں پر مشتمل ہے جن میں سے چار جلدیں ٹائپ کے حروف میں اور باقی تین لیتھو میں طبع ہوئی تھیں۔ [۱]

اسپرنگر آگے چل کر لکھتا ہے کہ "۱۸۳۰ء کے قریب مسٹر آرچر، جنہوں نے ایک لیتھو کا مطبع کانپور میں کھولا تھا، نصیر الدین حیدر کی طلب پر اپنے مطبع سمیت لکھنؤ آکر شاہی ملازم ہو گئے تھے۔ یہاں اُنہوں نے بہت سی کتابیں طبع کیں۔ لکھنؤ میں لیتھو کی سب سے پہلی مطبوعہ کتاب بہجۃ مرضیہ تھی جو "الفیہ" پر سیوطی کی تفسیر یا حاشیہ تھی [۲]

اس مطبع کے کُھلنے پر لکھنؤ میں طباعت کا چرچا عام ہو گیا اور پھر لکھنؤ کے لوگوں نے بھی بعض مطابع کھولے۔ چنانچہ جب اسپرنگر ۱۸۴۸ء میں لکھنؤ میں مقیم تھا تو اُس وقت یہاں لیتھو گرافی یعنی پتھر کے بارہ نجی ملکیت کے مطابع موجود تھے جن میں سے حاجی محمد حسین اور مصطفٰے خاں کے مطابع حُسنِ طباعت و اشاعت کے لحاظ سے بہت اچھے تھے۔ اسپرنگر کے دورانِ قیام تک لکھنؤ اور کانپور میں جو کتابیں طبع ہو چکی تھیں اُن کی تعداد تقریباً سات سو تھی۔ ان میں سے بعض بعض کتابوں کے دس سے زیادہ ایڈیشن چھپ چکے تھے۔ سب سے زیادہ مانگ اُن کتابوں کی تھی جو مدرسوں کے درسیات میں داخل تھیں۔ ان کے علاوہ منطق اور مذہب کے متعلق ایسے رسائل کی بھی عام طور پر ضرورت محسوس ہوتی ہے جنہیں مذہبی طبقے کے لوگ نہایت شوق سے پڑھتے تھے۔ اسپرنگر لکھتا ہے کہ ہم علامات محسوس کرتے ہیں کہ لکھنؤ کے یہ مطابع تعلیم و تعلّم کے دائرے کو وسیع کر رہے ہیں، اور اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ تمام طبقوں حتیٰ کہ عورتوں تک میں تعلیم بڑھ رہی ہے۔ طباعت کی ترقی کا سب سے اہم نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ رسائل اور سبک ادب کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے [۳]

کُتب خانے جب شجاع الدولہ کے عہد میں ہندوستان کے گوشے گوشے سے صاحبانِ کمال آ آکر فیض آباد میں جمع ہونے لگے اور یہ شہر علم و فن کا مرکز بن گیا تو شاہی کُتب خانے کی بھی بنیاد پڑی جس میں فتحِ روہیل کھنڈ (واقع ۱۱۸۸ھ) کے بعد ایک نمایاں اضافہ ہوگیا تھا جب کہ حافظ رحمت خاں کا کُتب خانہ بھی اس میں شامل کردیا گیا تھا۔ بالآخر آصف الدولہ کے عہد تک یہ کتب خانہ نادرات سے اس قدر پُر ہوگیا کہ کم از کم ہندوستان میں تو اس کا کوئی نظیر موجود نہ تھا چنانچہ آصفی کُتب خانے کے متعلق سیّد عبداللطیف شوستری کا بیان ہے کہ:۔

ستہ لک کتاب منتخب خوش خط پاکیزہ کہ بر ہر صد جلد یک کس گماشتہ بود در کتابخانہ او دیدم و اکثرے را برفاقتِ خاں بتدریج سیر کردم از اقسام فنون و اصنافِ علومِ عربی و فارسی و انگریزی بنظم و نثر و دیوان در آنجا بود و قطعاتِ زیبا بقلمِ خوشنویسانِ اولین و آخرین و تصاویرِ مصورانِ ہند و روم و فرنگ آنقدر داشت کہ بعضے از دیدنِ آنہا فراغ حاصل نمی شد۔ مجلداتِ بسیارے از کتبِ علمی بنظر در آمد چوں شرائع و مدارک و مسالک و مفاتیح و کشکول و بعض مجلداتِ بحار الانوار کہ ہمہ بخطِ مؤلفین بودند از کسی کہ کتاب خانۂ سلاطینِ تیموریہ بعد از تخریبِ سلطنت بدست او افتادہ اند و الحق آنچہ خزائن و دفائن و اسبابِ طلا و جواہر گرداشت معادلہ با عشرِ عشیرِ کتاب خانۂ او نمی کردند [1]

تین لاکھ کتابوں کا ذخیرہ آج بھی جب کہ طباعت کی تمام تر آسانیاں میسر ہیں شاید اچھے سے اچھے کُتب خانوں میں نہ مِل سکے اور اُس عہد میں تو واقعی ناممکن ہوگا جب کہ تمام کتابیں قلمی ہوتی تھیں جن کا ایک ایک نُسخہ مہینوں کی دیدہ ریزی کے بعد تیار ہوتا تھا۔ بہرحال اس مجموعۂ نوادر اور گلدستۂ عجائب میں ایک زبردست اضافہ غازی الدین حیدر کے عہد میں ہوا جو شاہانِ اودھ میں اپنے ذوقِ علم و کمال کے لحاظ سے بہت نمایاں حیثیت رکھتے تھے اور خود بھی صاحبِ تصنیف بادشاہ تھے چنانچہ اُن کی ہفت قلزم کے متعلق ہم اسپرنگر کی یہ رائے نقل کرچکے ہیں کہ اس کتاب کو یورپ میں بہت مقبولیت حاصل ہوئی تھی۔ غازی الدین حیدر کے بعد اُن کے صاحبزادے

کی مدہوشی نے اس لائبریری میں کوئی اضافہ نہیں کیا بلکہ شاید اُن کے عہد میں اس کتب خانے کے بعض نسخے گم بھی ہو گئے تھے۔ اُس وقت ایک یورپین مسٹر کرویلی مہتمم کتب خانہ تھا۔ مختصر یہ کہ کئی بادشاہوں کے اختیار و تصرف میں رہ کر جب یہ کتب خانہ واجد علی شاہ تک پہنچا تو اس کی شہرت و مقبولیت نے سرکارِ برطانیہ کو اس قدر للچایا کہ ۲۰ دسمبر ۱۸۴۸ء کو مسٹر اسپرنگر اس مقصد کے لئے متعین کئے گئے کہ وہ اودھ لائبریری کے فارسی، عربی اور اردو ذخائر کی ایک فہرست مرتب کریں۔ چنانچہ اُنہوں نے مشرقی علوم کے کئی ماہرین ملازم رکھ کر اس کام کو شروع کیا اور اٹھارہ ماہ کی مدت میں صرف دس ہزار کتب سے متعلق معلومات فراہم کیں۔ اُنہوں نے اپنی اس نامکمل فہرست کے دیباچہ میں شاہی کتب خانے کے متعلق جو دلچسپ معلومات جمع کی ہیں اُن کا خلاصہ یہ ہے کہ

لکھنؤ کی شاہی لائبریری پہلے "پرانے دولت خانے" میں تھی جو کبھی رومی دروازہ اور آئرن برج کے درمیان ایک مرتفع حصۂ زمین پر واقع تھا اور اب تقریباً برباد ہو چکا ہے۔ اس میں حافظ رحمت خاں کے تمام ادبی ذخائر موجود تھے اور بعد میں غازی الدین حیدر نے بھی اسے متعدد نادر کتب سے مالامال کر دیا تھا۔ بہ حالتِ موجودہ یہ کتب خانہ تین حصوں میں منقسم ہے۔ تین ہزار سے زائد گراں بہا ادبی کتابیں تو موتی محل کے خانہ باغ میں محفوظ ہیں اور تقریباً ایک ہزار نفیس ترین کتابیں فرح بخش پیلس کے نزدیک رکھی ہوئی ہیں۔ یہ مرحوم شاہِ اودھ (امجد علی شاہ) کا ذاتی کتب خانہ تھا۔ اس کا داروغہ دوسرے کتب خانوں کا بھی مہتمم اعلیٰ ہوتا ہے۔ جب میں لکھنؤ میں مقیم تھا تو اُن دونوں کتب خانوں کی کتابیں بڑے سلیقے کے ساتھ الماریوں میں لگی ہوئی تھیں۔ تیسرا ذخیرہ توپ خانے میں ہے جو برٹش ریزیڈینٹ کے مکان کے نزدیک واقع ہے۔ یہ توپ خانہ ایک وسیع عمارت پر مشتمل ہے جس میں ایک کشادہ حصہ بندوقوں سے معمور ہے۔ اس عمارت کی تین اطراف فوجی سامان کے لئے مخصوص ہیں اور شمالی بازو کے بالاخانے میں کتب خانہ ہے۔ یہاں پر تقریباً چالیس شکستہ صندوقوں کے اندر کتابیں بھری ہوئی ہیں۔ بڑے دالان کے سرے پر کچھ بورے اُن کرم خوردہ کتابوں کے رکھے ہیں جو دیمک وغیرہ کی نذر ہو گئی ہیں۔ ان میں بعض نسخے

کتابیں مثل تاج اللغات اور ہفت قلزم وغیرہ بھی برباد ہوگئی ہیں۔ اس ذخیرے کے مجلدات کی تعداد بہت زیادہ ہے جن میں بعض پشتو کی کتابیں بھی شامل ہیں۔ [۱]

اودھ کے شاہی کتب خانہ میں جتنی کتابیں اسپرنگر کی نظر سے گذری تھیں، اُن میں پانچسو تیرہ مجموعے فارسی شاعری کے اور ایک سو چوّن اُردو شاعری کے تھے۔ علاوہ ازیں چوالیس فارسی تذکروں اور اکیس[۲] ریختے کے تذکروں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اسپرنگر کتب خانے کے موجودہ منتظمین کی خوش اسلوبی اور دیانتداری کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ مجھے افسوس ہے کہ کتب خانے کا انتظام شروع ہی سے اِن لوگوں کے ہاتھ میں کیوں نہ ہوا ورنہ لائبریری کو اتنا نقصان نہ پہنچتا جس سے وہ دوچار ہو چکی ہے۔

یہ گراں قدر کتب خانہ جب انتزاع سلطنت کے بعد انگریزوں کے قبضہ میں آیا تو اس کی بیش قیمت کتابیں برطانیہ بھیج دی گئیں، جو غیر اہم کتابیں باقی رہ گئی تھیں وہ ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں میں منتشر یا برباد ہوگئیں۔ ان میں کی بعض کتابیں اب بھی کہیں کہیں دیکھنے میں آجاتی ہیں جو ہندوستان یا یورپ کے بعض کُتب خانوں میں محفوظ ہیں۔

رصدخانۂ سُلطانی

منتظم الدولہ حکیم مہدی علی خاں کی کوشش سے بعہد نصیر الدین حیدر شاہی رصد خانہ تیار ہوا تھا جو رمنۂ موتی محل میں واقع تھا اس کے مہتمم کپتان ہربرٹ اور سرگروہ طلباء مولوی اسمٰعیل مقرر ہوئے تھے۔ بقول کمال الدین حیدر ہندوستان میں ایسا رصد خانہ کہیں موجود نہ تھا[۲] کچھ عرصے بعد اس کا انتظام کرنل ولکاکس (Wilcox) کے ہاتھ میں آگیا تھا جو لیولپراڈ کے سفرِ لکھنؤ (۱۸۴۳ء) کے زمانے میں بھی اسی کام پر متعین تھے چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ:-

"شاہانِ اودھ کئی سال سے علم ہیئت کی سرپرستی کر رہے ہیں جس کا مقصد غالباً خالص علمی دلچسپی کے بجائے ذوقِ تجسس اور اختر شناسی ہے۔ یہ رصد خانہ شہر کے جنوبی سرے پر ایک باغ میں واقع ہے۔ اس کے ساتھ ایک کُتب خانہ اور کچھ ضروری آلاتِ ہیئت

بھی موجود ہیں اور ایک نئی دُوربین عنقریب نصب ہونے والی ہے۔ میجر ولکاکس (Wilcox) نے جو بہت سائینٹفک آدمی اور اس ادارے کے مہتمم ہیں ایک مقناطیسی رصدگاہ (Magnetic Observatory) سے آشنا کیا ہے۔ اس مہتمم کی نیابت و امداد کے لئے بہت سے ہندوستانی بھی موجود ہیں جو انگریزی مدارس کے تعلیم یافتہ ہیں۔ ان کی قابلیت اور صحتِ مشاہدہ وشمار کی جنرل موصوف بہت ستائش کرتے ہیں۔ موجودہ بادشاہ (امجد علی شاہ) ستاروں سے اپنے احوال دریافت کرنے کی اُمید میں اکثر اس رصدخانے کا معائنہ کرتے ہیں۔ اُنہوں نے میجر ولکاکس سے فرمائش کی ہے کہ وہ کوئی ایسی چیز ایجاد کریں جس کے ذریعہ سے محل کے سامنے رکھی جانے والی توپ روزانہ ٹھیک بارہ بجے چھوٹ جایا کرے۔" [۱]

کئی سال کی کوشش وکاوش کے بعد کتبِ مشاہداتِ کواکب تیار ہوگئی تھیں اور اُن کی اشاعت کے لئے خزانۂ شاہی سے سات ہزار روپے منظور ہوکر کرنل ولکاکس کو مل گئے تھے لیکن عین وقت پر کرنل نے انتقال کیا اور کرنل رچمنڈ رزیڈنیٹ نے حضرت سلطانِ عالم کے عہدِ دولت میں اس کے عملے کو برخاست کردیا۔ اور اٹھارہ اُنیس سال میں اس پر جو محنت اور دولت صرف ہوئی تھی اُس کا کچھ خیال نہ کیا [۲] رصدخانے کے آلات حفاظت سے رکھ دیئے گئے تھے لیکن جب ایامِ غدر میں مولوی احمد اللہ شاہ فیض آبادی نے جو "ڈنکا شاہ" کے نام سے معروف تھے اس کوٹھی کو اپنا مستقر بنایا تو اُس زمانے میں اِس کی دُوربینیں برباد ہوگئی تھیں۔

طب

جالینوس کے بعد طب یُونان میں زوال پذیر ہوگئی تھی۔ کیونکہ جسٹینین اوّل کے عہد میں دہریت کا الزام لگ جانے کی وجہ سے بہت سے حکمایونان سے ترکِ سکونت کرکے شام، مصر اور ایران آگئے تھے جہاں اُنہوں نے اپنی درسگاہیں قائم کرلی تھیں۔ ان کے توسط سے مشرقِ وسطیٰ میں یونانی طب کو فروغ حاصل ہوگیا تھا۔ پھر خلیفۂ منصور عباسی کے عہد میں طب کی مشہور کتابوں کا ترجمہ یونانی اور سریانی زبانوں سے عربی میں ہوا تھا۔ یحییٰ برمکی نے ایک جماعت ہندوستان بھی بھیجی تھی جس نے یہاں آکر ویدک سیکھی تھی۔ ان کے ساتھ آٹھ ہندوستانی وید بھی عباسی دربار

میں پہنچ گئے تھے جن کی امداد سے "چرک" اور "سوشرت" وغیرہ کے ترجمے بھی عربی زبان میں کر لئے گئے تھے۔ اس طرح اسلامی دربار میں یونانی اور ہندوستانی طب کا اتصال ہو گیا تھا جس پر ایران، شام اور مصر کے اطبا نے کام شروع کر دیا تھا۔ گویا اس زمانے میں طب نہ خالص یونانی رہی تھی اور نہ خالص ہندی یعنی ایک مخلوط صورت پیدا کر لی گئی تھی۔ اس طب میں علی ابن الطبری، محمد بن زکریا اور علی بن عباس مجوسی نے بہت نام پیدا کیا تھا۔ ان ماہرین کے تقریباً ایک صدی بعد بو علی سینا پیدا ہوئے تھے۔ جو اس فن میں محقق سے بڑھ کر مجتہد کا درجہ بھی رکھتے ہیں۔ انہوں نے غور و فکر اور تحقیق و اجتہاد سے طب کو مدون کیا تھا چنانچہ مروجہ طب یونانی آج تک انہیں کے نقشِ قدم پر چل رہی ہے۔

دلی کے درباروں میں اسی طب کے ماہرین موجود تھے جن میں حکیم فتح اللہ شیرازی، حکیم علی گیلانی اور عماد الملک بہت مشہور ہوئے اور پھر آخری زمانے میں علامہ اکبر ارزانی اور شریف خاں کے سلسلوں نے شہرت پائی۔ جب دلی زوال پذیر ہوئی تو وہاں کے کاملینِ طب فیض آباد اور لکھنؤ آ گئے تھے۔ اور بقول مولانا عبدالحلیم شرر، شجاع الدولہ کے عہد میں دلی کے دو ایک طبیبوں کے سوا جتنے تھے وہ سب یہیں چلے آئے تھے۔ [۱] جب آصف الدولہ کے عہد میں فیض آباد کا تمام عملہ لکھنؤ میں منتقل ہو گیا اور پھر یہاں سے نواب وزیر اور امرائے سلطنت کی داد و دہش کا شہرہ اور زیادہ بلند ہوا تو دلی اور ہندوستان کے دوسرے شہروں کے بچے کھچے طبیب بھی یہاں کھنچ آئے۔ اس طرح لکھنؤ علم و ادب کی طرح طب کا بھی مرکزِ خصوصی بن گیا تھا۔

مولوی محمد کاظم نے اپنی سوانح عمری میں اُن اطبا کی ایک فہرست دی ہے جو عہدِ غازی الدین حیدر سے واجد علی شاہ کے زمانے تک معروف ہوئے ہیں۔ ان میں حکیم مرزا علی خان طبیبِ سلطانی تھے جو بدرماہہ یک ہزار روپیہ ملازم تھے۔ انہیں طبیب الملک کا خطاب ملا تھا۔ لیکن یہ محمد علی شاہ اور امجد علی شاہ کے عہد میں معتکف ہو گئے تھے اور اب ان کے بجائے یہ خدمت مرزا محمد علی خاں کو سپرد ہو گئی تھی۔ مرزا محمد علی کے شاگردوں میں سے دو بھائی یعنی حکیم میر محمد اور حکیم میر علی، منور الدولہ کی سرکار میں بہت معقول تھے۔ حکیم مرزا محمد جعفر کو شاہی دار الشفا کا کام سپرد تھا۔ طبیب الملوک کے بیٹے مرزا علی حسن خاں، واجد علی شاہ کے طبیب خاص تھے۔ انہیں مسیح الدولہ کا خطاب ملا تھا۔ ان کے

شاگرد میر نواب صاحب کو بھی شفاء الدولہ کا خطاب عطا ہوا تھا اور شاہی خدمات سپرد تھیں۔ مسیح الدولہ کے بیٹے حکیم مظفر حسین خان داروغہ دار الشفائے شاہی تھے۔ ان کے علاوہ حکیم احسان علی خاں ناظم گونڈہ، حکیم میر باقر حسین، حکیم میر حیدر حسین، حکیم میر طالب علی، حکیم مرزا محمد باقر، حکیم مرزا علی نقی، حکیم آغا خلعت معالج خاں اور ان کے بیٹے حکیم بُنّا صاحب اور اُن کے شاگرد حکیم غلام نبی صاحب بھی اودھ کے مشہور طبیب ہوئے ہیں [۱] ان سب کاملین فن کے اثر سے لکھنؤ کے گلی کوچے نامور اطبا سے بھر گئے تھے اور دوسرے شہروں، قصبات اور دیہات میں بھی سیکڑوں اچھے مطب کھل گئے تھے۔ خود لکھنؤ میں بھی حکیم محمد اسمٰعیل کے سلسلے میں عبدالعزیز صاحب نے تکمیل الطب کالج کی بنیاد ڈالی ہے۔

فنِ طب کے ماہرین سے جب دلّی اور لکھنؤ کے مکتبِ خیال کا فرق دریافت کیا جاتا ہے تو عموماً یہی جواب ملتا ہے کہ قدیم دلّی اور لکھنؤ کی طب میں کچھ زیادہ فرق نہ تھا لیکن رفتہ رفتہ دونوں دبستانوں میں مرکبات اور مفردات کے استعمال کی وجہ سے فرق پیدا ہو گیا تھا یعنی دلّی والوں نے ویدک سے کشتہ جات لے کر اپنی طب میں داخل کر لئے تھے لیکن اُن کے برخلاف لکھنؤ والے مزاج، موسم اور عمر کے مطابق نسخہ ترتیب دے کر علاج کرتے تھے۔ وہ عموماً کشتہ جات استعمال نہیں کراتے تھے۔ سوداؔ نے حکیم محمد کاظم کی مدح کے ذیل میں اعلیٰ طبیب کی جو پہچان بتائی تھی اُس پر لکھنؤ کا طبیب آج بھی پورا اُترتا ہے۔

خلاصۂ بیان

لکھنؤ کے تہذیبی اور ثقافتی اداروں کی بنیاد دلّی ہی کی قدیم روایات پر قائم ہوئی تھی اس لئے دونوں جگہ کے تہذیبی انداز میں بڑی حد تک یگانگت اور یک رنگی موجود تھی جو تھوڑا بہت فرق تھا اُس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ لکھنؤ کے مادّی وسائل محدود تھے یعنی دلّی چودہ صوبوں کی راجدھانی تھی اور لکھنؤ کے پاس تین صوبے تو بہت تھوڑی مدّت تک رہے ورنہ اُن کی ریاست زیادہ دیر تک بقدر ایک صوبہ یعنی محض بارہ اضلاع پر مشتمل رہی۔ اس میں شک نہیں کہ لکھنؤ کے وسائل اپنی اوسط آبادی کے لحاظ سے اچھے تھے جس کی وجہ سے تمام لوگ خوش حال نظر

آتے تھے لیکن دربار میں وہ عظمت و شکوہ پھر بھی موجود نہ تھی جو دِلّی اپنے عروج کے زمانے میں دیکھ چکی تھی چنانچہ لکھنؤ میں تاج محل اور لال قلعہ کے بجائے دولت خانۂ آصفی، فرح بخش اور قیصر باغ تعمیر ہو سکے تھے۔ ماہی مراتب اور جشن و جلوس کے مظاہروں میں بھی افراط و تواتر تو ضرور تھا لیکن دہلی جیسا وہ وقار و جلال نہ تھا جس کا نقشہ مانوچی نے اورنگ زیب کے تذکرے میں کھینچا تھا۔ لکھنؤ کے منصب بھی پنج ہزاری یا ہفت ہزاری نہیں ہوتے تھے۔ درباری انعام و اکرام بھی نقد روپے، خلعت یا وظیفے تک ہی محدود تھے۔ سرافرازی خلعتوں میں بھی سات پارچے، مروارید کی مالا یا دو شالے اور پٹکّو دیئے جاتے تھے۔ بہرحال اس میں شک نہیں کہ لکھنؤ کی یہ شان و شوکت اور یہ انعامات بھی انیسویں صدی کی زوال پذیر دلّی سے یقیناً بہتر تھے۔ لکھنؤ کے وسائلِ آمدنی محدود ہونے کے باوجود یہاں کی تہذیبی سرگرمیوں میں اپنی ہمعصر دلّی کے مقابلے میں کہیں زیادہ چمک دمک موجود تھی جس کی انفرادیت کا بڑا سبب یہ تھا کہ یہاں کے والیانِ ریاست کے ایران سے نسلی اور مذہبی رشتوں نے ہند اسلامی روایات میں اصفہان کی تہذیبی زندگی کا احتشام شامل کر دیا تھا۔ بہرحال ان مباحث کی تفصیل اگلے صفحات میں بیان کی جائے گی یہاں ہم ایک لکھنوی اہلِ قلم کی رائے نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں جس میں انہوں نے لکھنوی ثمراتِ تہذیب کی انفرادیت اس طرح بیان کی ہے۔

یوں تو ہر چیز میں اہلِ لکھنؤ نے جدتیں پیدا کیں اور اپنا معیار الگ قائم کیا یعنی موسیقی میں نئی تان، خطاطی کی نئی شان، مصوری کا نیا قلم، زلفِ سخن کا نیا خم، سیفِ زبان پر نئی صیقل، سپہ گری کے نئے داؤں، ادب و تعظیم کے نئے حدود، لباس کی نئی وضع، کھانوں کا نیا مزہ، برتنوں کی نئی ساخت، لیکن وہ چیزیں جو خاص لکھنؤ کی ایجاد ہیں۔ اُن کی فہرست بھی طولانی ہے یعنی :۔

لباس میں :۔ اچکن، شیروانی، پائجامہ، گھٹنا، دوپلی، کشتی نما اور گول ٹوپیاں، عورتوں کا۔ بڑے پائنچوں کا پائجامہ اور انگیا کرتی۔

کھانے میں :۔ شیرمال، باقرخانی، نان، افتاب، شب دیگ، سہال، شاخیں۔

مٹھائی میں :۔ امرتیاں۔

شاعری میں:- مرثیہ

موسیقی میں:- ملّار، بتاشے اور کوڑی پر ناچ

حُقّہ میں:- مدریہ اور جلیبی

عطر میں:- حِنا اور شمامۃ العنبر

ہار میں:- جا بجا سُنہرے اور چلیے تار، پھولوں کا گہنا، گوٹے اور زردوزی کے ہار۔

سپہ گری میں:- رستم خانی، علی مد، جل بانک، اگن بانک۔

خطاطی میں:- معکوس نویسی اور ناخن سے لکھنا، تصویریں بنانا، چاول کے دانے اور چنے کی دال پر لمبی لمبی عبارتیں لکھنا۔

امام باڑے میں:- دُہرے دالان اور اندر کے دالان کے بیچ کی شہ نشین میں ضریح، تعزیے اور عَلَم عفراں مآب نے ایجاد کیئے

عَلَم حضرت عباسؑ:- جس میں تیر کمان اور مشک لٹکی ہوتی ہے۔ شجاع الدولہ نے نکالا۔

چہلم:- سعادت علی خان نے قائم کیا۔

ذوالجناح:- نصیر الدین حیدر نے نکالا اور محرّم کی تعزیہ داری کو چہلم تک ملا دیا۔

شامِ غریباں:- کی مجلس مولانا کلب حسین نے قائم کی۔ (حرف تبّن صاحب الملقب بہ محمد

متفرق چیزیں:- پوت کے گہنے، شہانی چوڑیاں، دانے دار تمباکو اور قوام، مری ہنچی کے کام کی دوپلّی ٹوپیاں، کُرتے اور انگرکھے، لحاف ورضائی کی چھپی ہوئی فردیں، لکڑی کے چھاپے، سینگ کی کنگھیاں، شیر، ہاتھی اور مچھلی کی شکل کی کشتیاں، غازی الدین حیدر نے ایجاد کیں۔

ڈراما:- سب سے پہلے واجد علی شاہ نے اسٹیج کیا۔[1]



بابِ چہارم

دِلّی اور لکھنؤ کے تمدّنی اور تہذیبی مزاج

دِلّی جو زمانے کے نشیب و فراز دیکھتی ہوئی ڈیڑھ دو ہزار سال میں اندر پرستھ سے شاہجہان آباد تک پہنچی تھی، اپنے اہم تاریخی کھنڈروں، فلک بوس عمارتوں، شاندار مقبروں، پُر ہیبت قلعوں اور ہنگامہ زا درباروں کی بڑی عبرت خیز داستان تھی اور ہزاروں سال کی قدیم تہذیبی روایات سے اسلامی عناصر کا امتزاج اِسی سرزمین میں ہوا تھا۔ اسلامی عہد بالخصوص مُغلوں کے زمانے میں دِلّی کی آبادی زیادہ سے زیادہ دس لاکھ ہو گی لیکن تہذیبی شان و شوکت کے اعتبار سے ایشیا بھر میں اُس کا جواب نہ تھا۔ اُس کے مذہبی، فنّی اور ثقافتی ادارے اپنے دامن میں قرنوں کی روایات لئے ہوئے تھے اور صدیوں سے اُس کے آداب و رسوم، ہندوستان کی تہذیبی زندگی کی رہبری کر رہے تھے لیکن دفعتاً اورنگ زیب کے بعد پچاس ساٹھ سال کے اندر ہی اندر اُس نے نکبت و زوال کے سارے مدارج طے کر لیئے اور اب دِلّی دِلّی نہ رہی تھی۔ آپ اُسے زیادہ سے زیادہ ایک صوبائی مرکز کہہ سکتے تھے اور صوبہ بھی وہ جس کی لمبائی دو سو میل اور چوڑائی سَو میل سے زیادہ نہ ہو گی، جو رات دِن باغیوں اور رہزنوں کی جولاں گاہ بنا ہوا تھا۔ جس سے مرہٹے، جاٹ، سکھ، افغان اور روہیلے آئے دِن تاوان وصول کرتے رہتے تھے، جہاں خانہ جنگیوں کی وجہ سے کسی طرف بھی سکون نظر نہ آتا تھا۔ ذرائع پیداوار مسدود تھے، جان و مال خطرے میں تھے، کاشتکاروں کے کھیت

حملہ آوروں کے گھوڑے رَوند ڈالتے تھے، اور اُن کی فصلیں یا تو حکومت کے عمّال سمیٹ لے جاتے تھے یا موقع پاکر ریاست کے دشمن اُن پر ہاتھ صاف کر جاتے تھے۔

دِلّی کی شہری زندگی کا مرکز قلعۂ معلّٰی تھا جو عرصہ سے تباہ حال تھا۔ نادر شاہ نے اُس کی ثروت لُوٹ لی تھی۔ مرہٹوں اور جاٹوں نے اُس کی قیمتی چھتیں اُتار لی تھیں۔ عماد الملک نے اُس کا لہو چوس لیا تھا۔ احمد شاہ ابدالی نے اُس کی توقیر خاک میں مِلا دی تھی۔ غلام قادر روہیلہ نے اُس کے فرش تک اُکھڑوا لیئے تھے۔ اور بقول پرسی وَل اسپیر (Percival Spear) دربار سنگِ مرمر کے اُس چبوترے کی مانند رہ گیا تھا جس کی بنیاد، بدرَو، پر قائم ہو۔ سازشِ، بد انتظامی اور افلاس کا گھُن اُس کے سیاسی، اخلاقی اور معاشرتی ریشوں کو چاٹ رہا تھا۔ جہاں پناہ کا گُذارا پنشن پر تھا جو مرہٹوں کے اقتدار کے وقت پچاس ہزار روپے ماہوار اور انگریزوں کے عہد میں ایک لاکھ روپیہ ماہوار سے کچھ ہی زیادہ تھی۔ آمدنی کی تنگی کے پیشِ نظر بادشاہ نے اپنی فوج توڑ دی تھی اور عملے کا ایک بڑا حصّہ تخفیف کر دیا تھا۔ اب دربار میں خاک اُڑ رہی تھی، شاہ بُرج غیر آباد پڑا تھا، حمام اور فوارے خشک تھے، قلعے کے اندرونی راستوں پر سُوکھے ہوئے پتّوں اور کُوڑے کرکٹ کے ڈھیر تھے، دیواروں پر چڑیوں اور ابابیلوں کی بیٹیں تھیں، اس لیئے بشپ ہیبر (Bishop Haber) نے اسے ماند، ویران اور محرومِ توجّہ (dull, desolate and forlorn) کہا تھا۔ دِلّی کے گلی کوچے جو کبھی اوراقِ مصوّر کی مانند تھے۔ اب جل کر خاک سیاہ ہو گئے تھے، اُس کے اُمراء تباہ حال اور صنّاع بے روزگار تھے۔ علم و فن اور شعر و ادب کو دُور دُور تک سرپرست نظر نہ آتا تھا۔ مفلسی اور تنگدستی نے عوام و خواص کے اخلاق پست کر دیئے تھے۔ ہر طرف مجہولیت اور انفعالیت کا دَور دَورہ تھا۔ صدیوں کی تہذیبی شائستگی مسخ ہو چکی تھی۔ مُصحفی نے بھی اس کا ذکر اس طرح کیا ہے:

دِلّی ہوئی ہے ویران، سُونے کھنڈر پڑے ہیں
ویران ہیں محلّے سنسان گھر پڑے ہیں

دِلّی کے برخلاف اَودھ کا دربار دن رات عروج پر تھا۔ نواب شجاع الدولہ میں ایرانی قسمت آزماؤں کی سی تمام صفات موجود تھیں۔ ایک طرف وہ حُسن پرست تھے اور دوسری طرف بہادر سپاہی۔ اُن میں وہ ہمّت و فراست موجود تھی کہ شکست کے بعد بھی انگریزوں سے بنگال، بہار اور بندھیل کھنڈ چھین لینے کے منصوبے بناتے تھے۔ وہ بیدار مغزی کے ساتھ اپنی سلطنت کا انتظام کر رہے تھے۔ سارے ہندوستان میں کوئی حکمران اُن کی سی شان و شوکت نہ رکھتا تھا اور فیض آباد میں دولت اور معاش کی اتنی فراوانی تھی کہ ڈھاکہ، بنگال، گجرات، مالوہ، حیدر آباد، دِلّی، لاہور، پشاور، کابل، کشمیر اور ملتان سے اہلِ کمال، اطبّاء، ادیب، عُلمائ، رقّاص، موسیقار، سپاہی اور اہلِ حرفہ دن رات یہاں سمٹے چلے آ رہے تھے۔ جُرأت نے مثنوی "حُسن و عشق" میں لکھا ہے کہ،

فلک نے کر جہان آباد برباد   کیا تھا خوب فیض آباد آباد

اس نو سال کے اندر فیض آباد کو جو تمدّنی و تہذیبی عروج حاصل ہوا تھا وہ ایک دن آصف الدولہ کی خواہش پر جُوں کا تُوں لکھنؤ میں منتقل ہو گیا۔ لکھنؤ کو اسلامی عہدِ حکومت میں کوئی اہم سیاسی یا تہذیبی اعتبار حاصل نہ تھا۔ یہاں جو کچھ روایات تھیں وہ زیادہ تر ہندوانی تھیں۔ اس میں شک نہیں کہ اکبرِ اعظم کے عہد میں شیخ عبدالرحیم لکھنوی اُمرائے دربار میں اپنا ایک مقام رکھتے تھے اور جب اُن کی وفات کے بعد اُن کی برہمن بیوی کشنا نامی نے یہاں باغات، سرائے، دُکانیں، حوضیں، تالاب، قبرستان اور خانۂ پُر تکلّف تعمیر کرا کے اپنے حُسنِ انتظام، مہمان نوازی، قبیلہ داری اور سلیقے کی دھاک بٹھا دی تو اِس مقام کو بھی رفتہ رفتہ اِس خانوادے کی ترقّی، ثروت اور اثر و رسوخ کے ساتھ ساتھ کچھ نمایاں حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ چنانچہ یہاں اورنگ زیب کے عہدِ حکومت میں ایک عالمگیری مسجد تعمیر ہوئی اور مُلّا نظام الدین سہالوی نے علومِ مشرقی کا ایک ادارہ قائم کیا اور اس طرح لکھنؤ بھی ایک اہم علمی اور مذہبی مرکز بن گیا تھا۔ شہر میں بھی اکبری دروازہ، گول دروازہ، چوک بازار، پنج محلہ اور مچھّی بھون

جیسی پُررونق عمارات موجود تھیں لیکن اس کے باوجود نہ یہاں کے شیخ زادے کسی بڑی تاریخی حیثیت کے مالک تھے اور نہ یہاں کی شہری زندگی میں کسی انفرادی یا خصوصی تہذیب کے عناصر پیدا ہو سکے تھے۔ پورب میں اسلامی عہد کے اندر صرف ایک تہذیبی مرکز جون پور تھا جس میں ایک سو سے زیادہ تعلیمی ادارے قائم تھے اور نوسو (۹۰۰) کے قریب عُلمار نمازِ جمعہ اداکرنے کے لئے اپنی پالکیوں میں نکلتے تھے۔ جون پور کا قاضی بھی برِّصغیر کا ایک اہم روائتی کردار بن کر اب تک گفتار و تحریر میں کسی نہ کسی حیثیت سے اپنے نام اور اوصاف کی نشاندہی کرتا ہے۔ لیکن تاجدارانِ شرقی کے اس جون پور کا بھی کوئی تہذیبی اثر نئے لکھنؤ کو ورثے میں نہیں ملا تھا۔ اس پر ستم یہ ہوا کہ جب شجاع الدولہ صلح نامۂ الہ آباد کے بعد اپنے محلے اور دفاتر کا بڑا حصّہ فیض آباد لے گئے تو لکھنؤ تہذیبی اعتبار سے کچھ اور بھی تہی دامن نظر آنے لگا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب دس برس کی تمدنی برہمی کے بعد آصف الدولہ نے یہاں نئے سرے سے طرحِ اقامت ڈالی تو بقولِ میر حسن دہلوی اس کی کیفیت یہ تھی ؎

جب آیا میں دیارِ لکھنؤ میں	نہ دیکھا کچھ بہارِ لکھنؤ میں
زبس یہ شہر ہے بیہڑ پہ بستا	کہیں اونچا کہیں نیچا ہے رستا
عجب ہے یاں کی راہ و رسم گندی	گہے پستی ہے اور گاہے بلندی
ہر اک کوچہ یہاں تک تنگ تر ہے	ہوا کا بھی یہ مشکل یاں گذر ہے
سوائے تودۂ خاک اور پانی	یہاں ہر جنس کی دیکھی گرانی
کوئی یاں سیر کے قابل نہیں جا	کہ جا کر دیکھئے واں ٹک تماشا

اس لئے اوّل اوّل دلّی سے جو گھرانے اُجڑ کر آئے وہ شاہجہان آبادہی کے گلی کوچوں کو یاد کرتے تھے اور میر تقی میر کا یہ فرمانا خلافِ واقعہ نہ تھا ؎

خرابہ دلّی کا وہ چند بہتر لکھنؤ سے تھا	وہیں کے کاش مرجاتا سراسیمہ نہ آتا یاں

لیکن آصف الدولہ کی توجّہ سے اِس شہر کو بہت جلد وہ حیثیت حاصل ہو گئی جو فیض آباد

کو بھی میسر نہ تھی۔ آصف الدولہ کے وقت سے اگرچہ اودھ ایک مسلسل سیاسی زوال کی طرف بہا جارہا تھا، اُس کے مادّی وسائل کم، ور ہوتے جا رہے تھے، لیکن لکھنؤ بستا جارہا تھا۔ اُس کے تہذیبی تمدنی اور مجلسی ادارے ترقّی پذیر تھے۔ ہر طرف چہل پہل، خوش حالی اور رونق نظر آتی تھی۔ بازار بھرے بھرے تھے اور شہر کی آبادی ساڑھے سات لاکھ سے کم نہ تھی۔ عبدالحلیم شرر نے آصفی عہد کے لکھنؤ کے متعلق لکھا ہے کہ "شہر ایسی رونق پر تھا کہ ہندوستان ہی نہیں شاید دُنیا کا کوئی شہر لکھنؤ کے اوج و عروج کا مقابلہ نہ کر سکتا ہوگا۔ شجاع الدولہ جو روپیہ فوج اور جنگی تیاریوں میں صرف کرتے تھے اُسے آصف الدولہ نے اپنی عیش طلبی کے ذوق اور شہر کی آرائش اور خوش حالی میں صرف کرنا شروع کر دیا تھا اور چند ہی روز کے اندر ساری دُنیا کی دھوم دھام اپنے یہاں جمع کر لی تھی۔" [۱]۔

آخر کار وہ وقت آگیا کہ خود میر تقی میرؔ بھی کہہ اُٹھے کہ ؎

چشمِ بد دُور ایسی بستی ہے — یہی مقصد ہے مُلکِ ہستی ہے

لکھنؤ دِلّی سے بھی بہتر ہے — کہ کُٹو دِل کی لاگ ادھر ہے

اور میر حسنؔ بھی یہ کہنے پر مجبور ہوگئے،

رہے نِت آصف الدولہ سلامت — کہ جس نے کی یہاں طرحِ اقامت

عمارت کی یہاں وہ اُس نے بُنیاد — کہ نظارے سے ہو جس کے جہاں شاد

مٹادی اُس نے سب یاں کی کدورت — بنادی لکھنؤ کی ایک صورت

غرض کہ تہذیب کو اپنی نشو و نما کے لیے جس تسلسل کی ضرورت تھی وہ لکھنؤ کو کم و بیش ستّر سال تک میسر رہا۔ تہذیبی مرکز کی ساخت میں جو شاہی خاندان برسرِ اقتدار تھا اُس کی سرپرستی میں یہ روایات ماضی سے اپنا رشتہ جوڑے ہوئے آگے بڑھتی جارہی تھیں، اور ایک بادشاہ کے بدلنے سے روایات کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچتا تھا بلکہ جیسے جیسے زمانہ گذرتا جارہا تھا۔ زندگی میں کچھ نئی چمک دمک آتی جارہی تھی۔ اس طرح شجاع الدولہ سے واجد علی شاہ تک ایک ہی انداز کی تہذیبی روایات قائم رہیں۔

لیکن اس عظمت و شکوہ کے باوجود لکھنؤ کافی مدت تک تہذیبی اور سیاسی حیثیت سے دلّی کی برتری کا معترف رہا۔ اور یہاں کے نوابوں اور امیروں کی شادیاں اب بھی بڑے فخر کے ساتھ دلّی ہی کے اُمراء اور درباریوں کے یہاں ہوتی رہیں چنانچہ شجاع الدولہ کی شادی موتمن الدولہ کی دُختر سے، آصف الدولہ کی شادی انتظام الدولہ کی صاحبزادی سے، سعادت علی خاں کی شادی امیر الدولہ کی بیٹی سے، غازی الدین حیدر کی شادی مشیر الدولہ کی لڑکی سے اور نصیر الدین حیدر کی شادی مرزا سلیمان شکوہ کی دُختر سے ہوئی۔ اور سیاسی معاملات میں بھی نواب وزیر کو اپنی جائز حیثیت تسلیم کرانے کے لئے کبھی کبھی دلّی ہی کے بادشاہ کی طرف رجوع کرنا پڑا۔ چنانچہ آصف الدولہ کی تخت نشینی اگرچہ کلکتے کی منظوری اور گورنر جنرل کی خواہش کے مطابق عمل میں آئی تھی لیکن ۱۷۸۱ء میں جب یہ خبر گرم ہوئی کہ مرزا نجف خاں مرہٹوں اور سکھوں کی امداد سے لکھنؤ پر حملہ کرنا چاہتا ہے تو انگریزوں نے نواب اودھ کو مشورہ دیا کہ وہ بادشاہ سے وزارت کا خطاب حاصل کریں۔ چنانچہ مجدد الدولہ کی معرفت دربارِ دہلی کو تحفے تحائف بھجوا کر آصف الدولہ نے خطاب بر وزارت حاصل کیا اور پھر بڑے حشم و خدم کے ساتھ اس خلعت کا استقبال کیا۔ سعادت علی خان نے بھی خلعتِ وزارت حاصل کرنے کے لئے کافی تگ و دو کی لیکن مرہٹوں کے نائب نظام الدین نے اُن کی یہ آرزو پوری نہ ہونے دی اور اس کے جواب میں سعادت علی خاں نے بادشاہ سے ناراض ہوکر سات ہزار روپے ماہوار کی وہ رقم دلّی بھیجنا بند کردی جو بادشاہ کے باورچی خانۂ خُرد کے لئے اب تک لکھنؤ سے بھیجی جایا کرتی تھی۔ اس طرح سعادت علی خاں کے وقت سے لکھنؤ نے دلّی کی سیاسی برتری کا مجرُا ماننا شروع کردیا تھا جس کی انتہا غازی الدین حیدر کے زمانے میں ہوئی جب اُنہوں نے خود کو بادشاہ سمجھ کر اپنے نام کا سکّہ جاری کیا۔

انسان جب اپنے خارجی ماحول سے مرعوب ہوتا ہے تو وہ اکثر ظاہرداری اور احساسِ برتری میں مُبتلا ہوجاتا ہے۔ لکھنؤ کا دربار ایک طرف تو انگریز کے انتظام، حکمتِ عملی اور مشینی قوت سے مرعوب تھا اور دوسری طرف دلّی کی روائتی برتری اُسے احساسِ کمتری میں مُبتلا کررہی تھی۔ اس لئے

آصف الدولہ کے زمانے سے لکھنؤ میں دلّی پر سبقت لے جانے کا جذبہ پیدا ہوا اور نواب وزیر نے اپنے سیاسی انحطاط کو چھپانے کے لئے ثقافتی مشعل کی لَو بڑھا دی۔ لکھنؤ کو عروس البلاد بنا دینے کا جذبہ انہیں محرکات کی وجہ سے اُبھرا جسے سعادت علی خاں کے زمانے میں زیادہ فروغ ہوا کیونکہ ایک طرف تو نصف علاقہ ہاتھ سے نکل گیا تھا اور دُوسری طرف نواب وزیر کے حدود واختیارات گھٹ گئے تھے۔ رزیڈینٹ نے دربار کو اپنی مُٹھی میں لے لیا تھا۔ ان حالات نے سعادت علی خاں کو بہت متاثر کیا اس لئے اُنہوں نے مُلکی، درباری اور خانگی حالات سُدھارنے پر خاص توجہ دی اور اپنے حُسنِ لیاقت سے آمدنی بڑھا کر خزانے میں چَودہ کروڑ روپیہ جمع کر دیا۔ جب اُن کی وفات کے بعد اُن کے بیٹے غازی الدین حیدر کو یہ بھرا پُرا خزانہ ملا تو خوش قسمتی سے اُسی زمانے میں گورنر جنرل نے رزیڈینٹ کے مقابلے میں اُن کی حمایت کی اور اُن کا اعزاز بڑھانے کے لئے بادشاہت کے اعلان کا مشورہ دے دیا۔ اب بادشاہ بن کر یہاں کے تکلّفات اپنے عروج پر پہنچ گئے اور دونوں حکومتوں کی معاشرت کے انداز اور شعر وادب کے مزاج میں گہرا فرق پیدا ہو گیا۔ اِس زمانے میں دونوں درباروں کی مالی حالت میں بھی زمین وآسمان کا فرق تھا اس لئے اودھ کا یہ احساسِ تفوّق کسی حد تک بجا بھی تھا۔ ایک طرف لکھنؤ کا کروڑ پتی بادشاہ تھا جس نے دو کروڑ روپے کی رقم انگریزوں کو قرض دے دی تھی اور دوسری طرف دِلّی کا بادشاہ تھا جو خود انگریزوں کا دستِ نگر تھا۔ ایک طرف لکھنؤ میں شاہی لوازم کی آرائش پر دو کروڑ روپے صرف کئے جا رہے تھے۔ اور دوسری طرف دِلّی کے بادشاہ کی عُسرت کو دیکھتے ہوئے لوگ اُس سے انعام واکرام قبول کرتے ہوئے بھی شرماتے تھے۔ اِس زمانے میں ایک انگریز خاتون مسز حسن علی کو جب دِلّی کی ملکہ نے رُخصتی تحفہ دیا تو اُس کے دل میں یہ جذبات پیدا ہوئے۔

• رُخصتی تحفے میں ملکہ سے کارچوبی گلوبند قبول کرتے وقت مجھے افسوس ہوا کیونکہ میں جانتی ہوں کہ اُن کی بخشش کی ضروریات کے مقابلے میں اُن کے ذرائع آمدنی بہت

محدود ہیں۔ [1]

اُن دنوں دلّی کے شاہی خاندان کی نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ سلاطین کوارٹرز جو ایک فصیل کے پیچھے چٹائی کی جھونپڑیوں پر مشتمل تھے اُن میں سینکڑوں نیم عُریاں اور بھوکے شہزادے رہتے تھے۔ جنھیں ریزیڈینٹ چارلس سیٹن (Charles Seton) جاڑوں میں کمبل تقسیم کرا دیتا تھا[۱] اس مالی فرق کی وجہ سے ایک طرف دلّی میں اُستادِ بادشاہ کو محض پچپیس[۲] روپے مشاہرہ ملتا ہے۔ اُن کا ملک الشعرائی کا خطاب سودا یہ کہہ کر رد کر دیتا ہے کہ اگر میرے کلام میں جان ہوگی تو میں آپ کے عطیے کے بغیر بھی ملک الشعراء بن جاؤں گا۔ لیکن دوسری طرف لکھنؤ میں سودا کو پانچ سو روپے اور میر تقی میر کو تین سو روپے ماہوار وظیفہ ملتا ہے۔ ایک جگہ اُفلاس کی وجہ سے علوم و فنون درباری سرپرستی سے محروم ہوگئے ہیں اور دوسری جگہ افراطِ دولت کی وجہ سے موسیقی کی تعلیم کے لئے "پری خانے" قائم ہو رہے ہیں، رہس دھاری تیار ہوتے ہیں، ماہرینِ فن مطربوں کو بڑی بڑی تنخواہوں پر نوکر رکھا جاتا ہے اور خطابات سے سرفراز کیا جاتا ہے۔

اس مالی فوقیت اور احساسِ برتری کے باوجود دونوں جگہ کی تہذیبی روایات میں کوئی بنیادی فرق نہیں آیا تھا۔ لکھنؤ کا چراغ دلّی ہی کے چراغ سے روشن ہوا تھا اس لئے روایات دونوں کی ایک تھیں۔ دلّی ہی کا تمام تہذیبی سرمایہ مع اپنے فن اور فن کاروں کے یہاں منتقل ہوا تھا۔ بقولِ سید انشاء لکھنؤ میں دلّی کے اس قدر صاحبِ سلیقہ مرد وزن ٹوٹ پڑے تھے کہ دلّی خالی ہو گئی تھی اور لکھنؤ بس گیا تھا۔ سپاہی اور مصاحب پیشہ، لطیفہ گو اور نقال، گانے بجانے والے اور قصہ خواں جو لکھنؤ میں تھے سب دلّی ہی سے آئے تھے۔ اس جمِ غفیر میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا جس کے بزرگوں کے مکان کو لکھنؤ میں بنے ہوئے سو سال کا زمانہ گزر چکا ہو[۲] غرض کہ یہ شہر اب لکھنؤ نہیں بلکہ ایک طور پر شاہجہان آباد ہو گیا تھا[۳] اس طرح لکھنؤ دلّی ہی کا ایک تہذیبی پر تو تھا جس نے فراغت اور آسائش کی وجہ سے اپنے تمدن اور تہذیب میں بعض نزاکتیں اور سجاوٹیں پیدا کر لی تھیں۔ بنیادی طور پر دونوں جگہ روایات اور تخیل کا انداز تھوڑے بہت فرق کے ساتھ ایک ہی سا تھا۔ دونوں ایک مخصوص مابعد الطبیعاتی نظام کے قائل تھے، یہ دوسری بات ہے کہ ایک جگہ مخصوص معتقدات کا پہلو

کچھ اَور تھا اور دوسری جگہ کچھ اَور۔ ایک طرف دِلّی میں غالب کے وقت تک خاتم النبیین اور آخرت کی بحثیں ہو رہی تھیں اور دوسری طرف لکھنؤ اگرچہ ان مسائل پر بھی اعتقاد رکھتا تھا لیکن اُس کی توجہ محرّم پر زیادہ تھی۔ محرّم دِلّی میں بھی منایا جاتا تھا لیکن اُسے دربار کی اتنی زیادہ حمایت حاصل نہ تھی اور پھر دِلّی میں مُحرّم کا غم دسؔ دن تک منایا جاتا تھا جو لکھنؤ میں بڑھ کر اوّل اوّل سوا مہینے ہوا اور پھر سوا دو مہینے۔ گویا مُحرّم کی چاند رات سے ۸ ربیع الاوّل تک ایّامِ عزا قرار پائے۔ بہر حال دونوں دبستانِ فکر ایک دوسرے سے فرق رکھنے کے باوجود زیادہ دُور نہ تھے اور مجموعی حیثیت سے اَودھ کی تہذیب بھی ہندوستان کی اُس عظیم تہذیب کا عکس تھی جس نے کبھی دِلّی میں عروج پایا تھا۔ لیکن اب دِلّی ماند پڑی تھی اور لکھنؤ عروج پر تھا۔ اس کے علاوہ نئے ماحول میں قدیم تہذیب بعض مقامی، معاشی اور نفسیاتی اثرات کی وجہ سے قدرے منفرد رنگ اور چمکدار صورت اختیار کر گئی تھی۔

کسی مُلک کی تباہی کے وقت کبھی کبھی اُس کے باشندوں میں نا اُمیدانہ ہمّت آ جایا کرتی ہے۔ یہی عالم انحطاط کے زمانے میں دِلّی کا تھا۔ وہ صاحبانِ کمال پیدا کرنے کی اب بھی صلاحیت رکھتی تھی اور وہاں کی آبادی میں محنتی اور جفاکش انسانوں کا اوسطاب بھی اچھا تھا۔ ہر شخص انفرادی طور پر اب بھی مُستعد اور مضبوط تھا۔ شاعر اور ادیب علم و فضل کی خصوصیات کے ساتھ ساتھ سپاہیانہ ذوق بھی رکھتے تھے۔ چنانچہ شاکر ناجی، مرزا رفیع سوؔدا اور میر تقی میرؔ وغیرہ بھی کارزار کے تلخ تجربات سے ہو کر گذرے تھے۔ لیکن سکون و فراغت کی کمی فن کاروں کو دِلّی میں ٹھہرنے نہیں دیتی تھی۔ لوگ دُور دراز کا سفر کر کے دکن، عظیم آباد اور مُرشد آباد تک پہنچ رہے تھے۔ لیکن قریب تر گوشۂ امن لکھنؤ ہی تھا جہاں تھوڑی سی زحمت کے بعد ہر شعبۂ زندگی کے آدمی کو راحت مِل جاتی تھی اور وہ یہاں کی تہذیب سے متاثر ہو جاتا تھا۔

چونکہ جغرافیائی اثرات نے لکھنؤ کے انسانوں میں نرمی اور لوچ پیدا کر دیا تھا اور دِلّی کی آب و ہوا نے وہاں کے انسانوں میں سختی اور کرختگی۔ اِس لئے دونوں علاقوں کی بولیوں اور طرزِ معاشرت

میں بھی فرق نمایاں تھا۔ (اور یہی فرق رامائن اور مہا بھارت کی شاعری میں بھی ہے) یہاں زبان میں نرمی، لہجہ میں شائستگی، تکلم میں لوچ، اداؤں میں دلآویزی اور لباس میں نزاکت تھی۔ یہاں کے لباس کے مقابلے میں دِلّی کا لباس بقولِ سیّد انشاؔ ایسا تھا جیسے ایران کے میرزاؤں کی پوشاک کے مقابلے میں کاندھلے اور شاملی کے بنیوں کی پوشاک۔ اس لئے دِلّی کے قدیم وضع کے بزرگ لکھنؤ کے نئے ماحول میں اپنے اطوار و لباس کو کچھ اجنبی پاتے تھے اور اُن کی زبان سے بے ساختہ نکل جاتا تھا ؎

کیا بود و باش پوچھو ہو پُورب کے ساکنو　　ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے

لکھنؤ کی تہذیبی نفاست کا بڑا سبب یہاں کی خوش حالی اور فراغت تھی اور یہ خوش حالی یہاں کے باشندوں کو آخر وقت تک میسّر رہی۔ بقولِ ناسخؔ ؎

بادشاہِ لکھنؤ کی ہو بیاں کس سے شکوہ　　ہاتھ میں رکھتے ہیں جامِ جم گدائے لکھنؤ

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ دِلّی سکون و فراغت سے محروم تھی اس لئے دونوں مقامات کی آبادی کے مذاق و رجحان میں یہ فرق پیدا ہو گیا تھا ایک طرف ایسے معاشرتی ادارے قائم ہوئے جن کا مقصد خوش وقتی تھا۔ اور دوسری طرف اس قسم کے مشاغل کو مکروہاتِ دُنیا کا نام دے کر اُن سے دامن بچایا جانے لگا۔ لکھنؤ کی معاشی فراغت اور اُونچے طبقے میں کم محنت یا بغیر محنت کے کمائی ہوئی دولت نے ایسے بے فکروں کی کثیر جماعت پیدا کر دی تھی جن کے پاس خوش وقتی کے علاوہ کوئی بلند مقصدِ حیات نہیں تھا۔ بہت سے شہزادے، اُمراء اور مقربینِ ریاست دربار سے بڑی بڑی تنخواہیں اور وظیفے پاتے تھے۔ ایک اچھی تعداد ایسے لوگوں کی بھی تھی جنھیں گھر بیٹھے وثیقہ ملتا تھا اور اُن کا مشغلہ بیکاریِ محض یا لہو و لعب کے علاوہ کچھ اور نہ تھا۔ یہ لوگ ہر ماہ کی ابتدائی تاریخوں میں شان کے ساتھ گاڑیوں یا پالکیوں میں بیٹھ کر رزیڈنیٹ کے یہاں جاتے اور اپنا مہینے بھر کا گزارا لے آتے تھے۔ اُونچے طبقے کے لوگوں نے بڑے بڑے محل، گنج اور بازار بنوائے تھے، آمدنی وسیع تھی اور خرچ کا ذریعہ عیش و عشرت کے مشاغل یا مصرفِ خیر کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ چنانچہ اس

معاشرے کا خاصا نمایاں حصّہ اپنے وقت کو لطف سے گزارنے کے لئے حسن پرستی، تماش بینی، عیش سامانی، راگ رنگ، جشن و جلوس، میلوں ٹھیلوں، لہو و لعب اور مُرغ اور بٹیر بازیوں وغیرہ میں منہمک رہتا تھا لیکن اہلِ علم کا ایک خصوصی طبقہ تکمیلِ علم و فضل اور مطالعۂ مذہب و اخلاق میں بھی مشغول تھا جسے اس سیلابِ عیش پسندی کا کفارہ کہہ سکتے ہیں، بہرحال دربار، اُمراء، شُرفا، اور علماء کے یہ مجموعی اثرات ان کے متوسلین کے ذریعے سے عوامی زندگی تک بھی پہنچ رہے تھے اور ایک ایسا معاشرہ ترتیب پا رہا تھا جس میں احساسِ دین بھی تھا اور لذتِ دنیا بھی!

یہ فراغت اور خوش حالی جب اَوَدھ کی مقامی روایات سے ملی تو اُس نے کچھ اور دلچسپ تہذیبی نتائج بھی پیدا کر دیئے۔ اَوَدھ زمانۂ قدیم ہی سے ہندو روایات کا سرچشمہ چلا آ رہا تھا، یعنی فیض آباد سے محض تین چار میل کے فاصلے پر رام چندر جی کی راجدھانی "اجودھیا" واقع تھی، اس کے علاوہ خود لکھنؤ بھی اُن کے بھائی لکشمن جی سے نسبتِ نام رکھتا تھا اور اس تعلق کے ثبوت میں لکھنو کے اندر "لچھمن ٹیلا" موجود تھا۔ ان شہروں کے ملحقہ علاقوں میں بھی چند دیگر اہم مقامات تھے مثلاً پریاگ (الٰہ آباد) جو دریائے گنگا اور جمنا کے سنگم پر واقع تھا اور جہاں ہر بارہویں سال کُنبھ کا میلہ ہوتا ہے۔ اس سے قریب ہی بنارس کا عظیم شہر تھا جو اپنے اندر ہندو مذہب کی ایسی شاندار روایات تھا کہ شیخ علی حزیںؔ نے اس کے متعلق کہا تھا کہ:

از بنارس نروم معبدِ عام است ایں جا
ہر برہمن بچہ، لچھمن و رام است ایں جا

مختصر یہ کہ ان مقامات جیسے کاشی، متھرا، بنارس، مندر، متبرک دریاؤں کے گھاٹ، اشنان کے میلے، دسہرہ اور رام نومی کے جلسے جلوس، رام لیلا اور کرشن لیلا کی تمثیلیں، ہولی، دیوالی اور بسنت کے تہواروں پر مذہبی رسوم کی دھوم دھام، جوگیوں، سنیاسیوں اور سادھوؤں کے تقدس کے مناظر، مذہب کا پُراسرار انداز، دان پُن کی اہمیت، توہم پرستی کا رواج، نجوم

اور فوقِ فطری قوتوں پر اعتقاد وغیرہ ایسے شواہد تھے جو اَوَدھ کی مقامی زندگی میں شدت سے نمایاں تھے۔ ان تہذیبی عناصر کا درباری رسم و رواج میں سرایت کر جانا ایک فطری امر تھا۔ ہر چند کہ تہذیب و تمدن عموماً درباری اقدار کو ملحوظ رکھا کرتے ہیں اور لکھنؤ کے شاہی خاندان کی درباری اقدار اپنی بنیاد میں اسلامی اور ایرانی عناصر کی شدت رکھتی تھیں لیکن پھر بھی مقامی ہندو روایات کو اپنا اثر دکھاتا تھا چنانچہ ہندو دھرم کی وہ اُجلی، حسین اور پسندیدہ رسمیں لکھنؤ کے اشراف کی زندگی میں داخل ہو گئیں جنہیں اَوَدھ کے شاہی گھرانے اور درباری اُمراء نے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا تھا۔

ہندو روایات میں رومان اور حُسن پرستی کو خاص اہمیت حاصل ہے اور رام چندر جی کے بن باس میں سیتاجی کی موجودگی، اُن کے حُسن و جمال کے کرشمے، لکشمن جی کی قربانیاں اور وفاداریاں، خود رام چندر جی کا ایفائے عہد، کوہ و صحرا میں سفر کی زندگی وغیرہ ایسی چیزیں تھیں جنہوں نے اُن کے قصّۂ غم کو حُسن و عشق، مہم جوئی اور رُومان پروری کی ایک عظیم داستان بنا دیا تھا۔ اس مذہبی معرکے کے علاوہ کرشن جی کی رنگین زندگی، اُن کی گوپیاں اور بندرابن کی چنچل مکھن اور دہی بیچنے والیاں، ایک جُداگانہ رومان رکھتی تھیں۔ یہ قدیم ہندو روایات از منۂ قدیم سے اَوَدھ میں بھی نشوونما پا رہی تھیں اور جب اس ماحول میں ایرانی خاندان برسرِ اقتدار آیا جو خود بھی عیش پسندی کا شدید جذبہ رکھتا تھا، تو ان رومانی روایات میں نیا آب و رنگ پیدا ہو گیا۔ چنانچہ جب آصف الدولہ نے عیش باغ تعمیر کرایا تو ساون کے چار جمعے اس باغ میں میلے کے لئے مخصوص کر دیئے گئے اور اس طرح یہ باغ اور اس کے میلے اپنے صدہا رنگین و دلکش نقوش کے ساتھ عوام و خواص کی زندگی میں جگہ پا گئے۔ اسی طرح آٹھوں کا میلہ بھی چیت کی اشٹمی کو راجہ ٹکیٹ رائے کے تالاب پر ہونے لگا۔ اس میں بھی شہری عوام کے لئے وہی رنگینیاں اور دلچسپیاں تھیں چنانچہ سیّد انشا کی "بی نورن" نے "میر جعفر غینی" کو اسی میلے میں ملنے کی دعوت دی تھی۔ واجد علی شاہ نے بھی خاص قیصر باغ میں جوگیا میلے کی بنیاد ڈالی جو کئی سال تک لکھنؤ کے عوام کے لئے دلچسپی کا باعث بنا رہا۔

ان میلوں ٹھیلوں کے علاوہ ہندوؤں کے بعض تہوار مثلاً ہولی اور بسنت بھی دربار میں خاص اہتمام کے ساتھ منائے جاتے تھے، چنانچہ آصف الدولہ کے متعلق میر تقی میر لکھتے ہیں کہ:

ہولی کھیلا آصف الدولہ وزیر
رنگ صحبت سے عجب ہیں خرد و پیر

میر شیر علی افسوس نے بھی اپنی ایک مثنوی میں آصف الدولہ کا جشن ہولی بیان کیا ہے اور مرزا قتیل نے بھی "ہفت تماشا" میں لکھا کہ:

"در وقت آصف لدولہ مرحوم ..... دریں شہر ہم بسیار با تکلف بودہ ...
تمام روز رنگ گلال و ابیر وا خلاط یا لولیاں بود و شب ہولی بکنارہ دریا روشنی و آتشبازی قطب را حرکت بہ تماشائے خورمی داد" صد ۸۲

مرزا قتیل ہی نے "ثمرات البدائع" میں سعادت علی خاں کے "جشن ہولی" کا حال کئی صفحات میں بیان کیا ہے اور پھر ذیقعدہ ۱۲۱۷ھ میں منعقدہ ایسے ہی جشن میں خود اپنی شرکت کا بھی اظہار کیا ہے۔ اُنہوں نے "ہفت تماشا" کے صفحات ۸۲ و ۸۳ پر یہ بات بھی صاف صاف تحریر کر دی ہے کہ سعادت علی خان نے اپنے اوائل مسند نشینی میں چند سال تک ہولی کے جشن کی تقریب منعقد کی تھی لیکن پھر طبیعت پر غلبۂ مذہبی ایسا بڑھ گیا تھا کہ وہ اس رسم سے دست بردار ہو گئے تھے۔ بہرحال جب تک یہ جشن جاری رہا ہزاروں آدمی سنجاف کے زرد و زرنگین لباس پہن کر شریک جشن ہوتے تھے اور نواب کی سرکار سے خلعت و انعام پاتے تھے۔ سعادت علی خان کے بعد بھی یہ رسم جاری رہی چنانچہ محمد رضا برق عہد واجدی کے ان مشاغل کو اس طرح یاد کرتے ہیں سہ

اپنا ہولی میں عجب رنگ ہوا کرتا تھا — عرصۂ روئے زمیں تنگ ہوا کرتا تھا
حوضوں میں، نہروں میں سب رنگ ہوا کرتا تھا — تیر سے سانگوں کی دل ونگ ہوا کرتا تھا

چہروں پر مونیوں کی راکھ ملی جاتی تھی
دیکھ کر جوگنوں کو جان چلی جاتی تھی

اور صرف یہی نہیں بلکہ اوّل ناصرالدین حیدر نے اور پھر اُسے ترقّی دے کر واجد علی شاہ نے جند و دلیر مالا اور راگ مالا سے اپنے ذوقِ رقص و غنا کی تسکین کے کچھ اور ذرائع بھی پیدا کر لئے تھے جن کا تذکرہ اپنے مقام پر نظر آئے گا۔ مختصر یہ کہ ایسی بہت سی لطیف رسمیں رفتہ رفتہ لکھنؤ کے معمولات میں داخل ہو گئی تھیں جن کا تعلق زیادہ تر حِسِّ لطیف سے تھا اور جو احساسِ جمال اور تحریکِ عشق کے عمومی مواقع فراہم کرتی تھیں۔ غرض بادشاہوں اور اُمراء کے جذبۂ عیش کوشی کے ساتھ عوام کو بھی تماش بینی کی صورت میں اپنے جذبات کی تسکین کا سامان مل گیا تھا۔ اُس معاشرے میں چونکہ ہر شخص کو معاشی اطمینان حاصل تھا اس لئے نہ صرف شہزادگان اور اُمراء بلکہ شہر کے دوسرے خوش باش لوگ بھی حُسن پرستی کی طرف مائل تھے اور دربار سے چوک بازار تک ایک ہی رنگ نظر آتا تھا یعنی فیض آباد اور لکھنؤ کے گلی کوچے، حسین چہروں کے وجود، صنفِ نازک کی جاذبیت، رنگین صحبتوں کی دلربائی، لطیف گفتگو، برجستہ فقرے بازاری، محبوبوں کی طنز و تعریض، عاشقوں کی چھیڑ چھاڑ غرض معاملاتِ عشق کی گوناگوں کیفیتوں سے مملو نظر آتے تھے۔ کوچہ و بازار کی اسی چہل پہل نے سیّد انشا کو یہ کہنے کی ترغیب دلائی تھی کہ ؎

ہزاروں دلبروں کو یاں کی پریوں نے پچھاڑا ہے
نہیں یہ لکھنؤ، اک راجہ اِندر کا اکھاڑا ہے

اور واجد علی شاہ کے درباری شاعر کو بھی اس بات کا احساس تھا کہ ؎

قہقہے اُڑتے تھے جمگھٹ تھے پریزادوں کے — جلسے ہر روز ہوا کرتے تھے آزادوں کے
نالے سُنتے تھے نہ ہرگز کبھی فریادوں کے — کبھی آگاہ نہ تھے نام سے بیدادوں کے

کیا کہیں کس سے کہیں ہائے وہ صحبت کیا تھی
راجہ اندر کے اکھاڑے کی حقیقت کیا تھی

مغلیہ سلطنت کے زوال کے وقت ہندوستان کی سیاسی بے اطمینانی، اقتصادی سرد بازاری اور معاشی تنگی نے غریب اور نچلے طبقے کی بہت سی بے سہارا عورتوں کو طوائف یا خانگی بنا دیا تھا چنانچہ خاص دلی میں بھی محمد شاہ اور احمد شاہ کے عہد میں پیشہ ور عورتوں کی خاصی فراوانی نظر آتی ہے۔ شاہ حاتم نے اپنی ایک مثنوی میں جو ۱۱۴۷ھ ۱۷۳۴ء کی تصنیف ہے اُس ماحول کی بعض جھلکیاں دکھائی ہیں جن کا نمونہ کچھ اس انداز کا ہے:

جدھر دیکھو ادھر کوچہ و بازار ہُوا ہے گلرخاں سے صحنِ گلزار

ہر اک دوکاں پہ چشمک بازِ عیار کہ جن کی ہر نگہ پر تن و خریدار

ہر اک جا سبزہ رنگ و سروِ دلجو ہر اک تا ترک میانِ عنبریں مو

ہر اک ناز و ادا میں فتنۂ دہر ہر اک کا غمزہ پر خوں ریز ہے قہر

لیکن ان دلکش مناظرِ حسن کے باوصف دلی میں طوائف سے ربط و ضبط کو کوئی قابلِ وقعت کام نہیں سمجھا جاتا تھا۔ مجموعی طور پر وہاں کا خوش حال طبقہ اس تماش بینی کو معیوب اور عشقِ سادہ رُو کو قابلِ التفات سمجھتا تھا۔ غالباً یہ اس لئے تھا کہ اس معاشرے کو اپنے حالات، اپنے مستقبل اور اپنی تقدیر پر یقین نہیں تھا ہمیں نواب درگاہ قلی خاں کی کتاب "دہلی بارہویں صدی ہجری میں" کے اندر اگرچہ دلی کی بعض مشہور طوائفوں کا حال پڑھنے کو مل جاتا ہے لیکن اُسے دیکھ کر یہی محسوس ہوتا ہے کہ اُس سوسائٹی میں طوائف اپنا سماجی وقار کھو چکی تھی۔ شہر کے ماحول میں مایوسی کا عام احساس تھا اور افلاس نے طوائف اور خانگیوں کا بازار سرد کر رکھا تھا۔ لوگ جنسی محبت کے معاملے میں امرد پرستی کی طرف مائل تھے۔

دلی کے برخلاف اودھ میں معاشی فراغت اور خوشحالی تھی، تمدنی فروغ تھا، اور معاشرت اُس منزل پر پہنچ گئی تھی جہاں طوائف سے وابستگی کو عیب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ نفسیات کی اصطلاح میں کسی معاشرتی خرابی کے خوف کو ٹابو (TABOO)

سے تعبیر کرتے ہیں۔ دلّی میں طوائف طابو (TABOO) تھی لیکن لکھنؤ میں نہ تھی۔ چنانچہ لکھنؤ کے ذہین، صاحبِ علم و فن، شریف اور متموّل لوگ طوائف سے ربط و ضبط اور انس و محبت کو معیوب نہیں سمجھتے تھے۔

طوائف کی طرف رغبت کا کام سبب، انسان کی تنوّع پسندی ہوتی ہے۔ اسی جذبے کے تحت کبھی کبھی شادی شدہ مرد بھی بیوی کی پوری توجہ بلکہ سپردگی کے باوجود بے راہ رو ہو جاتے ہیں۔ گھر کی چہار دیواری میں محصور رہنے والی باعصمت عورت، اپنے شوہر کو وہ مجموعی لذت نہیں پہنچا سکتی جو اُسے طوائف کی بھڑکیلی فضا، جھوٹی خوشامد، بالارادہ محبت، آزمودہ اداؤں کی دلفریبی، اور بصورتِ کامیابی رقیبانہ افتخار، احساسِ فتح مندی اور پھر نئے جنسی تجربات سے حاصل ہوتی ہے۔ غیر عورت خواہ وہ طوائف ہی کیوں نہ ہو اپنے ذہن اور جسم کے اعتبار سے بھی ایک سربستہ راز ہوتی ہے جس کے انکشاف میں انسان نا تجربہ لذت محسوس کرتا ہے۔
اس لئے جب معاش کی طرف سے مطمئن معاشرے کی نگاہ کے سامنے کوئی بلند مقصدِ حیات نہیں ہوتا تو وہ بہت سے معاشرتی اور جنسی تجربات کی طرف رجوع کرتا ہے۔ بلا مقصد کئی کئی شادیاں کرنا، کنیزوں کی تعداد بڑھا لینا، طوائف سے منسلک ہو جانا اس کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے۔ چنانچہ لکھنؤ میں بھی یہی ہوا۔ یہاں کے اوسط انسان کو اپنی نو عمری ہی میں بالعموم جنسی تجربات حاصل ہو جاتے تھے اس لیئے وہ نت نئے چہرے کی تلاش، نئی جد و جہد کے آغاز نئی فتوحات کی کاوش، نئے انکشاف اور نئے جنسی تجربے کی طرف دوڑتا تھا۔ طوائف کے عشرت کدے میں اُسے وہی مجبوبی سکون ملتا تھا جو ہمارے دور میں سینما، تھیٹر، ریڈیو اور ٹیلی ویژن عام انسانوں کو مہیا کرتے ہیں۔

جب ہندوستان کی عام سیاسی افراتفری اور افلاس کی وجہ سے قرب و جوار کا حسنِ انسانی سمٹ کر لکھنؤ پہنچ گیا تو دولت اور حسن کی افراط کے باعث گلی کوچوں اور بازاروں میں شب و روز رنگین ہو گئے۔ یہی وہ وقت تھا جب دلّی سے آنے ہوئے پریشان حال شاعروں کو اپنے

فن اور طوائف کے جمال کی پسندیدگی کے تقابلی مطالعے نے اس نتیجے پر پہنچایا کہ ہمیں اپنے اظہارِ فن کا معاوضہ پچیس[۲۵] روپے ماہانہ ملتا ہے جب کہ طوائف پر سے دولت مٹھیوں میں بھر بھر کے نثار کی جاتی ہے مصحفی کہتے ہیں ؎

منعم ہتھیلیوں کے کھلتے ہیں از بہرِ طوائف

یعنی کہ یہ بگڑے ہیں سب ابلیس کے لائق

مختصر یہ کہ افراطِ حسن اور افراطِ دولت کی وجہ سے حسن اور عشق دونوں کو اپنے مرتبے مقام سے نیچے اتر کر ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کا موقع ملا۔ گویا حسن عام تفریح کا سبب بن گیا۔ ممکن ہے بعض لوگ اس نتیجے پر پہنچنے میں کچھ حق بجانب ہوں کہ افراطِ حسن اور اخراجِ جذبۂ محبت کی عمومیت اور فراوانی کے باعث لکھنؤ کے جذبۂ عشق میں کچھ تھکاوٹ محسوس ہوتی ہے۔ کاروبارِ محبت میں خلوص کم اور سرسری لگاوٹ، ہنسی، دل لگی، چھیڑ چھاڑ، طنز و استہزا، فقرے بازی، پھبتی، سجاوٹ، ٹھسّا، غمزہ اور نخرا زیادہ ہے چنانچہ ان مشاغل کی آئینہ داری لکھنؤ کی واسوخت میں صاف طور پر نظر آتی ہے۔ گویا لکھنؤ کی عشقیہ شاعری میں محبوبہ کا کردار کسی باعصمت حسینہ کے بجائے طرحدار لونڈی، طرآر خانگی، آبرو باختہ بیگم یا بازاری طوائف سے زیادہ مماثلت رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب اس گرماگرم ماحول میں دِلّی کا دردمند شاعر میر تقی میر داخل ہوگا تو اسے بھی یہی کہتے بن پڑے گی ؎

منعم پر عبیر عاشق اصرار سے ملے ہیں	کب ہاتھ کھینچتے ہیں معشوق کی نہیں سے
یک سو کلال منعم پر خوباں کے مل رہے ہیں	الجھے ہوئے ہیں یک سو گیسوئے نازنیں سے
جب میر جان و دنیا بوسے کے بدلے ٹھہرا	تب خوف کھینچے کیا پیشانیوں کی چیں سے

یہ بات سچ ہے کہ اپنی معاشرت اور روایت کے اعتبار سے لکھنؤ کی طوائف، دِلّی ہی کی طوائف کی ورثہ دار تھی لیکن لکھنؤ کی تہذیب و تمدن کے نئے آب و رنگ نے اس کی آواز میں لوچ، لہجے میں دل ربائی، اداؤں میں پرکاری اور لباس و آرائش میں ایک نئی

نئی دلفریبی پیدا کردی تھی۔ اسی لئے سیّد انشاؔ نے فیصلہ دیا تھا کہ "لکھنؤ کے معشوقوں کی زبان، پوشاک اور اداؤں کی فوقیت دہلی کے معشوقوں پر ظاہر اور صریح ہے" گویا لکھنؤ کی طوائف نے جب اپنے بناؤ سنگھار اور عادات و اطوار میں جدید تمدنی اور مجلسی خوبیاں پیدا کر کے شہر اور دربار کے مقتدر امیروں کی توجہ کو اپنی طرف کھینچ لیا تو اُس کے وجود سے یہاں کے اخلاقی تصور کی مصالحت خود بخود ہو گئی اور اس طرح عورت سے عشق، عورت کے جسم سے عشق، عورت کے لباس سے عشق، عورت کی زبان و بیان سے عشق، غرض عورت کی گوناگوں کیفیتوں اور دلفریبیوں سے عشق کو سندِ جواز مل گئی۔ اس طرح عورت کے تصور کو لکھنؤ کی تہذیب پر خاصا تسلط حاصل ہو گیا۔ گویا اب وہ یہاں صرف پست جذبات کی تسکین ہی کی علامت نہیں رہی بلکہ ایک ثقافتی ادارہ بھی بن گئی یعنی وہ ایک تہذیبی نمائندے کی حیثیت سے سامنے آئی جس کا کام یہ بھی تھا کہ درباری آداب و رسوم کو عوام میں مقبول بنائے۔ رقص و موسیقی کے کمالات نے اُس کی حیثیت کو زیادہ دلکش اور محترم بنا دیا تھا لیکن اس کی اہمیت کی بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ ایک تربیت یافتہ مدرس کی طرح اُمرا اور شرفاء کے بچوں کو مجلسی آداب بھی سکھاتی تھی۔ علاوہ ازیں نواب صاحب کے دیوان خانے میں اُس کی بذلہ سنجیوں اور فقرہ بازیوں سے محفلیں زعفران زار بن جاتی تھیں۔

طوائف کے وجود نے اَوَدھ میں مجلسی دستور کے علاوہ رقص و موسیقی کے ذوق کی بھی حفاظت کی۔ یعنی ان فنون کو عوام میں مقبول بنا کر ہندوستان کے صدہا سال کے غنائی تجربات کو محفوظ رکھنے کا کام سر انجام دیا۔ قدیم ہندوستان میں ناچ، گانا اور ساز تینوں کے لئے سنگیت کا لفظ استعمال ہوتا تھا۔ ناچ کے لئے سنسکرت کا مترادف لفظ "ناٹ" تھا جس کے معنی بدن کی ایسی حرکات کے تھے جو دل کے جذبات اور خیالات کو ظاہر کرے۔ اسی "ناٹ" سے ناٹک کا لفظ وجود میں آیا تھا جو ڈراما، رقص اور موسیقی کے امتزاج کو ظاہر کرتا تھا۔ اَوَدھ کی طوائف انفرادی طور پر ناٹک تو پیش نہیں کر سکتی تھی کیوں کہ یہ کام بڑے اہتمام کا متقاضی

تھا۔ بہر حال اُس نے اپنے محدود وسائل کے ساتھ رقص و موسیقی کے ذوق کی ترویج خوب کی۔ اسی لئے اَوَدھ کے مشہور مغنّیوں کی فہرست میں طوائفوں کی تعداد اوسطاً بہت زیادہ ہے۔

دلّی میں موسیقی "خیال" سے آگے نہیں بڑھی تھی۔ "خیال" اُس راگ کا نام تھا جو دیوتاؤں کے حضور اظہارِ عقیدت کے طور پر گایا جاتا تھا۔ امیر خسرو نے بھی اسے بزرگانِ دین کے ساتھ اظہارِ عقیدت ہی کے لئے مخصوص کر دیا تھا۔ چنانچہ نعت و منقبت وغیرہ اسی طرز میں گائی جانے لگی تھیں۔ پھر کئی صدی بعد محمد شاہ کے عہد میں سدا رنگ مشہور گویّا ہوا جو اس مخصوص راگ کے گانے میں کمال رکھتا تھا۔ مختصر یہ کہ دلّی کے زوال کے زمانے میں عہدِ اسلامی کی موسیقی محض قوّالی تک محدود رہ گئی تھی جسے مردانہ طائفے گاتے تھے۔ لکھنؤ میں جب طوائف کا سماجی وقار اُبھرا تو اُس موسیقی پر زیادہ توجّہ ہونے لگی جو عورتوں سے مخصوص تھی۔ گویا اس منزل پہ موسیقی میں غنائیت اور تغزّل کا اثر فزوں تر ہو گیا۔ یعنی برہ اور جدائی کے اظہار پر خاص توجہ ہوئی۔ ٹھُمری چونکہ اس موضوع سے مخصوص تھی اس لئے وہ لکھنؤ میں بہت پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی جانے لگی۔ ٹھُمری کے علاوہ بھیرویں، ساونی، ہوری، پیٹڑ اور کجری وغیرہ بھی پسند کی گئیں جن کے گانے میں عورت کی دلکشی آواز کی ضرورت تھی اور وہ یہاں کی طوائف مہیّا کرتی تھی۔

جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں موسیقی کا ایک لازمی جُزو رقص بھی تھا۔ وہ بھی طوائف کے وجود سے لکھنؤ میں زندہ رہا لیکن اس کے علاوہ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ ہندو روایات میں بھیرو رقص کا دیوتا کہلاتا ہے۔ اُس کا مندر لکھنؤ میں موجود ہے۔ اس لئے یہاں کی ہندو روایات میں رقص کو خاصی اہمیت حاصل رہی ہے، چنانچہ ہر عہد میں لکھنؤ نے رقص کے ماہر پیدا کئے ہیں۔ جب نوابینِ اَوَدھ کا دَور آیا تو دربار نے اس فن کی بھی سرپرستی کی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ واجد علی شاہ کے عہد میں رقص کے دو زبردست ماہر کالکا اور بندا دین موجود تھے جو کتھک ناچنے میں کمال رکھتے تھے۔ غرض دربار کی سرپرستی، عوام کی دلچسپی اور طوائف کی توجّہ سے لکھنؤ میں رقص کو بھی خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ مجموعی طور پہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اَوَدھ کا

کا شاہی زمانہ ان فنونِ رقص و غنا کے لئے بھی بہت ساز گار تھا بالخصوص واجد علی شاہ کے دربار میں پیارے خاں، قطب علی خاں ، چھوٹے خاں ، غلام رضا خاں، غلام حیدر خاں، غلام نبی خاں محمد حسن خاں ، حیدر علی ، نثار علی ، خواجہ بخش خاں وغیرہ اپنے وقت کے ماہرینِ فنِ موسیقی بڑی بڑی تنخواہوں پر ملازم تھے جو پری خانے کی مہ جبینیوں کو فنِ موسیقی کی تعلیم دیتے تھے۔ ان میں سے قطب علی خاں کے متعلق واجد علی شاہ تاریخِ پری خانہ میں رقمطراز ہیں کہ " وہ فنِ موسیقی اس قدر جانتا تھا کہ نائک بیجو ، نائک گوپال اور تان سینِ وقت تھا " واجد علی شاہ نے اس سے ستار بجانا سیکھا تھا اور پھر وہ مہارت پیدا کر لی تھی کہ محفلیں اور مجلسیں دنگ رہ جاتی تھیں۔ بادشاہ اپنے کمالات کے بارے میں خود لکھتے ہیں کہ :۔

" سننے میں لوگ رو دیتے تھے اور رونے میں ہنس دیتے تھے ۔ پیارے خاں میری تعریف کرتا اور وجد کرتا تھا ۔ کبھی قطب علی خاں میرے ہاتھ چوم لیتا تھا " [۱]

مختصر یہ کہ جب واجد علی شاہ کا میوزک کالج بنام " پری خانہ " تیار ہوا تو بقولِ بادشاہ اُس نے جیسا چاہیے ویسا جلوہ حاصل کیا ۔ ان حسیناؤں کا گانا دل میں اختلاج اور مشتاقوں کے کانوں میں گرمی پیدا کرتا تھا ۔ رفتہ رفتہ ان کو فنِ موسیقی میں اس قدر کمال حاصل ہو گیا تھا کہ راجہ اندر کو کوہ قاف کی پریوں کے مقابلے میں ، ان کی چستی و چالاکی پر رشک و حسد ہوتا تھا " [۲]

معاشی فراغت اور مقامی اثرات کے مطالعے کے بعد اب ہم یہاں کی سب سے اہم خصوصیت یعنی معتقدات کے ایک خاص پہلو کا جائزہ لیتے ہیں ۔ دلی کی مغلیہ تہذیب کا سب سے بڑا سرچشمہ ایران تھا جہاں سے اُمراء علماء اور شعراء کے توسط سے صفوی عہد کی بہت سی تہذیبی خصوصیات ہندوستان کھنچ آئی تھیں ۔ صرف ایک چیز جو کسی حد تک تشنۂ تکمیل تھی وہ وہاں کے مذہبی رسم و رواج کے بعض جزئیات تھے جن کے قبول کرنے میں دونوں سلطنتوں کے مذہبی نقطۂ خیال کا اختلاف مانع تھا ۔ جب اودھ میں ایک آزاد ریاست کا تصور قائم

ہوگیا تو حکومت کے سائے میں شیعی روایات بڑی سرعت اور تفصیل کے ساتھ پھیلنا شروع ہو گئیں۔ شجاع الدولہ ان روایات کا سخت پابند تھا۔ چنانچہ جب کبھی کسی جنگی پڑاؤ کے وقت یا سفر کے دوران محرم کا زمانہ آگیا تو انہوں نے تمام ضروری رسمیں بڑے خلوص کے ساتھ اُسی طرح ادا کیں جیسے وہ اپنے گھر پر کرتے تھے۔ پھر جب آصف الدولہ کا عہد آیا تو ایک قدم اور آگے بڑھا یعنی شمالی ہندوستان میں پہلی بار شیعوں کی باقاعدہ نمازِ جمعہ و جماعت الگ قائم ہوئی۔ اس کے بعد علماء اور مجتہدین کا اثر و نفوذ بڑھا۔ لکھنؤ نے منطق، فلسفہ، فقہ اور علمِ کلام میں پہلے ہی سے نام پیدا کر رکھا تھا، اب شیعہ اثر نے ایران سے رشتہ جوڑ کر ان علوم میں وسعتِ نظر پیدا کی۔

عزاداری، شیعیت کی ایک بنیادی رسم ہے، اس لئے اُودھ میں شیعیت کے عروج کے ساتھ محرم کی دھوم دھام بھی بڑھتی رہی یہاں تک کہ رفتہ رفتہ لکھنؤ میں سیکڑوں امام باڑے، درجنوں کربلائیں اور ائمہ معصومینؑ کے روضوں کی بہت سی عمارتی نقلیں تعمیر ہوگئیں۔ چنانچہ اس شہر میں آج بھی روضۂ امام رضاؑ، روضۂ حضرت زینبؑ، روضۂ حضرت عباسؑ روضۂ امام موسیٰ کاظمؑ و امام محمد تقیؑ، روضۂ نجفِ اشرف، روضۂ پسرانِ حضرت مسلمؑ، کاظمین اور مسجدِ شام وغیرہ کی متعدد عمارتی نقلیں موجود ہیں اور ان کے علاوہ کربلائے دیانت الدولہ، کربلائے نواب عظمت الدولہ، کربلائے نواب معتمد الدولہ، کربلائے نواب سعید الدولہ، کربلائے نواب ملکۂ آفاق، کربلائے حاجی میتا، کربلائے بی مصری، کربلائے میر خدا بخش اور کربلائے نصیر الدین حیدر وغیرہ واقع ہیں۔ امام باڑوں کی تعداد کا شمار اس لئے مشکل ہے کہ گلی گلی اور کوچے کوچے میں علم نصب ہوتے اور گھر گھر میں مجلسیں منعقد ہوا کرتی تھیں۔ لوگ جگہ جگہ لنگر اور سبیلیں جاری کرتے اور محبتِ اہلِ بیتؑ میں روپے کو پانی کی طرح بہاتے تھے۔ غرض اس لحاظ سے لکھنؤ کو نہ صرف دِلی کے مقابلے میں بلکہ تمام دنیا میں ایک منفرد حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ اس اہتمام کے ساتھ عزاداری منانے کا یہ اثر ہوا کہ ہر نقطۂ خیال کا آدمی کسی نہ کسی پہلو سے امامؑ اور اہلبیتؑ کے غم میں شریک

ہوگیا۔ یہ اثرات صرف مسلمانوں کے مخصوص فرقوں یعنی سُنّی اور شیعہ تک ہی محدود نہ رہے بلکہ لکھنؤ کے ہندوؤں اور عیسائیوں تک نے بلا تفریق مذہب وملت، محرم کی بہت سی رسمیں خلوص و عقیدت کے ساتھ ادا کیں اور مسلمانوں کے ساتھ عزاداری میں حصّہ لیا۔ چنانچہ آج بھی محلّہ نواز گنج میں جھاؤ لال کا امام باڑہ موجود ہے۔ اسی طرح راجہ ٹکیت رائے، راجہ مہرا اور راجہ میوہ رام کے بھی ذاتی امام باڑے ہوا کرتے تھے جن کی تعمیر و تزئین پر ان کے بانیوں نے لاکھوں روپے صرف کئے تھے۔ گویا مسلمانوں کی طرح ہندو عوام بھی عَلَم نصب کرتے، تعزیئے نکالتے، مہندیاں اٹھاتے سوز خوانیاں کرتے اور مرثیے پڑھتے تھے۔ مرثیہ گوئی کے ذیل میں بھی مسلمان شعرا کے ناموں کے ساتھ ساتھ ہندو شاعروں کے نام آتے ہیں چنانچہ راجہ اُلفت رائے اُلفتؔ اور کنور دھنپت رائے محبؔ کا اس نوع کا کلام اب بھی موجود ہے۔ محبؔ کے مرثیوں اور سلاموں کا ایک ضخیم مجموعہ پروفیسر مسعود حسن رضوی کے پاس ہم نے کبھی دیکھا تھا جو غالباً ابھی محفوظ ہوگا۔ اس مجموعے کے شروع میں ایک مجلس کے دعوت نامے کی نقل شامل تھی جس سے پتہ چلتا تھا کہ اس مجلس میں اُن کے یہاں مرزا دبیر مرثیہ پڑھنے والے تھے۔ مختصر یہ کہ شیعیت کے تاثر میں بہت سے ہندو حضرات نے بھی ماتم داری کی اور مرثیے تصنیف کئے۔

مذہب کے اس نئے رُخ نے زندگی کے بہت سے شعبوں کو متاثر کیا اور تمدن، تہذیب اور معاشرت کا آب ورنگ بھی اس نئے نقطۂ نظر سے خاصا تبدیل ہوگیا۔ مثال کے طور پر اگر آپ لکھنؤ کے عام مکانوں کی ساخت پر غور فرمائیں تو یہ نکتہ بڑی آسانی سے واضح ہوجائے گا کہ شیعیت کے استحکام سے قبل یہاں کے مکانوں کی بناوٹ میں وہ خاص اہتمام نہیں ہوتا تھا جو بعد میں ملحوظ رکھا گیا یعنی ہر شیعہ چونکہ آئے دن بالخصوص محرم کے زمانے میں مجلس عزا منعقد کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا اس لئے مکانوں کی تعمیر کے وقت اس قسم کے مجلسی اجتماعات کی گنجائش رکھی جانے لگی۔ چنانچہ عَلَم اور دوسرے تبرکات کے لئے ایک شہ نشین کی تعمیر اور حاضرین مجلس کی نشست کے لئے کشادہ دالانوں اور وسیع صحن کا تصور لازمی ہوگیا۔ شیعیت کے یہ اثرات صرف مکانوں

کی مخصوص ساخت تک ہی محدود نہ رہے بلکہ خواص و عوام کے اندازِ فکر اور سیرتوں تک میں سرایت کر گئے۔ مجالسِ عزا کی شرکت نے لوگوں میں مذہبی احساس اس قدر رچا دیا تھا اور ان کی معلومات میں یہاں تک اضافہ ہو گیا کہ ہر عامی و جاہل شخص بھی اسلامی تاریخ کے بہت سے پہلوؤں، فقے کے مسئلوں اور منطق کی موشگافیوں پر آزادی سے گفتگو کر سکتا تھا۔ شہدائے کربلا اور ائمہ کی سیرتوں کے بیانات سُن سُن کر وہ معاشرہ عام طور پر استبداد و تشدد کا مخالف ہو گیا تھا۔ انسان دوستی اور نرم دلی ہر شخص کا شعار تھا۔ کسی کا دل دکھانا یا کسی پر ظلم کرنا انہیں پسند نہ تھا۔ لکھنؤ کے صاحبِ اقتدار لوگ، اپنے مجرموں کو بھی ایسی سزائیں نہیں دیتے تھے جن سے انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ دلّی کے عروج اور زوال دونوں زمانوں میں جب تک بادشاہوں کا اقتدار باقی رہا اس طرح کی سزائیں عام تھیں کہ تخت کے متوقع دعویداروں اور وارثوں کی آنکھیں نکلوالیں، مجرموں کی زبانیں ترشوادیں، زندہ لوگوں کی کھالیں کھنچوالیں، چھلّے گرم کروا کے آدمی کی بوٹیاں نچوالیں وغیرہ لیکن اودھ کے پورے دورِ حکومت میں اس نوعیت کی ایک بھی سزا سننے میں نہیں آئی۔ تمام ملک میں مذہبی رواداری کی جو فضا عام تھی اُس کا بڑا سبب یہی نرم دلی اور دردمندی تھی۔ لیکن مجلسِ عزا میں سوگواری کے جلوسوں میں اور ماتم کے حلقوں میں گریہ و زاری کے عام رواج نے اُس معاشرے کو بعض فوائد کے ساتھ ساتھ یہ نقصان ضرور پہنچایا کہ کچھ ایسے لوگ جو ذہنی اعتبار سے کچھ زیادہ بلند نہ تھے یا جن کے کردار بعض نمایاں کمزوریاں رکھتے تھے۔ وہ تن آسان بن گئے۔ محرّم میں آنسوؤں سے رومال بھگو لینے کو نجاتِ دارین سمجھ کر وہ مطمئن ہو جاتے تھے کہ اُن کے سال بھر کے گناہوں کا کفارہ ادا ہو گیا۔ اودھ کی اعتدال سے بڑھی ہوئی عیش پسندی میں یہ جذبہ بھی کسی نہ کسی حد تک ضرور کارفرما رہا ہے۔ جب غازی الدین حیدر اور نصیر الدین حیدر جیسے عیش پسند بادشاہ تمام سال مبتلائے خرافات رہنے کے بعد محرّم کے چند روزہ غم میں سکونِ آخرت ڈھونڈھ لیتے تھے تو عوام اس احساس سے کیسے بیگانہ رہ سکتے تھے۔

لکھنؤ کی ایک اور نمایاں خصوصیت یہاں کا بڑھا ہوا احساسِ نفاست و شائستگی،

نزاکتِ طبع اور شعورِ اخلاق ہے۔ اس کے محرکات میں اوُدھ کی جغرافیائی خصوصیات کے علاوہ یہاں کے حکمرانوں کی نسلی شائستگی، اُن کے وطنِ آبائی یعنی نیشاپور کی تہذیبی نفاست اور پھر دلّی پر سبقت لے جانے کے جذبے کو نمایاں حیثیت حاصل رہی ہے۔ دلّی مٹتے مٹتے بھی اپنی شجاعت، اپنی سپاہیانہ آن بان اور اپنی معرکہ آرائیوں کو نہیں بھول سکی تھی اس لئے اُس کی عام تہذیبی روایات اور اس کی آبادی کے اطوار و عادات اور زبان و بیان میں وہ لوچ اور نرمی نہیں تھی جو لکھنؤ سے مخصوص ہے۔ لکھنؤ کی ریاست ایسے وقت معرضِ وجود میں آئی جب مُلکی فتوحات ختم ہو گئی تھیں، بیرونی دشمن باقی نہیں رہے تھے۔ فوجی طاقت سے زیادہ سیاسی اہمیت کی ضرورت تھی، کوئی بلند مقصدِ حیات قوم کے سامنے نہیں تھا۔ اندرونی سرکشی بھی قریب ختم تھی۔ انگریز کی سیاسی قوت کے سائے میں اپنی تقدیر پہ شاکر رہنا، اپنے فطری رجحانات کی تکمیل کرنا اور اپنی تہذیب کے خدوخال سنوارنا زیادہ سے زیادہ یہی مقاصد اُن فرمانرواؤں کے سامنے باقی رہ گئے تھے۔ گویا اُن کی سیاسی بے بسی نے اپنے لئے ثقافتی شعور کے آب ریز تلاش کر لئے تھے۔ اب یہاں کے لباس، طعام، عادات و اطوار، ضبطِ اخلاق، آدابِ محفل، معیارِ شرافت، طرزِ تکلم، فنونِ لطیفہ، زبان و بیان کے انداز حتّٰی کہ ضمیر و خمیر تک میں ایک نیا سایہ، ایک نئی روشنی اور ایک نئی نفاست پیدا ہو گئی۔ لہجہ سامع نواز تھا۔ تکلم میں دلکشی تھی۔ ذہن میں جودت اور طبیعت میں شگفتگی تھی۔ مزاج میں مروّت، نرمی اور شائستگی نمایاں تھی۔ تیز چلنے کو آدابِ شرفاء کے خلاف سمجھتے تھے۔ قربانی کے جذبے نے "پہلے آپ" "پہلے آپ" کا شعور پیدا کر دیا تھا۔ ہر آنے والے شخص کے مرتبے کے لحاظ سے چار سلام رائج تھے۔ یعنی کچھ لوگوں کے سلام کے لئے صرف ہاتھ اُٹھا دیا جاتا تھا، بعض لوگوں کے لئے رُبع قد سے اُٹھتے تھے، کچھ کے لئے نیم قد سے بلند ہوتے تھے اور کچھ مخصوص لوگوں کا سلام قد سے استقبال کرتے تھے۔ مفلسی میں بھی اپنی شان اور عظمت کو برقرار رکھتے تھے۔ وضع کی پابندی اُن کا دستور تھا۔ کسی کے ساتھ کچھ اچھا سلوک کر کے اُس سے آنکھیں نہیں ملاتے

تھے یعنی امداد و وظائف دیتے وقت اپنی نظریں نیچی رکھتے تھے۔ مختصر یہ کہ لکھنؤ نے تہذیب، مذہب، علم اور ادب سب کا ایک نیا معیار قائم کیا تھا۔ جوش ملیح آبادی " یادوں کی برات " میں لکھتے ہیں کہ:۔

" نصیرالدین حیدر سے لے کر حضرت جانِ عالم کے زریں دور تک لکھنؤ کے اولیائے علم اور ائمۂ ادب نے شائستگی، تہذیب، نفاست، لطافت اور آداب کی نجابت کا دستور قائم کیا تھا، اور اس کے دوش بدوش انہوں نے، وضعداری، ایثار پسندی، تواضع شعاری، نرم گفتاری، شیریں لہجگی اور بلند مزاجی کو فروغ بخشا تھا[۱]

ہر چند کہ یہ کلچر آمادۂ زوال تھا لیکن اس میں اپنی ذات چمک دمک اور انفرادی شان و شوکت تھی۔ انقلاب کے وقت فرانس میں جو جاگیردارانہ کلچر موجود تھا اُس سے لکھنؤ کے کلچر کو بڑی مماثلت ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ فرانس بھوکا تھا اور لکھنؤ دولت مند۔ فرانس کا کلچر باہر سے آیا تھا اور لکھنؤ کا کلچر خود اپنے تمدن کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ فرانس میں اندرونی طاقت اُس کلچر کو مٹانے کے لئے اُٹھی تھی لیکن لکھنؤ میں اندرونی طاقت اُس کی مقلد اور پرستار تھی اور بیرونی طاقت اُسے مٹانے آئی تھی۔

اس تفصیل کو مختصر کرنے کے لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ لکھنویت نام تھا مخصوص معتقدات میں استغراق کا، علم و فضل میں ایک خاص ترقی اور بالیدگی کا، تہذیب و تمدن میں نزاکت و لطافت کی تخلیق کا، اور ہر شعبۂ حیات میں جدت و نفاست کا۔ اسی تہذیب سجاوٹ کی یاد میں غالب نے کہا تھا کہ:۔

" ہائے لکھنؤ! کچھ نہیں کھلتا کہ اُس بہارستان پر کیا گزری۔ لکھنؤ کا کیا کہنا! وہ ہندوستان کا بغداد تھا۔ اللہ اللہ! وہ سرکار اُمید گر تھی، جو بے سرو پا وہاں پہنچا امیر بن گیا[۲]

عبدالحلیم شرر لکھتے ہیں کہ:۔

" زبان اور شاعری کے کمالات کے ساتھ لکھنؤ نے علم و فضل میں بھی ہندوستان کے

تمام شہروں سے زیادہ ترقی کی۔ اگر سچ پوچھیے تو علوم کے اعتبار سے لکھنؤ، ہندوستان کا بغداد اور قرطبہ اور اقصائے مشرق کا نیشاپور اور بخارا تھا۔" [۱]

میر انیس نے حیدر آباد (دکن) میں سخن فہموں کی کمی محسوس کرتے ہوئے ایک بھری مجلس میں اُسے اس طرح یاد کیا تھا۔

"ہائے لکھنؤ! تجھے کہاں سے لاؤں۔" [۲]

منیر شکوہ آبادی نے اسی لکھنؤ کا سہاگ لٹنے پر اس طرح ماتم کیا تھا ۔

جس بزمِ جانفزا میں ابھی کل کی بات ہے
خالی سرور سے دلِ پیر و جواں نہ تھا

فرشِ لطیف دامنِ نظارہ سے لطیف
ذی رتبہ مہرِ فرش سے تاجِ شہاں نہ تھا

فانوسیں تھیں گلوئے پریزاد سے سوا
روشن تھیں صاف نور کی شمعیں دھواں نہ تھا

ہر روشنی تھی برقِ تجلّی سے آشنا
بیگانہ شمعِ طور سے اک شمعداں نہ تھا

پھولوں کی ہر طرف تھیں ہزاروں پھلجھڑیاں
بیدار بخت، خوابِ مسرت کہاں نہ تھا

میوے کی ڈالیاں، کہیں پھولوں کی ڈالیاں
سرسبز جن کے سامنے باغِ جناں نہ تھا

آبِ گہر کی موج تھی ہر نہر سے بلند
فوارہ وہ نہ تھا کہ جو گوہر فشاں نہ تھا

نگیرے تھے اسادرے کے بادلے کے جال
جھالرے موتیوں کی جُدا سائباں نہ تھا

اربابِ عیش کی کہوں کیا خوش سلیقگی
وہ کون تھا کہ ہمسرِ شائستہ خاں نہ تھا

پریوں کے جھنڈ تھے کہیں جھرمٹ حسینوں کے
محبوب جن کے آگے مہِ آسماں نہ تھا

نتھنے کے عطر کو سرِ مو بھی نہ تھی جگہ
آشفتہ کوئی گیسوئے عنبر فشاں نہ تھا

چھائے ہوئے تھے چھینٹی رنگوں کے قمقمے
جن سے شگفتہ تر چمنِ زعفراں نہ تھا

ڈھولکی بجا بجا کے بلاتے تھے عیش کو
گانے کی دھوم تھی، کہیں نامِ فغاں نہ تھا

طنبورے کے چٹکے، شاہ سدا رنگ کے خیال
بُلبل کے بھی ترانے کو رتبہ وہاں نہ تھا

مستانہ غزلیں تھیں، طرب انگیز ٹھمریاں
وہ کون تھا جو عاشقِ رقصِ بتاں نہ تھا

وہ ناچ سحر کا، وہ تنا نا طلسم کا — وہ بھاؤ تھے کہ زخمِ محبت گراں نہ تھا
طنبوروں سے ملے ہوئے سارنگیوں کے سُر — بین اور سُر سنگار میں خلطہ کہاں نہ تھا
حیرت سے دم بخود تھے نکیسا و باربد — حاصل کسی کو مرتبہ پیار خاں نہ تھا
باہیں گلے میں تھیں، کہیں طوق کمر تھے ہاتھ — ایسا پری معانقہ جسم و جاں نہ تھا
مسکی ہوئی مسالے کی باریک کُرتیاں — لاہی کی محرموں میں جو کچھ تھا نہاں نہ تھا
وہ بزم دلفریب تھی ایسی کہ رات بھر — رنج و ملال کے لئے رستہ جہاں نہ تھا

دیکھا اُسی طلسم خوشی کو جو صبح دم
بجز چغد اور کوئی وہاں نوحہ خواں نہ تھا [۱]

اور واجد علی شاہ کے اُستاد فتح الدولہ بخشی الملک محمد رضا خاں برق اُن نشاط افزا صحبتوں کو یاد کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ؎

گُل کے مذکور یہ ہیں، اپنے بھی افسانے تھے — رشکِ فردوس پری شہر کے میخانے تھے
تھالیاں ہیروں کی تھیں، لعلوں کے پیمانے تھے — ماہ و خورشید رُخِ شمع کے پروانے تھے
سب ہوا خواہ سلیمان کہا کرتے تھے
رات دن پریوں کے جھرمٹ میں رہا کرتے تھے

میز ہر روز لبِ نہر چُنی جاتی تھی — چادرِ ماہ دوپٹوں کو چُنی جاتی تھی
بات کانوں سے نہ سُننے کی سُنی جاتی تھی — بزم میں گرمیِ صحبت سے بھُنی جاتی تھی
نکہتِ زُلف سے گھر دشتِ ختن ہوتا تھا
پھولوں کی ڈالیوں سے صحن چمن ہوتا تھا

بوتلوں عطر لنڈھاتے تھے لگانا کیسا، — سب خیں آپ سے آتے تھے بُلانا کیسا!
عذرِ سیج پیش نہ جاتے تھے بہانا کیسا — تیر مژگاں کے کھاتے تھے نشانا کیسا؟
ایک کی ایک کو مطلق نہ خبر ہوتی تھی
محفلوں جلسو ہوتی تھی

باغ میں روز گُلال اُڑ کے شفق ہوتا تھا | بادلا چرخ کا سونے کا وَرَق ہوتا تھا
حاجتِ رنگ نہ تھی رنگ عرق ہوتا تھا | خاک پر گر کے ابیر ایک طبق ہوتا تھا

چاند سورج گُلِ رُخسار سے شرماتے تھے
تارے مُقیّش کے ذرّوں سے نظر آتے تھے

جگھٹیاں نور کی تیّار رہا کرتی تھیں | قسمتیں سوتوں کی بیدار رہا کرتی تھیں
آنکھیں مستی میں بھی ہشیار رہا کرتی تھیں | کوٹھیاں باغ کی گلزار رہا کرتی تھیں

سیریں رہتی تھیں دلِ تنگ کے بہلانے کو
روز ہر صبح کو جاتے تھے ہَوا کھانے کو

سقّے کیوڑے سے چھڑکتے تھے ہماری سڑکیں | پلکوں سے جھاڑتی تھی بادِ بہاری سڑکیں
غیرتِ گلشنِ فردوس تھیں ساری سڑکیں | رہتی تھیں پیشِ نظر ہائے وہ پیاری سڑکیں

لکھنؤ کی انہیں گلیوں میں پھرا کرتے تھے
غش میں آ آ کے تماشائی گرا کرتے تھے

بیڑے ہم چھوڑتے تھے گومتی پر جاڑوں میں | جلسے رہتے تھے شب و روز پری زادوں میں
شہرے تھے اپنے فنِ عشق کے اُستادوں میں | لوگ کہتے تھے ہمیں زُلف کے آزادوں میں

بے فرنگی محل اُن روزوں میں آرام نہ تھا
رات دن سیر سپاٹے کے سوا کام نہ تھا

پھر اس تہذیب کے مزار یعنی • مٹیا برج • کو ہمارے عہد کے شاعرِ انقلاب نے اس طرح خراجِ عقیدت، پیش کیا ہے :-

دَورِ ماضی کا وہ جواہر دُرج ، | ہائے وہ بارگاہِ مٹیا برج
پائے تختِ فنونِ لاثانی | مرکز و محورِ زباں دانی ،
مسندِ زرنگارِ چنگ و رباب | خشتِ گنبدِ بلور و حباب

قبرِ حسنات و مدفنِ برکات — حرمِ رقص و کعبۂ نغمات
مرقدِ آبروئے شعر و سخن — مجلسِ تاجدارِ کشورِ فن
حلقۂ گلفشانِ تفنن کا — مقبرۂ مرمریں تمدن کا
وہ لطافت کے کارواں کا غبار — رُوکشِ خلد، لکھنؤ کا مزار
جس کے ذرات میں مہ و پرویں — آسماں جس میں دفن ہے وہ زمیں

اب آئیے اس بات پر بھی غور کرلیں کہ لکھنؤ کی شاہی حیثیت ختم ہوجانے کے بعد اُس تہذیب کا کیا حشر ہوا جو دربار سے چوک بازار تک یکساں پسندیدہ اور مقبول تھی جس کی تخلیق میں امیر اور غریب، عالم اور جاہل، ہندو اور مسلمان، شاعر اور صوفی، سپاہی اور تاجر، مرد اور عورت ہر شخص کا بقدرِ ہمت وحیثیت حصہ تھا۔ ہرچند کہ بادشاہ معزول ہوکر شہر بدر ہوگئے تھے۔ دربار ٹوٹ گیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں لکھنؤ کی اینٹ سے اینٹ بج گئی تھی۔ انگریز کا تسلط اور اقتدار بڑھ گیا تھا، معاشی حالات دگرگوں ہوگئے تھے لیکن وہ تہذیب زندہ و تابندہ تھی جس میں "غلط العام" کو فصیح سمجھا جاتا تھا۔ مُراد یہ کہ تہذیب کے اختلاطی اور امتزاجی عناصر کا باہمی جذب ایسا قوی تھا کہ اُس جسم سے رُوح جُدا نہیں ہورہی تھی۔ چنانچہ لکھنؤ کی تباہی کے تقریباً نصف صدی بعد بھی ان تہذیبی عناصر کی مقبولیت کا یہ حال تھا کہ لکھنؤ سے بیتر میل کے فاصلے پر ملیح آباد میں سکونت پذیر ایک آفریدی گھرانے کی اندرونی فضا اس انداز پر قائم تھی:۔

"دوپلی ٹوپیاں، ململ اور ریشم کے کرتے، شربتی انگرکھے، سلمے ستارے کی رضائیاں، مخمل کے لحاف، چوک کا عطر، قنوج کا تیل پھلیل اور مشرو کے پاجامے راہ پا گئے اور پتنگ بازیاں، مرغ بازیاں، بٹیر بازیاں اور اُن کی پالیاں ہونے لگیں — اور ہم نے "السلام علیکم" کے بجائے "آداب، تسلیمات" کورنش اور بندگی کو اختیار کرلیا اور اس کے ساتھ ساتھ بیت بازیاں اور مشاعرے بھی ہونے لگے اور صحتِ زبان کے تصور نے بھی آنکھیں کھول دیں۔" (یادوں کی برات صفحہ ۲۴)

"میری حویلی کی اندرونی فضا — ہر طرف روشنی تھی، رنگینی تھی، چہل پہل تھی، لونڈیاں، باندیاں، مامائیں، اصیلیں، مغلانیاں، اتائیں، دَدائیں، کھلائیاں — اُستانیاں، نکسوں کی ڈوری کھینچنے اور راتوں کو کہانی سنانے والیاں، چاروں طرف چلتی پھرتی اور ہنستی بولتی نظر آتی تھیں۔" (یادوں کی برات صفحہ ۴۴)

"خدمت گاروں، رکاب داروں، فرآشوں، سپاہیوں، مرلوں، مصاحبوں، داستان گوؤں، منشیوں، ضلع داروں، کارندوں کا ہر طرف، ایک ہنگامہ سا برپا رہتا تھا۔"

(یادوں کی برات صفحہ ۴۴)

"آٹھ کہاروں والے میانے" (صفحہ ۶۳)

"گھر سے چلتے وقت دادی جان نے ہم سب کے بازوؤں پر امام ضامن باندھے، حیدری خانم قرآن کو ہاتھوں پر بلند کر کے، انگنائی کے کنوئیں کی جگت پر جا کر کھڑی ہو گئیں، جس کے نیچے سے ہم سب ایک ایک کر کے گزرے۔ ماماؤں، اصیلوں نے "دہی مچھلی" کی آوازیں بلند کیں (اس کو آغازِ سفر کا نیک شگون سمجھا جاتا تھا یعنی جس طرح دہی اور مچھلی میں سازگاری ہوتی ہے ویسی ہی سفر میں شاملِ حال رہے") (یادوں کی برات صفحہ ۱۱۶)

"لکھنو اور کان پور ہوتی ہوئی جب ہماری گاڑی ٹُنڈلا جنکشن پہنچی تو "دودھ گرام، دودھ گرام — پوڑی کا چوڑی (دودھ گرم پوری کچوری)" کے نعروں نے بوکھلا دیا اور کانوں کو اُن کے بگڑے لہجوں سے پتا چل گیا کہ ہمارا قافلہ اودھ سے بہت دور آچکا ہے۔"

(یادوں کی برات۔ صفحہ ۱۱۸)

اب آئیے جوش ملیح آبادی کی چشمِ حیرت اور ذوقِ تماشا کے ساتھ آپ کو بھی اب سے ساٹھ سال پہلے کے لکھنؤ کی بیز نگیوں کا نظارہ کرائیں:۔

"میں نے اکبری دروازے میں جیسے ہی قدم رکھا تو یہ دیکھا، اس چوڑے چکلے دروازے کے داہنے بائیں، لکڑی کے تختوں پر مٹی کے اس قدر سجل، حسین، سبک اور نازک

کھلونے اوپر تلے رکھے ہوئے ہیں کہ بایدو شاید — انہیں دیکھ کر یہ خیال ہونے لگا کہ قریب جاؤں گا تو ہر کھلونا پلکیں جھپکانے اور باتیں کرنے لگے گا، اور گجر یا بجاؤ بتانے لگے گی۔ اور سقوں کر اگر ذرا سا بھی چھو لیا تو ان کی مشکوں سے ڈھل ڈھل پانی بہنے لگے گا۔" (یادوں کی برات صفحہ ۱۰۰)

۔ کھلونے خرید کر جب میں نے چوک میں قدم رکھا، عود، اگر اور لوبان کی لپٹوں نے میرا استقبال کیا۔ آگے بڑھا تو سونے چاندی کے ورق کوٹنے کی ٹپی ٹپی کھٹا کھٹ نے میرے پاؤں میں زنجیر ڈال دی۔ وہ مرتب و منظم کھٹا کھٹ ایسی معلوم ہوئی گویا طبلے پر بول کٹ رہے ہیں۔ پھر ہار والے کی سُریلی آواز آئی "ہار — بیلے کے پھول، چپاکلے" وہاں سے آگے بڑھا تو کیا بتاؤں کیا کیا دیکھا۔ ہائے تنبولیوں کی وہ جھلملاتی ترچھی کلاہیں، وہ دو پلی ٹوپیاں، وہ شربتی انگرکھے، وہ گھٹنے گھٹنے پہنے، وہ چوڑی دار پاجامے، شانوں پر وہ ریشمی بڑے بڑے رومال، آڑی ترچھی مانگیں، انگلوں میں دبی ہوئی معطر گلوریاں۔ ساقیوں اور ساقنوں کے ہاتھ میں وہ خوشبودار تمباکو کے حقے، حقوں پر وہ لپٹے ہار، ہاروں سے پانی کے قطروں کا وہ ترشح۔ وہ بجتے کٹورے، وہ سارنگیوں کی تھرتھراہٹ کے ہواؤں میں ہلکورے، وہ گمکتے ہوئے طبلے، بالاخانوں کے چھجوں سے، وہ مکھڑوں کی برستی ہوئی چاندنی اور زلفوں کے گرتے ہوئے سیاہ آبشار، کوٹھے والیوں میں کوئی گوری، کوئی چمپئی، کوئی سانولی سلونی — خدوخال اس قدر باریک گویا ہیرے کے قلم سے ترشے ہوئے۔ کوئی کڑیل جوان، کوئی نوجوان اور کوئی ان دونوں کے درمیان، گویا ہکتی ہوئی اٹھان کوئی گٹھے جسم کی اور کوئی دھان پان۔ کسی کی ناک میں نتھ، کسی کی ناک میں نیم کا تنکا — تماشائیوں کا ہجوم۔ شانے سے شانے چھلتے ریلے اور کوٹھوں پر نظر جماتے ہوئے مخالف سمتوں سے آنے جانے والوں کے سینوں کا ٹکراؤ اور ٹکراؤ پر وہ دست بستہ عذر خواہیاں۔" (یادوں کی برات صفحہ ۱۰۰، ۱۰۱)

ملتے ہیں صالح محمد خاں ڈھورے (لکھنؤ کا سب سے بہتر قلفی بنانے والا) کو ساتھ لئے آ گئے۔ اُس نے جست کی بڑی بڑی قلفیوں کو دونوں ہاتھوں ہتھیلیوں میں بڑے ماہرانہ انداز سے گھما گھما کر اور بالائی کے کاغذی آب خوروں کو مٹی کی سوندھی سوندھی رکابیوں میں کھول کھول کر پیش کیا۔ اور مٹی کے کورے کورے چمچے بھی سامنے رکھ دیئے۔ کیا بتاؤں اُن قلفیوں اور ان آب خوروں کی لذت و ملائمت، زبان نے اس سے پیشتر کبھی کوئی ایسی چیز چکھی ہی نہیں تھی۔ اُن کے مزے کو بیان کروں تو کیوں کر اور تشبیہ دوں تو کس چیز سے — اور ملائمت کا تو یہ عالم تھا کہ اُن کو صرف ہونٹوں اور تالو سے کھایا اور نظر کی حرارت سے پگھلایا جا سکتا تھا۔"

(دیا دوں کی برات صفحہ ۱۰۱)

"رات ہوتے ہی، ہمارے باورچی کے پکائے ہوئے کھانوں کے ساتھ ساتھ، عبداللہ کی دکان کی پوریاں کچوریاں، احمد کی باقرخانیاں، سعادت کی شیرمالیں، شبراتی کے اٹھارہ اٹھارہ پرتوں کے پراٹھے، جھتی رکابدار کے بھنے ہوئے مرغ، شاہ کا بیڑوں کا پلاؤ، حیدر حسین خان کے پھاٹک کی گلی کا اناناس کا مزعفر، غلام حسین خاں کے گُل کے کباب، کپتان کے کنوئیں کی پستے بادام کی سلاخی اور حسین آباد کی بالائی اور نہ جانے کیا کیا نعمتیں۔"

(دیا دوں کی برات صفحہ ۱۰۲)

"میں نے لکھنؤ کے ہفتے عشرے کے قیام میں مندرجہ ذیل مقامات دیکھے — حسین آباد کی شاہی کوٹھی، اُس کا کلاک ٹاور، حسین آباد کا امام باڑہ، اُس کی بھول بھلیاں، آصف الدولہ کا امام باڑہ، رومی دروازہ، حضرت عباسؑ کی درگاہ، نجف اشرف، تال کٹورے اور پھول کٹورے کی کربلائیں، بیلی گارڈ، عجائب خانہ، شاہ پیر محمد کے ٹیلے کی مسجد، شاہ مینا کا مزار، اور موتی محل، حضرت گنج، چھیا بازار، امین آباد، گومتی، ٹھنڈی سڑک، لوہے کا پل، لال باغ، سکندر باغ،

بندریا باغ، وکٹوریہ باغ اور بنارس باغ، اور چھتر منزل کا فقط وہ حصہ جو سڑک سے نظر آتا تھا۔ (یادوں کی برات - صفحہ ۱۰۲ ر ۱۰۳)

"لکھنؤ کے وہ روساء، علماء، ادبا، شرفاء اور شعراء جو میرے باپ کے پاس آتے یا وہ اُن کے وہاں تشریف لے جایا کرتے تھے۔ اللہ اللہ! وہ اُن کے لچکیلے سلام، وہ اُن کی نشست و برخواست کے پاکیزہ انداز، وہ اُن کی تہذیب میں ڈوبی وضع قطع، وہ اُن کے لباس کی انوکھی تراش خراش، وہ مسائلِ علمی و ادبی کی توضیح کے ہنگام، اُن کے الفاظ کا ٹھہراؤ، اُن کے لہجوں کا کساؤ، اثنائے غزل خوانی میں وہ حسبِ مفہومِ شعر اُن کی آنکھوں کا رنگ اور اُن کے چہروں کا اُتار چڑھاؤ، وہ قہقہوں سے دامن کش اُن کا ہلکا ہلکا تبسم، وہ اُن کا انکسار کے سانچے میں ڈھلا ہوا وقار اور باوجودِ کمال وہ اُن کا ہاتھ جوڑ جوڑ کر اپنی ہیچ مدانی کا اعتراف، یہ ساری باتیں دیکھ کر میں نقشِ بدیوار ہو کر رہ گیا۔ وہ تمام لوگ اس قدر شائستہ، شستہ اور گداختہ تھے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس کرۂ خاک کے نہیں، کسی کرۂ نور کے باشندے ہیں۔ (یادوں کی برات - صفحہ ۱۰۳)

مولانا صفی لکھنوی نے بھی اپنی ایک نظم میں لکھنوی اوصاف کی جھلکیاں اس طرح بیان کی ہیں۔

لکھنؤ اک خطۂ آباد و مردم خیز ہے — جو یہاں پیدا ہوئے ہیں ذہن اُن کا تیز ہے
پائیے گا عامیوں کو بھی مہذب نکتہ رس — واقفِ آدابِ مجلس، باخبر، باحس و مس
لکھنؤ کے ہر کہ و مہ کی زباں ہے نرم و صاف — ہے درست اس کے عوام الناس کا بھی شین قاف
بیشتر موزوں طبیعت، بیشتر موزوں خیال — خوش مزاج و خوش دماغ و خوش نوا و خوش مقال
لکھنؤ کے خاص باشندے مرنجان و مرنج — نکتہ فہم و نکتہ رس، ہنس مکھ، ظریف و بذلہ سنج
وہ لب و لہجہ نہ ہو گوشِ سماعت پہ جو بار — روزمرہ وہ کہ جو حسنِ ادا سے ہمکنار
خُلق کے جوہر چمکتے ہیں تری اکسیر میں — جذبِ دل کا مادہ ہے خاکِ دامن گیر میں

اب آئیے کسی ایک انسان میں ان اوصاف کی آمیزش کا نمونہ دیکھیں۔ شوکت تھانوی کہ جنھوں نے بچپن سے چالیس پینتالیس سال کی عمر تک کا وقفہ لکھنؤ میں گزارا اور ہر صحبت سے لطف اندوز ہوئے جنھیں لکھنؤ کے خربزے، آم، عطر، قوام، پان اور تمباکو کا ذائقہ کسی اور جگہ میسر نہیں آسکا اور جو ہر محفل میں اپنا ایک مقام پیدا کر لیتے تھے، نواب جعفر علی خان اثر کو لکھنوی تہذیب کا نمائندہ تسلیم کرتے ہوئے ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"آپ سے ملنے والوں کو یہ اطمینان ہوتا رہا کہ اب بھی لکھنؤ میں لکھنؤ باقی ہے۔ لب و لہجے میں وہی شیرینی، الفاظ میں وہی مٹھاس، عادات میں وہی نفاست، طبیعت میں وہی لوچ، مزاج میں وہی لچک اور کہیں بھی کسی صناعی کو کسی اداکاری کو کسی ارادے کو دخل نہیں، یہ سب کچھ ایک عجیب بے ساختگی کے ساتھ۔ کہنے والے اس لکھنویت کو تصنع کہتے ہیں اور غالباً اس لئے کہتے ہیں کہ نقال جب اس شائستگی اور شستہ عادات کی نقل اتارتے ہیں تو اس نقل میں یقیناً تصنع پایا جاتا ہے، مگر جس اصل کی یہ نقل ہوتی ہے اُس اصل کو تصنع نہیں کہا جا سکتا۔ اُن کو اس تصنع کی کیا ضرورت ہے جو اسی شائستگی کی گود میں پلے ہوں، جن کو گھٹی میں یہ تہذیب اور تمدن ملا ہو۔" [۱]

اب وہ ٹمٹماتے ہوئے دیئے اور وہ جھلملاتی ہوئی شمعیں بھی بجھ چکی ہیں جن کے وجود میں لکھنوی تہذیب کی آخری جھلک نظر آجاتی تھی۔ دلّی کی تہذیبی شمع ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں خاموش ہو گئی تھی لیکن لکھنوی تہذیب کی جڑیں چونکہ عوامی زندگی تک پہنچی ہوئی تھیں اس لئے وہ سخت جان تھی۔ اسی سخت جانی کا معجزہ تھا کہ اس زندہ تہذیب نے بغیر سرپرستیِ دربار بھی تقریباً نوّے سال تک اپنے وجود کا ثبوت دیا اور محض اُس وقت زوال پذیر ہوئی جب تقسیم برِصغیر کے وقت وہاں کی مسلم آبادی نے بڑے پیمانے پر ترکِ سکونت کی۔ ۱۹۴۷ء کے بعد رفتہ رفتہ وہ تہذیبی اور جمالیاتی قدریں ماند پڑتی چلی گئیں جنھوں نے تقریباً دو صدی تک

لوگوں کی نگاہوں کو چکا چوند رکھا تھا۔ شوکت تھانوی ۱۹۵۲ء کے دوران اپنے ایک خط میں سراج لکھنوی سے پوچھتے ہیں:

"خدا کے لئے بتایئے، لکھنؤ کے وہ یکے والے اور لکھنؤ کے وہ تانگے والے کیا ہوئے جن کی فقرہ بازیاں مشہور تھیں کہ کوئی موٹی سواری دیکھ لی تو فقرہ چست کر دیا کہ حضور، ڈوکھیپ میں آپ کو پہنچا سکوں گا۔ یہ تو ہوا کرایہ اور زائد دام کمائی وم کرانے کے مانگ رہا ہوں۔ اور جب دام کسی طرح طے نہ ہوئے تو کہا کہ بہتر ہے حضور! گھوڑے کی نظر بچا کر بیٹھ جائیے۔ یہ رہی لکھنؤ تو ہے جس کے ایک تانگے والے نے حضرت حفیظ جالندھری کے اس تقاضے پر کہ ذرا تیز چلو، جا جرہ آکر گھوڑا روک لیا تھا اور حفیظ صاحب سے دست بستہ عرض کیا تھا کہ حضور! کیا آپ کا خیال یہ ہے کہ خود مجھے ارمان نہ ہوگا کہ میرا گھوڑا تیز چلے۔ مگر کیا عرض کیا جائے۔ ایسا آرام طلب گھوڑا ہے کہ کبھی وضعداری میں فرق نہیں آنے دیتا۔ اللہ جانے کسی رئیس کا چشم و چراغ ہے یا ضرورت سے زیادہ تعلیم یافتہ ہے۔ یہی وجہ ہے حضور! کہ اس کے ساتھ گستاخی کرنے کی بھی ہمت نہیں ہوتی۔" [۱]

مختصر یہ کہ وہ تہذیب اب مرحوم ہو چکی ہے۔ اُس کے پرستار ایک اور معاشرتی نظام میں ضم ہو چکے ہیں، لیکن اُس کی یاد ابھی تازہ ہے۔ ہم نے اُس کی لوحِ مزار کے لئے جو اشعار نظم کئے تھے اُن کا اعادہ یہاں غیر مناسب نہیں ہوگا۔

وہ مہکتے ہوئے کوچے، وہ چمکتے ہوئے بام
مئے جذبات سے ہونٹوں کے چھلکتے ہوئے جام

وہ جوانی کی لہک اور وہ عارض کے گلاب
جن کی خوشبو سے تمناؤں کی جنت شاداب

وہ نگاہوں میں مروّت، وہ زبانوں میں مٹھاس
وہ تخاطب کے قرینوں میں خلوصِ احساس

وہ تبسم کی شعاعیں، وہ ترنم کی پھوار،
جیسے گلزار میں بھیگی ہوئی ساون کی بہار

کبھی احساس کی آواز میں بجلی کی کڑک — کبھی گفتار کے لہجوں میں کٹوروں کی کھنک

تیور ایسے کہ محبت کی جو توثیق کریں — ولولے گرمیِ جذبات کی تصدیق کریں

مثنوی کا کوئی کردار، غزل کا کوئی روپ — خنکیِ صبحِ گلستاں لیئے رُخسار کی دھوپ

گوشے گوشے میں وہ انوارِ جمال و خوبی — سارے ماحول میں اک کیفیتِ محبوبی

اُن کی تاریخ حسیں، اُن کے فسانے بھی حسیں — اُن کے شیوون بھی حسیں اُن کے ترانے بھی حسیں

رنگ و بُو کا وہ تلاطم، وہ سجاوٹ وہ نکھار — کھلتے چہروں کے تبسم سے خزاں میں بھی بہار

یادیں بھٹکی ہوئی جب تا بہ دل آجاتی ہیں — عرشِ تخئیل کی زنجیر ہلا جاتی ہیں

گونجتی چپ ہے لئے اپنے کناروں کا سکوت — ہر کھنڈر عظمتِ دیرینہ کا بھرپور ثبوت

چتر و محراب و کلس، گنبد و بام و دیوار — ایک اُجڑی ہوئی تہذیب کے خس پوش مزار

چشمِ محرابِ مساجد نگراں ہیں اب بھی — سرد ہونٹوں میں کچھ آثارِ اذاں ہیں اب بھی

لکھنؤ دور ہے اب دل سے قریب تھا پہلے — اے جنوں دیکھ ترا نجد یہیں تھا پہلے

دل کو اک رابطہ اُس کے خس و خاشاک سے تھا — ایک گل میری تمنا کا اُسی خاک سے تھا

آہ اے شامِ اودھ! منزلِ ویرانِ نشاط — اک دبستانِ لطافت ترے ایوانِ نشاط

تیرے ماضی کے شبستاں میں جھلکتا ہے شعور — چاندنی ذہن کی پھیلی ہے فضا میں تا دور

مرثیہ اپنا سناتی ہیں عماراتِ کہن — جن کی ہر خشت ہے اک صفحۂ تاریخِ وطن

دلِ خوابیدہ کو ٹھوکر سی لگا دیتی ہے — تیرے کھنڈروں میں اداسی یہ صدا دیتی ہے

جھرّیاں روئے تمدن کی عیاں دیکھتے جاؤ — سینۂ شہر پہ زخموں کے نشاں دیکھتے جاؤ

جب بھی آئی ترے گلشن سے ہوا سوئے دماغ — جھلملانے لگا شاعر کے تصور کا چراغ

نکہت و رنگ سے لبریز فضا یاد آئی — دل پہ جذبات کی گھنگھور گھٹا سی چھائی

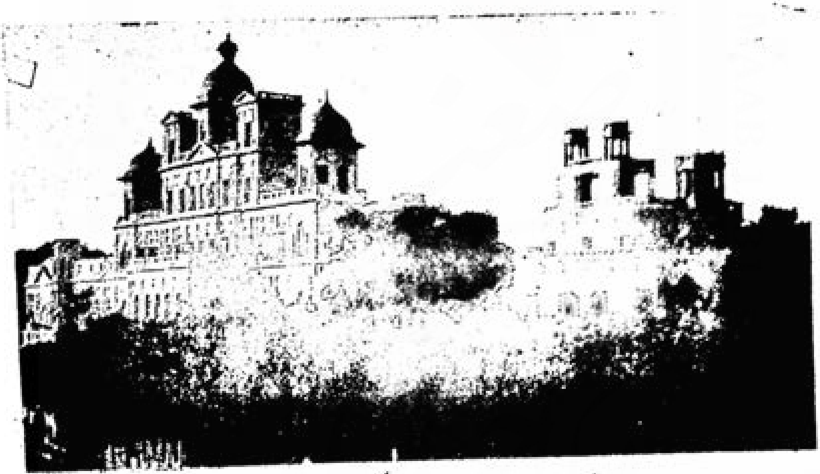
جب کیا غور چھلک آئے پلک تک آنسو — زیست محسوس ہوئی ایک حبابِ لبِ جُو

دل عزاخانہ ہے لگتے ہیں در و بام اُداس — اک سُلگتی ہوئی بستی ہے سرِ شام اُداس

گرد رہ رہ کے جو اُٹھتی ہے اُفق میلا ہے

تپشِ سینۂ ماضی کا دھواں پھیلا ہے [۱]

اب اس گورستان میں شب کا سناٹا چھا چلا ہے۔ آئیے ہم بھی فاتحہ کے لئے ہاتھ اٹھائیں اور اُن مرحوم رُوحوں کو مغفرت کی دُعا دیں جن کی سرگرمیوں نے ہماری تہذیب کی شاہانہ سواری کو اُس منزل تک پہنچا دیا تھا جہاں سے وہ چودھویں کے چاند کی طرح اُفقِ ذہن پر اب بھی اپنی نورانی کرنیں بکھیر کر اپنے منفرد ہونے کا ثبوت دے رہی ہے۔



چھتر منزل - لکھنؤ



لال بارہ دری۔ لکھنؤ



مٹّی کے کھلونے۔ لکھنؤ

حوالہ جات

بابِ اوّل

صفحہ ۲۳ [۱] تاریخِ ارادت خان (مؤلفہ میر مبارک اللہ واضح)، شائع کردہ دانش گاہِ پنجاب، لاہور صفحات ۷۷ تا ۷۹

صفحہ ۲۵ [۱] (و) حدیقۃ الاقالیم (الہ یار خاں)، قلمی نسخہ مملوکہ گاندھی فیضِ عام کالج، شاہجہان پور

(ب) جنگ نامۂ فرخ سیر و جہاندار شاہ انگریزی ترجمہ از اِروِن مطبوعہ در جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال۔ جلد ۶۹۔ بابت سال ۱۹۰۰ء صفحہ ۴۲۔

(ج) مراۃِ واردات (محمد شفیع طہرانی)، قلمی نسخہ مملوکہ برٹش میوزیم صفحات ۱۳۳ و تا ۱۳۴ ب۔

(د) منتخب اللباب (خافی خان)، جلد چہارم۔ (اردو ترجمہ شائع کردہ نفیس اکیڈمی، کراچی صفحات ۱۳۹ و ۱۴۰

صفحہ ۲۶ [۱] (و) تاریخِ ارادت خان، شائع کردہ دانش گاہِ پنجاب، لاہور صفحہ ۱۶۰

(ب) عبرت نامۂ محمد قاسم لاہوری۔ مملوکہ پنجاب پبلک لائبریری صفحات ۴۱ ب تا ۴۲ و الف۔

(ج) منتخب اللباب جلد چہارم (اردو ترجمہ شائع کردہ نفیس اکیڈمی، کراچی، صفحات ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۸۲۔

(د) سیر المتاخرین (اُردو ترجمہ شائع کردہ نفیس اکیڈمی کراچی) صفحہ ۵۷

[۲] (و) منتخب اللباب جلد چہارم (اُردو ترجمہ) صفحہ ۱۸۷

(ب) سیر المتاخرین (اُردو ترجمہ) صفحات ۵۷ و ۵۸

صفحہ ۳۰ [۱] کیمبرج ہسٹری آف انڈیا۔ جلد چہارم۔ اشاعت ۱۹۶۳ء۔ ابواب ۱۲ و ۱۵

صفحہ ۳۲ [۱] Twilight Of The Mughals, Percival Spear, pages 4, 6, 17.

صفحہ ۳۵ [۱] Cambridge History Of India, Vol. IV

صفحہ ۳۶ [۱] ایضاً

صفحہ ۳۷ [۱] Memoirs Sur Quelques Affairs De'l' Empire Mogul; Jean Law, page 179
(Translation obtamed from "Twilight Of The Mughals" by Percival Spear)

صفحہ ۳۹ [۱] (و) Later Mughals (Irvine) Vol. I Page. 192, 197

(ب) Fall of the Mughal Empire by J. N Sarkar

صفحہ ۴۰ [۱] مرقع دہلی تصنیف درگاہ قلی خان

صفحہ ۴۱ [۱] (و) تاریخ شہادت فرخ سیر و جلوس محمد شاہ (محمد بخش آشوب) صفحات ۴۷ ب، ۶۳ تا ۷۲ و ۷۲ ب

(ب) Later Mughals, Irvine, Vol. 1, Pages 266—269

[۲] "ذکر نایاب بزمانہ بیاضیں" (مرتبہ عبدالباری آسی) صفحہ ۲۵۔ شائع کردہ ہندستانی اکیڈمی، الہ آباد طبع ۱۹۴۲ء

صفحہ ۴۲ [۱] نکات الشعرا (میر تقی میرؔ) صفحات ۳۰ و ۳۱

صفحہ ۴۳ [۱] مجموعۂ نغز (میر قدرت اللہ قاسم) طبع ۱۹۳۳ء حصۂ دوم صفحہ ۲۵۸.

[۲] Fall Of The Mughal Empire, J. N. Sarkar, Vol. I, page 8

صفحہ ۴۴ [۱] (ا) Fall of the Mughal Empire, J. N. Sarkar,

(ب) "میر تقی میرؔ" مولفہ خواجہ احمد فاروقی

صفحہ ۴۵ [۱] "دو نایاب زمانہ بیاضیں" (مرتبہ عبدالباری آسیؔ) صفحات ۲۸ و ۲۹ شائع کردہ ہندوستانی اکیڈمی، الٰہ آباد، طبع ۱۹۴۲ء

صفحہ ۴۶ [۱] "میر کا تاریخی ماحول" (خواجہ احمد فاروقی)

[۲] کلیاتِ سوداؔ جلد اوّل صفحات ۳۶۸ و ۳۶۹

صفحہ ۴۷ [۱] ذکرِ میر (میر تقی میرؔ)، فارسی، مطبوعہ، صفحہ ۸۸

صفحہ ۴۸ [۱] ذکرِ میر (میر تقی میرؔ) اردو ترجمہ بنام "میر کی آپ بیتی" از نثار احمد فاروقی صفحات ۱۲۲ تا ۱۲۴

صفحہ ۴۹ [۱] قلمی کلیاتِ جعفر علی حسرتؔ، مملوکہ انجمن ترقّیِ اردو (پاکستان) کراچی

[۲] قلمی کلیاتِ مصحفیؔ، مملوکہ پنجاب یونیورسٹی، جلدِ قصائد، حصّۂ سوئم، قصیدہ نمبر ۱۸

بابِ دوم

صفحہ ۵۱ [۱] Cambridge History Of India, Vol. IV. Page 331

صفحہ ۵۳ [۱] Memoirs of Delhi and Faizabad, Vol. II. Page 2,3

صفحہ ۵۴ [۱] The First Two Nawabs of Oudh, A. L. Srivastava,
Page 82 [۲] ایضاً

صفحہ ۵۵ [۱] The First Two Nawabs of Oudh, A. L. Srivastava,
Page 79
[۲] بوستانِ اودھ (کنور درگا پرشاد) صفحہ ۴۰
[۳] عماد السعادت، صفحہ ۳۱، سیر المتاخرین جلد دوم صفحہ ۴۸۵

صفحہ ۵۶ [۱] عماد السعادت صفحہ ۳۱

صفحہ ۵۷ [۱] سیر المتاخرین (سید غلام حسین عظیم آبادی)

صفحہ ۶۱ [۱] بارکر (Barker) کا خط سلیکٹ کمیٹی (Select Committee)
کے نام مورخہ ۱۷ فروری ۱۷۶۹ء۔
[۲] "ایک سفر" از جارج فورسٹر (George Forster) صفحہ ۱۵۸

صفحہ ۶۳ [۱] History of Hindostan, Appendix to vol. II,
Page 92

صفحہ ۶۴ [۱] "شجاع الدولہ" مؤلفہ ڈاکٹر اے، ایل، سری واستو
[۲] "معدن السعادت" (قلمی)، حصہ چہارم صفحہ ۲۸۵ ب

صفحہ ۶۶ [۱] چہار گلزار شجاعی (ہرچرن)، صفحہ ۵۱۸ ب

صفحہ ۶۷ [۱] چہار گلزار شجاعی (ہرچرن)، صفحہ ۵۱۸ ب
[۲] معدن السعادت جلد چہارم صفحہ ۲۵۸ ب
[۳] "شجاع الدولہ" (اے، ایل، سری واستو) جلد دوم صفحہ ۱۶۸
[۴] Verelst Views of the English Government in Bengal
Page 103

صفحہ ۶۸

[۱] British Indian Military Repository, Vol. I, Page 20.

صفحہ ۶۹

[۱] Memoirs of Delhi and Faizabad Vol. II, Page 5

[۲] چہار گلزارِ شجاعی (ہر چرن) صفحہ ۴۹۹ تا ۵۰۰

صفحہ ۷۰

[۱] Memoirs of Delhi and Faizabad, Vol. II, Page 8—9

صفحہ ۷۱

[۱] Memoirs of Delhi and Faizabad, Vol. II, Page 8—9

صفحہ ۷۲

[۱] Oudh Its Princes and Its Government, Moulvi Maseeh-ud-din, Page 9

[۲] Memoirs of Delhi and Eaizabad, Vol. II, Page 24

صفحہ ۷۳

[۱] Memoirs of Delhi ahd Faizabad, Vol. II

صفحہ ۷۴

[۱] سوانحاتِ سلاطینِ اودھ جلد اوّل صفحہ ۱۲۱

صفحہ ۷۵

[۱] تفضیح الغافلین مؤلفہ ابوطالب (انگریزی ترجمہ از ولیم ہو) صفحہ ۳۷ و ۳۸

[۲] A Journey Through Oude, by Col. Sleeman, Vol. II Page 189.

صفحہ ۷۶

[۱] A Journey through Oude, Col. Sleeman, Vol. II,

[۲] شبابِ لکھنؤ (احد علی) صفحہ ۲۲ شائع کردہ الناظر پریس لکھنؤ

صفحہ ۷۷

[۱] "ذکرِ میر" (فارسی) صفحات ۱۴۳ تا ۱۴۵۔ اردو ترجمہ از نثار احمد فاروقی بنام "میر کی آپ بیتی" صفحات ۱۸۲ تا ۱۸۴

صفحہ ۷۸

[۱] مشرقی تمدن کا آخری نمونہ (عبدالحلیم شرر) صفحہ ۲۸

[۲] تفضیح الغافلین (انگریزی ترجمہ از ولیم ہو) صفحہ ۱۰۷

صفحہ ۸۰ [۱] تحفۃ العالم (سیّد عبداللطیف شوستری) صفحات ۵۲۱ تا ۵۳۵

صفحہ ۸۱ [۱] تاریخِ اودھ جلد سوم، مؤلفہ نجم الغنی صفحہ ۳۵۸

[۲] مشرقی تمدن کا آخری نمونہ (عبدالحلیم شررؔ) صفحہ ۳۰

[۳] اودھ گزٹیئر جلد دوم صفحات ۳۶۸ تا ۳۶۹

صفحہ ۸۵ [۱] The Life of an Eastern King, by Willian Knighton.

ترجمۂ اردو از احمد علی شباب لکھنوی صفحہ ۴

صفحہ ۸۶ [۱] Lord Hastings & Indian States, by M. S. Mehta.

Page 162.

[۲] لارڈ منٹو کا خط مورخہ ۸؍مئی ۱۸۱۲ء صفحات ۲۸۳ تا ۲۸۵

صفحہ ۸۸ [۱] عماد السعادت (مؤلفہ سیّد غلام علی خان) صفحہ ۱۷۲

صفحہ ۸۹ [۱] عماد السعادت (سیّد غلام علی خان)، صفحہ ۱۷۲

[۲] تاریخِ اودھ مؤلفہ نجم الغنی جلد چہارم، صفحہ ۱۰

صفحہ ۹۰ [۱] خطبۂ کتاب "دریائے لطافت" منقول از "لطائف السعادت" مرتبہ ڈاکٹر آمنہ خاتون صفحہ ۶۹ و ۷۰

[۲] دریائے لطافت (اردو ترجمہ) صفحہ ۶۷

صفحہ ۹۱ [۱] "لطائف السعادت" مرتبہ ڈاکٹر آمنہ خاتون

[۲] دریائے لطافت (اردو ترجمہ) صفحہ ۱۲۴

صفحہ ۹۲ [۱] ایڈم کا خط بیلی کے نام مورخہ ۱۲ نومبر ۱۸۱۴ء منقول از اودھ پیپرز صفحہ ۹۱۹

صفحہ ۹۴ [۱] Hasting's Minutes — "Oude Papers", Page 924.

[۲] ایضاً مورخہ ۳؍فروری ۱۸۱۶ء

[۳] Baillie's letter to Adam — Oude Papers,

Page 936 to 962.

صفحہ ۹۶ [۱] سوانحات سلاطین اودھ جلد اوّل صفحہ ۲۵۶

صفحہ ۹۷ [۱] سفر نامۂ بشپ ہیبر (انگریزی)، صفحہ ۳۹۶

[۲] ایضاً صفحہ ۳۹۲

صفحہ ۹۸ [۱] سفر نامۂ بشپ ہیبر (انگریزی) صفحہ ۳۹۶

[۲] ایضاً صفحہ ۳۹۳

صفحہ ۹۹ [۱] تاریخ اودھ، جلد چہارم۔ مولفہ نجم الغنی، صفحہ ۲۰۶

صفحہ ۱۰۰ [۱] سوانحات سلاطین اودھ، جلد اوّل، صفحہ ۲۸۸

[۲] سفر نامۂ سلیمین (انگریزی) جلد دوم، صفحہ ۱۸۲

صفحہ ۱۰۱ [۱] فسانۂ عبرت مصنفہ رجب علی بیگ سرور مطبوعہ مطبع نجم العلوم، لکھنؤ، صفحات ۶ تا ۹

[۲] سفر نامۂ سلیمین (انگریزی) جلد اوّل، صفحہ ۲۷۴

صفحہ ۱۰۲ [۱] شباب لکھنؤ، صفحہ ۱۴۸

[۲] فسانۂ عبرت صفحہ ۱۰

صفحہ ۱۰۳ [۱] (ا) تاریخ شاہیۂ نیشاپوریہ (قلمی) کتب خانۂ رامپور

(ب) مراۃ الاوضاع (قلمی) کتب خانۂ رامپور

(ج) سوانحات سلاطین اودھ (مطبوعہ)

صفحہ ۱۰۴ [۱] سوانحات سلاطین اودھ، مراۃ الاوضاع۔ تاریخ شاہیۂ نیشاپوریہ

[۲] سوانحات سلاطین اودھ، جلد اوّل صفحات ۳۵۲، ۳۵۳

[۳] ایضاً

صفحہ ۱۰۵ [۱] سفر نامۂ لیوپولڈ وان اورلیچ (انگریزی) جلد دوم صفحہ ۹۴

[۲] ایضاً صفحہ ۱۰۸

صفحہ ۱۰۶ [۱] سوانحاتِ سلاطینِ اَوَدھ، جلد اوّل، صفحہ ۳۷۱

[۲] سفرنامۂ اَوَدھ از سلیمین (انگریزی)، جلد اوّل، صفحات ۱۶۸، ۱۶۹

[۳] سفرنامۂ لیوپولڈوان اوریچ (انگریزی) جلد دوم، صفحہ ۱۰۸

صفحہ ۱۰۷ [۱] سوانحاتِ سلاطینِ اَوَدھ، جلد اوّل، صفحہ ۳۷۲

[۲] ایضاً صفحہ ۳۸۶

[۳] محل خانۂ شاہی (اُردو ترجمہ پری خانہ) صفحہ ۱۲۷

صفحہ ۱۰۸ [۱] محل خانۂ شاہی (اُردو ترجمہ پری خانہ)

[۲] تاریخ اودھ، مؤلفہ نجم الغنی، جلد پنجم، صفحہ ۱۲۴

صفحہ ۱۰۹ [۱] برڈس آئی ویو آف انڈیا مؤلفہ سر ارسکن پیری

[۲] ضیائے اختر مؤلفہ محمد حسن بجنوری، مطبوعہ نولکشور، لکھنؤ، اشاعت ۱۸۷۸ء / ۱۲۹۵ھ

صفحہ ۱۱۰ [۱] سیر المحتشم

[۲] محل خانۂ شاہی (اُردو ترجمہ تاریخ پری خانہ)، صفحہ ۱۵۳

صفحہ ۱۱۲ [۱] محل خانۂ شاہی (اُردو ترجمہ تاریخ پری خانہ) صفحہ ۱۵۴

صفحہ ۱۱۳ [۱] مقدمۂ "حزنِ اختر" از مولانا عبدالحلیم شرر، مطبوعہ نولکشور، لکھنؤ،
اشاعت ۱۹۲۳ء، صفحات ۱۰، ۱۱

صفحہ ۱۱۴ [۱] مقدمۂ "حزنِ اختر" از مولانا عبدالحلیم شرر صفحات ۱۲ و ۱۳

صفحہ ۱۱۶ [۱] "لو کی یادداشت منقولہ اودھ پیپرز سنہ ۱۸۵۶ء" صفحہ ۲۲۵

[۲] روزنامہ ڈان (انگریزی)، دہلی، مورخہ ۲۰ اکتوبر ۱۹۴۶ء

صفحہ ۱۱۷ [۱] "کرنل بیلی کا خط ایڈم کے نام، اور اُس کا جواب ۲۰ اگست، ۵ ستمبر ۱۸۱۴ء
مطبوعہ در "لارڈ ہیسٹنگز اینڈ دی انڈین اسٹیٹس" صفحہ ۱۶۴

[۲] "لارڈ ہیسٹنگز اینڈ دی انڈین اسٹیٹس" صفحات ۱۶۲ و ۱۶۳

صفحہ ۱۱۸ [۱] ٹرانزکشنز آف انڈین آفیسرز، جلد دوم، صفحات ۸۳ و ۸۴
[۲] ایضاً صفحہ ۷۶

صفحہ ۱۲۰ [۱] "ضیائے اختر" مؤلفہ محمد حسن بجنوری، مطبوعہ نولکشور لکھنؤ، اشاعت $\frac{۱۸۷۸}{۱۲۹۵}$ ء، صفحہ ۷۳

صفحہ ۱۲۱ [۱] "انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ" مؤلفہ عبداللہ یوسف علی صفحہ ۹
[۲] ایضاً صفحہ ۱۴

باب سوم

صفحہ ۱۲۶ [۱] "مسلمان کلچر" مؤلفہ وی ڈی (بارتھولڈ) مترجمہ ایس سہروردی، مطبوعہ کلکتہ ۱۹۳۴ء

صفحہ ۱۲۷ [۱] مقدمہ "تاریخ ہند" ایلیٹ اینڈ ڈاوسن، جلد دوم، مرتبہ پروفیسر محمد حبیب مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

صفحہ ۱۳۰ [۱] سفرنامۂ سلیمین (انگریزی)، جلد دوم، صفحہ ۶۲
[۲] ایضاً صفحہ ۲۰۶
[۳] دیباچۂ اودھ گزیٹیر

صفحہ ۱۳۲ [۱] سفرنامۂ سلیمین (انگریزی) جلد اول، صفحہ ۳۳۳
[۲] ایضاً صفحہ ۱۴۰

صفحہ ۱۳۳ [۱] سفرنامۂ سلیمین (انگریزی)، جلد دوم، صفحہ ۲۲۹ کا حاشیہ۔
[۲] شجاع الدولہ (انگریزی) مولفہ اے۔ ایل۔ سری واستو، صفحہ ۳۶۸،

صفحہ ۱۳۴	[۱] سفرنامۂ جارج فورسٹر (انگریزی) جلد دوم، صفحات ۱۹۱ تا ۱۹۵
	[۲] حدیقۃ الاقالیم۔ صفحات ۱۵۲ تا ۱۵۳ و ۶۶۸ تا ۶۶۹
صفحہ ۱۳۵	[۱] سفرنامۂ سلیمین (انگریزی) جلد دوم، صفحہ ۴۶
	[۲] ایضاً صفحہ ۹
صفحہ ۱۳۶	[۱] سفرنامۂ بشپ ہیبر (انگریزی)
	[۲] "نوٹس آن انڈین افیئرز" (انگریزی)
	[۳] "سیلکشن فروم اَن پبلشڈ ریکارڈس آف گورنمنٹ" ۱۷۴۸ء تا ۱۷۶۷ء
صفحہ ۱۳۸	[۱] حدیقۃ الاقالیم صفحہ ۶۷۳
صفحہ ۱۳۹	[۱] آخری تاجدار اَوَدھ۔ مؤلفہ محمد تقی احمد
	[۲] روزنامہ "ڈان" (انگریزی)، دہلی، اشاعت ۲۰ اکتوبر ۱۹۴۶ء
صفحہ ۱۴۰	[۱] "آخری تاجدار اَوَدھ" مؤلفہ محمد تقی احمد
	[۲] روزنامہ "ڈان" (انگریزی)، دہلی، اشاعت ۲۰۔ اکتوبر ۱۹۴۶ء
صفحہ ۱۴۱	[۱] "نوٹس آن انڈین افیئرز" (انگریزی) جلد دوم صفحہ ۲۷۶
	[۲] سفرنامۂ سلیمین (انگریزی)، جلد دوم صفحہ ۱۸۲
صفحہ ۱۴۲	[۱] سفرنامۂ کیپٹن لیوپولڈ وان اورلچ (انگریزی) صفحہ ۱۱۱
	[۲] آبِ حیات، طبع لاہور در ۱۹۱۷ء، صفحہ ۲۶۷ و ۲۶۸
صفحہ ۱۴۳	[۱] سفرنامۂ سلیمین (انگریزی) جلد اوّل صفحہ ۳۲۰ و ۳۲۱
صفحہ ۱۴۵	[۱] سفرنامۂ سلیمین (انگریزی) جلد اوّل صفحات ۱۸۴ تا ۲۳۲
صفحہ ۱۴۷	[۱] (ا) اَوَدھ پیپرز (انگریزی) صفحات ۱۹ تا ۲۸
	(ب) سفرنامۂ سلیمین (انگریزی)، جلد دوم صفحہ ۲۰۹، ۲۱۰
	[۲] سفرنامۂ سلیمین (انگریزی)، جلد اوّل، صفحہ ۲۰۰ و جلد دوم صفحہ ۲۱۔

[۳] تفضیح الغافلین مؤلفہ ابوطالب

صفحہ ۱۴۸ [۱] تاریخِ فرح بخش مولفہ فیض بخش (انگریزی ترجمہ) جلد دوم صفحہ ۷۹

[۲] (ا) شجاع الدولہ (انگریزی) مؤلفہ ڈاکٹر ہے اے ایل سریواستو

(ب) اُودھ پیپرز

(ج) تاریخِ اودھ مولفہ نجم الغنی

صفحہ ۱۴۹ [۱] شبابِ لکھنؤ (اردو ترجمہ) صفحہ ۸۵

[۲] اَودھ پیپرز (انگریزی) صفحہ ۳۲

[۳] سفر نامۂ سلیمین (انگریزی) جلد دوم، صفحہ ۱۲۳

صفحہ ۱۵۰ [۱] تفضیح الغافلین (انگریزی ترجمہ) صفحہ ۷۵

[۲] تاریخِ اُودھ، مؤلفہ نجم الغنی، جلد چہارم صفحہ ۷۶ تا ۷۸

[۳] اُودھ پیپرز (انگریزی) صفحہ ۲۶

صفحہ ۱۵۱ [۱] اُودھ پیپرز (انگریزی) انڈیکس "ڈی" نمبر ۴

صفحہ ۱۵۳ [۱] مرآۃ الاوضاع، مولفہ منشی لال جی (قلمی نسخہ رام پور لائبریری)، صفحہ ۳۱ تا ۳۳

صفحہ ۱۵۴ [۱] تاریخ اُودھ، مؤلفہ نجم الغنی، جلد چہارم، صفحہ ۷۳ و ۷۴

[۲] (ا) اَودھ پیپرز (انگریزی)

(ب) سفر نامۂ سلیمین (انگریزی)

[۳] اَودھ پیپرز (انگریزی) صفحہ ۳۱

صفحہ ۱۵۶ [۱] (ا) اَودھ پیپرز (انگریزی) صفحہ ۳۳ تا ۳۴

(ب) سفر نامۂ سلیمین (انگریزی)

[۲] سفر نامۂ سلیمین (انگریزی)، جلد دوم، صفحہ ۱۰

صفحہ ۱۵۷ [۱] (ا) تحفۃ العالم مؤلفہ سید عبداللطیف شوستری، صفحہ ۵۳۱ و ۵۳۲

(ب) سوانحاتِ سلاطینِ اودھ

[۲] عمادالسعادت، صفحہ ۱۷۲

[۳] سفرنامۂ سلیمین (انگریزی)، جلد دوم، صفحہ ۱۰

صفحہ ۱۵۸ [۱] سفرنامۂ کیپٹن لیوپولڈوان اورلچ (انگریزی)، جلد دوم صفحہ ۱۰۵

صفحہ ۱۵۹ [۱] سوانحاتِ سلاطینِ اودھ، جلد اوّل، صفحہ ۳۵۲ و ۳۵۳

[۲] سفرنامۂ سلیمین (انگریزی) جلد دوم، صفحہ ۱۷۱ و ۱۷۲

صفحہ ۱۶۱ [۱] تاریخِ فرح بخش مؤلفہ فیض بخش (انگریزی) جلد دوم صفحہ ۵

صفحہ ۱۶۲ [۱] تاریخ فرح بخش مؤلفہ فیض بخش (انگریزی ترجمہ) جلد دوم صفحہ ۷۸

صفحہ ۱۶۳ [۱] سفرنامۂ ولیم ہوجز (انگریزی) صفحہ ۱۰۰

صفحہ ۱۶۴ [۱] سفرنامۂ لیوپولڈوان اورلچ (انگریزی)، جلد دوم صفحہ ۱۱۳

صفحہ ۱۶۵ [۱] سفرنامۂ لیوپولڈوان اورلچ (انگریزی) جلد دوم، صفحہ ۹۳ و ۹۴

[۲] ماہنامہ "الواعظ" لکھنؤ، شمارہ ماہ جولائی ۱۹۴۷ء

صفحہ ۱۶۷ [۱] مضامینِ شرر، حصہ سوم صفحہ ۵۵ و ۵۶

صفحہ ۱۷۰ [۱] سفرنامہ ولیم ہوجز (انگریزی) صفحہ ۱۰۴ و ۱۰۵

صفحہ ۱۷۱ [۱] سفرنامۂ ولیم ہوجز (انگریزی) صفحہ ۱۰۱ و ۱۰۲

صفحہ ۱۷۲ [۱] شبابِ لکھنؤ (اردو ترجمہ کتاب "دی لائف آف این ایسٹرن کنگ" مؤلفہ ولیم نائیٹن)، صفحہ ۳۰۲

صفحہ ۱۷۳ [۱] شبابِ لکھنؤ (اردو ترجمہ) صفحہ ۱۶ و ۱۷

صفحہ ۱۷۵ [۱] شبابِ لکھنؤ (اردو ترجمہ) صفحہ ۶۹ و ۷۰

صفحہ ۱۷۶ [۱] سفرنامۂ بشپ ہیبر (انگریزی) جلد اوّل صفحہ ۳۸۹ و ۳۹۰

[۲] شبابِ لکھنؤ (اردو ترجمہ) صفحہ ۶ و ۷

صفحہ ۱۷۸ [۱] شبابِ لکھنؤ (اُردو ترجمہ) صفحہ ۷

صفحہ ۱۷۹ [۱] سفرنامۂ لیوپولڈ وان اوریچ (انگریزی) صفحہ ۱۱۰

صفحہ ۱۸۰ [۱] قیصر التواریخ، مؤلفہ سید کمال الدین حیدر،

صفحہ ۱۸۱ [۱] ماہنامۂ ادیب، الٰہ آباد، شمارہ ماہ اگست ۱۹۱۰ء

صفحہ ۱۸۳ [۱] تاریخِ اودھ، مؤلفہ نجم الغنی، جلد چہارم، صفحہ ۲۲۴ و ۲۲۵

[۲] مقالۂ نوبت رائے نظر، ماہنامۂ ادیب، الٰہ آباد، شمارۂ ماہ اگست ۱۹۱۰ء

صفحہ ۱۸۴ [۱] مقالۂ نوبت رائے نظر، ماہنامۂ ادیب، الٰہ آباد، اگست ۱۹۱۰ء

[۲] تاریخِ اودھ، مؤلفہ نجم الغنی، جلد چہارم، صفحہ ۲۲۵

صفحہ ۱۸۵ [۱] سفرنامۂ لیوپولڈ وان اوریچ (انگریزی)، جلد دوم، صفحہ ۹۴

صفحہ ۱۸۸ [۱] "مسٹر پارکس وانڈرنگ" (انگریزی) جلد اوّل صفحہ ۸۸

صفحہ ۱۹۰ [۱] مقالۂ نوبت رائے نظر، ماہنامہ "ادیب" الٰہ آباد، شمارہ اگست ۱۹۱۰

صفحہ ۱۹۱ [۱] شبابِ لکھنؤ (اُردو ترجمہ) صفحہ ۱۱۶ و ۱۱۷

صفحہ ۱۹۳ [۱] تاریخِ فرح بخش مؤلفہ فیض بخش کاکوروی (انگریزی ترجمہ) صفحہ ۱۳۵

صفحہ ۱۹۶ [۱] شبابِ لکھنؤ (اُردو ترجمہ) صفحہ ۱۱ تا ۱۳

صفحہ ۱۹۸ [۱] سفرنامۂ لیوپولڈ وان اوریچ (انگریزی) صفحہ ۱۱۰

[۲] "لکھنؤ کے قدیم نظارے" ماہنامۂ ادیب، شمارہ اگست ۱۹۱۰ء

صفحہ ۲۰۰ [۱] شبابِ لکھنؤ (اُردو ترجمہ) صفحہ ۱۱۵

[۲] مضامینِ شرر، جلد سوم، صفحہ ۲۵۷

صفحہ ۲۰۲ [۱] سفرنامۂ سلیمین (انگریزی) جلد دوم، صفحہ ۶۸

[۲] ایضاً صفحہ ۲۵۰

صفحہ ۲۰۴ [۱] چہار گلزارِ شجاعی مؤلفہ ہرچرن داس، صفحہ ۵۱۸ - الف

[۴] تاریخ فرح بخش (انگریزی) صفحہ ۱۲۱

[۳] عماد السعادت، مؤلفہ غلام علی، صفحہ ۱۷۲

صفحہ ۲۰۵ [۱] تاریخ اودھ، مؤلفہ نجم الغنی، جلد چہارم، صفحہ ۱۰۳

[۲] فسانۂ عبرت، مؤلفہ رجب علی بیگ سرور صفحہ ۲۹

صفحہ ۲۰۶ [۱] سفرنامۂ لیوپولڈ وان اورلیچ، جلد دوم، صفحہ ۱۰۴

صفحہ ۲۰۷ [۱] محل خانۂ شاہی (ترجمہ فدا علی خنجر) صفحہ ۱۷

صفحہ ۲۰۸ [۱] تاریخ فرح بخش (انگریزی ترجمہ) صفحہ ۳ و ۶

[۲] تفضیح الغافلین (انگریزی ترجمہ) صفحہ ۳۸ و ۳۹

صفحہ ۲۰۹ [۱] تحفۃ العالم، مؤلفہ سید عبد اللطیف، صفحہ ۵۲۵

[۲] سفرنامۂ بشپ ہیبر (انگریزی)، جلد اول صفحہ ۳۸۲

[۳] سفرنامۂ لیوپولڈ وان اورلیچ (انگریزی)، صفحہ ۹۶ و ۹۷

صفحہ ۲۱۰ [۱] تاریخ فرح بخش (انگریزی ترجمہ) صفحہ ۵، ۶

صفحہ ۲۱۱ [۱] ذکر میر، مطبوعہ انجمن ترقی اردو، صفحہ ۱۴۷

[۲] تحفۃ العالم، مؤلفہ سید عبد اللطیف شوستری، صفحہ ۵۳۳

صفحہ ۲۱۲ [۱] شباب لکھنؤ (اردو ترجمہ) صفحہ ۳۰ و ۳۱

[۲] ایضاً صفحہ ۲۸ و ۲۹

صفحہ ۲۱۳ [۱] تفضیح الغافلین (انگریزی ترجمہ) صفحہ ۳۷ و ۳۸

[۲] سفرنامۂ بشپ ہیبر (انگریزی) جلد اول، صفحہ ۳۸۱

صفحہ ۲۱۹ [۱] شباب لکھنؤ (اردو ترجمہ) صفحات ۱۱۹ تا ۱۳۶

صفحہ ۲۲۰ [۱] قیصر التواریخ (مؤلفہ کمال الدین حیدر) صفحہ ۱۰۸

صفحہ ۲۲۱ [۱] سفرنامۂ سلیمین (انگریزی)، جلد اول، صفحہ ۲۷۴

صفحہ ۲۲۳ [۱] سفرنامۂ بشپ ہیبر (انگریزی)، جلد اول ۳۷۶

صفحہ ۲۲۴ [۱] شبابِ لکھنؤ (اُردو ترجمہ)، صفحہ ۳

صفحہ ۲۲۶ [۱] درسِ نظامیہ، مؤلفہ مولانا شبلی نعمانی، مطبوعہ معینِ دکن، حیدرآباد

[۲] ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت، مؤلفہ مولانا مناظر احسن گیلانی جلد اول، صفحہ ۳۰۱

صفحہ ۲۲۷ [۱] سوانح عمری مؤلفہ مولوی محمد کاظم، مطبوعہ منشی گنگا پرشاد ورما، صفحہ ۱۲

صفحہ ۲۲۹ [۱] عقائد الشیعہ مصنفہ مولانا سید ظفر حسن امروہوی صفحہ ۳۴

صفحہ ۲۳۰ [۱] عقائد الشیعہ مصنفہ مولانا سید ظفر حسن امروہوی صفحہ ۴۴

صفحہ ۲۳۲ [۱] عقائد الشیعہ مصنفہ مولانا سید ظفر حسن امروہوی

[۲] سوانح عمری مصنفہ مولوی محمد کاظم صفحہ ۳

صفحہ ۲۳۳ [۱] سوانح عمری مصنفہ مولوی محمد کاظم، صفحہ ۳

صفحہ ۲۳۶ [۱] تاریخِ شجاع الدولہ (انگریزی) مؤلفہ ڈاکٹر اے۔ ایل سری واستو جلد اول

صفحہ ۲۳۸ [۱] شبابِ لکھنؤ (اُردو ترجمہ)، صفحہ ۵۷ و ۵۸

صفحہ ۲۳۹ [۱] سرورِ سلطانی ترجمۂ شمشیر خانی، مطبوعہ مطبعِ مسیحائی طبع ۱۲۶۸ھ

صفحہ ۲۴۱ [۱] Observations on The Mussalmauns of India,

by Mrs. Meer Hass... Ali, Page 29,30

اوبزرویشنز آن دی مسلمانز آف انڈیا (انگریزی)، صفحہ ۲۹، ۳۰

صفحہ ۲۵۰ [۱] The Life of an Eastern King, by William Knighton

ترجمہ میں "شبابِ لکھنؤ" اور "محرم نامہ" مطبوعہ سب رس، حیدرآباد دکن کی عبارتوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

[۴] A Hand Book for Visitors to Allahabad, Cawnpore and Lucknow, by H. G. Keene, Page 75 and 76

صفحہ ۲۵۳ [۱] Observations on The Mussalmauns of India, by Mrs. Meer Hassan Ali,

ترجمے میں ماہنامہ "الواعظ" لکھنؤ بابت ماہ جون ۱۹۴۶ء کی عبارت کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔

صفحہ ۲۵۴ [۱] ماہنامہ "الواعظ" لکھنؤ، بابت ماہ جولائی ۱۹۴۶ء

صفحہ ۲۵۶ [۱] سفرنامۂ بشپ ہیبر (انگریزی) جلد اوّل، ۳۹۴

صفحہ ۲۵۹ [۱] شبابِ لکھنؤ (اُردو ترجمہ) صفحہ ۱۷

صفحہ ۲۶۰ [۱] انگریزی ترجمہ "تاریخ فرح بخش" جلد دوم صفحہ ۲۳۱

صفحہ ۲۶۳ [۱] "مشرقی تمدن کا آخری نمونہ" مؤلفہ مولانا عبدالحلیم شرر

صفحہ ۲۶۴ [۱] "قدیم ہنر مندانِ اودھ" صفحات ۵۲ تا ۶۶

[۲] "تاریخ اودھ" مؤلفہ نجم الغنی، جلد چہارم، صفحہ ۱۰۱

صفحہ ۲۶۵ [۱] محل خانۂ شاہی (اُردو ترجمۂ پری خانہ) مترجمہ فدا علی خنجر لکھنوی صفحہ ۳۰۴

[۲] مضامینِ شرر، جلد سوم، صفحہ ۱۷۱

[۳] "واجد علی شاہ کی ایک نادر تصنیف" مطبوعہ "نقوش" لاہور، بابت فروری ۱۹۵۳ء

صفحہ ۲۶۶ [۱] "قدیم ہنر و ہنر مندانِ اودھ" صفحہ ۵۶

[۲] "محل خانۂ شاہی (اُردو ترجمۂ پری خانہ) صفحہ ۱۱۵ و ۱۱۶

[۳] مضامینِ شرر، جلد سوم، صفحہ ۱۷۰

صفحہ ۲۶۷ [۱] پروفیسر اسعد اللہ خاں کوکب کا خط" بحوالہ "مشرقی تمدن کا آخری نمونہ" صفحات ۱۷۱ و ۱۷۳

صفحہ ۲۶۸ [۱] مضامینِ شرر، جلد سوم، صفحات ۱۲۲ و ۱۲۳

صفحہ ۲۶۹ [۱] دیباچہ A Catalogue of The Arabic, Persian & Hindustani Manuscripts of The Libraries of The Kings of Oudh, Compiled by A. Sprenger,

[۲] ایضاً

[۳] ایضاً

صفحہ ۲۷۰ [۱] "تحفۃ العالم" مؤلفہ سید عبداللطیف شوستری، صفحات ۵۳۳ و ۵۳۴

صفحہ ۲۷۲ [۱] A Catalogue of The Libraries of The Kings of Oudh, Compiled by A. Spsenger,

[۲] سوانحاتِ سلاطینِ اودھ، جلد اول، صفحہ ۳۱۱

صفحہ ۲۷۳ [۱] سفر نامۂ لیو پولڈ وان اوربج، جلد دوم، صفحہ ۱۰۱

[۲] سوانحاتِ سلاطینِ اودھ، جلد اول

صفحہ ۲۷۴ [۱] مضامینِ شرر، جلد سوم، صفحہ ۱۰۶

صفحہ ۲۷۵ [۱] سوانح عمری مولوی محمد کاظم، صفحات ۱۲ و ۱۳

صفحہ ۲۷۷ [۱] مقالہ مولانا محمد باقر شمس لکھنوی، ماہنامہ طلوعِ افکار کراچی
شمارہ جنوری ۱۹۷۰ء

باب چہارم

صفحہ ۲۸۳ [۱] مضامینِ شرر جلد سوم

صفحہ ۲۸۵ [۱] Observations on The Mussalmauns of India, by Mrs. Meer Hassan Ali. Page 291

صفحہ ۲۸۶ [۱] Twilight of The Mughals, by Percival Spear.

[۲] دریائے لطافت (اُردو ترجمہ) صفحہ ۱۱۷

[۳] دریائے لطافت (اُردو ترجمہ) صفحہ ۱۲۲

صفحہ ۲۹۸ [۱] عملِ خانہ شماری (اُردو ترجمہ تاریخ پری خانہ، از فدا علی خنجر) صفحہ 115

[۲] ایضاً

صفحہ ۳۰۳ [۱] یادوں کی برات (جوش ملیح آبادی) صفحہ ۴۰۸

[۲] مکتوبِ غالب بنام مرزا حاتم علی بیگ مہر

صفحہ ۳۰۴ [۱] مضامینِ شرر، جلد سوم صفحہ ۱۴۲

[۲] واقعاتِ انیس (مؤلفہ مہدی حسن احسن) طبعِ اوّل، صفحہ ۱۲۲

صفحہ ۳۰۵ [۱] دیوانِ سوم، منیر شکوہ آبادی، صفحہ ۱۷۹ و ۱۸۰

صفحہ ۳۱۲ [۱] بارِ خاطر (شوکت تھانوی) صفحہ ۲۷۸

صفحہ ۳۱۵ [۱] بارِ خاطر (شوکت تھانوی) صفحہ ۲۸۳

[۲] رقصِ خیال (ڈاکٹر سید صفدر حسین)، صفحہ ۱۷ تا ۴۰

لکھنؤ کی ادبی میراث

مُصنّفہ

ڈاکٹر سیّد صفدر حسین

لکھنوی ادب کے داخلی اور خارجی محرکات کیا تھے اور وہاں کے فن کاروں نے مختلف اصنافِ ادب میں کس قدر وقیمت کے ادبی جواہرات تخلیق کئے؟ اس وسیع موضوع پر نئے زاویۂ نگاہ سے غور وفکر اور پھر شگفتہ زبان اور دلکش اسلوبِ نگارش کے ساتھ اپنی بے لاگ رائے کا اظہار۔ تنقید میں جرأتِ فکر کی ایک نئی مثال!

قیمت: چالیس روپے

بارگاہِ ادب

منظّر منزل — حیدر روڈ — اسلام پورہ — لاہور

طابع ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی۔ اردو ڈائجسٹ پرنٹرز۔ ۲۴ سرکلر روڈ، لاہور

ساداتِ بارہہ
تاریخ کے مدّ و جزر میں

مُصنّفہ

ڈاکٹر سید صفدر حسین

ساداتِ بارہہ کی ہمراہیِ سلطان محمود غزنوی ہندوستان میں آمد۔ اوّل پنجاب میں اور پھر دوآبہ گنگ و جمن میں اُن کی آبادیاں۔ ایک مہم آزما قبیلے کی حیثیت سے تاریخ کے صفحات پر اُن کی ہمت و مردانگی کے نقوش۔ اُن کا سیاسی عروج اور پھر سیاسی زوال۔ دورِ انقلاب میں خود کو سنبھالنے کی سعی۔ نئی تعلیم کے ساتھ نئے اُفق پر تابندگی کے نئے آثار!

قیمت: پچیس ۲۵ روپے

بارگاہِ ادب

مظفرؔ منزل — حیدر روڈ — اسلام پورہ — لاہور

مطبع ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی اُردو ڈائجسٹ پرنٹرز ۴۴ سمر کلر روڈ۔ لاہور

زیرِ طبع

ضیائے کاظم — مراثیِ سیّد کاظم علی کاظم میرٹھی

ریاضِ خُلد — مراثیِ میر ریاض الدین ریاضؔ

افرادِ غم — مراثیِ سیّد محمود حسن عقیلؔ

جامِ کوثر — مراثیِ سیّد مظفر علی خاں کوثرؔ

عرفانِ عارف — مراثیِ سیّد علی محمد عارفؔ

نقدِ اخلاص — خطوطِ جوشؔ ملیح آبادی بنام میر عترت حسین

سوادِ منزل — سیّد ظریف حسن ظریفؔ کی قومی نظمیں

رموزِ حُسن و نظر — دیوانِ غزلیاتِ ظریف حسن ظریفؔ

آوازِ پا — ڈاکٹر سیّد صفدر حسین کی شخصیت اور فن

لبِ فُرات — مراثیِ ڈاکٹر سیّد صفدر حسین مع تبصرہ و تنقید

رقعاتِ قطب الملک — قطب الملک کے سیاسی خطوط کا مجموعہ

جنگ نامۂ عالم علی خاں — ایک یادگار مثنوی